

# جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں

چھٹا مجموعہ

جرم و سزا اور سراغِ سانی کی بے مثال سچی کہانیاں

اصمد یار خان



# فہرست

۷	جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں
۹۸	فرار کے راستے
۱۷۴	جذبات کے جنگل میں
۲۶۱	اس نے گناہ تو نہیں کیا

## پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی کہانیوں کا چھٹا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان چھ کہانیوں میں بھی آپ وہی دلچسپی، چاشنی، سنسنی اور جذبہ باقی دنیا میں زلزلے پکڑ دینے والا تھراپائیں گے جو محترم احمد یار خان کی ہر کہانی میں آپ کو ملتا ہے۔ ایسی کہانیاں اکثر بلا تبصرہ پیش کی جاتی ہیں کسی تعارف یا پیش لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے اچھایا اچھا نہ ہونے کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جاتا ہے، پھر بھی میں ان کہانیوں کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ہمارے ہاں جرم و جاسوسی کی کہانیوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت تفریح کا مطالبہ کرتی ہے۔ تفریح جو جرم و جاسوسی کی کہانیوں میں ملتی ہے وہ کہانی کی کسی اور صنف میں نہیں مل سکتی۔ گھٹیا درجے کے ڈائجسٹ رسالے اور ناول جرم و جاسوسی کی بدولت مقبول ہوئے لیکن یہ کہانیاں انگریزی سے ترجمہ کی جاتی ہیں اور یہ سب افسانے ہوتے ہیں۔ انہیں مزید دلچسپ اور لذیذ بنانے کے لیے ان میں جنسی لذت اور بغیر کسی جواز کے لڑائی مارکٹائی شامل کی جاتی ہے۔ یہ ایک کاروبار ہے

جو نوجوانوں اور کچے ذہنوں کی اخلاقی قدروں کے لیے ذہرِ قاتل ہے۔  
 محترم احمد یار خان کی کہانیوں میں بھی آپ کو تفریح کا اتنا ہی مواد  
 ملے گا جتنا آپ چاہتے ہیں لیکن ان میں غربیہ یہ ہے کہ یہ افسانے نہیں۔ یہ  
 ہمارے اپنے معاشرے، ہماری اپنی لغزشوں اور ہماری اپنی بھٹ دھرمی  
 کی وارداتیں ہیں۔ ان کے کرداروں کو آپ بڑھی اچھی طرح جانتے ہیں۔  
 ان میں کوئی بھی پیشہ ور مجرم نہیں بلکہ ایسے افراد قتل وغیرہ کا ارتکاب کرتے  
 ہیں جنہوں نے جرم کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔

ان حقیقی کہانیوں میں آپ کو انسانی فطرت کے ایسے راز بھی ملیں  
 گے جو ہم سب نے اپنی ذات میں چھپا رکھے ہیں مگر ہم ان کی موجودگی کو  
 تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا یہی رویہ بھیا تک جرائم کا باعث بنتا ہے۔  
 ان کہانیوں میں آپ کو تفریح تو ضرور ملے گی اور اتنی ملے گی کہ آپ  
 جو کہانی پڑھیں گے اسے ختم کر کے اٹھیں گے لیکن آپ بہت دیر ایک  
 سوچ میں الجھے رہیں گے کہ ایسا کیوں ہوا، ایسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ  
 کہانیاں نوجوان اور کچے ذہن پر نشہ طاری نہیں کریں گی بلکہ ذہن کو بیدار  
 کریں گی اور اس بیداری میں جو لطف اور جلدت ہے وہ جرم و جاسوسی  
 کے افسانوں میں نہیں مل سکتی۔

عنایت اللہ  
 مدیر حکایت لاہور

## جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں

پولیس مین کی حیثیت سے میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ انسان کی  
 تاریخ میں آج تک جنگوں، وباؤں، سیلابوں اور زلزلوں نے اتنے انسانوں  
 کی جانیں نہیں لیں جتنی عورت نے لی ہیں۔ جنگ، وبا، سیلاب اور زلزلہ  
 کبھی کبھی آتا ہے مگر عورت کی خاطر قتل اور خودکشی کی وارداتیں ہر روز ہوتی ہیں  
 اور صدیوں سے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ قبیلے قبیلوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ خاندان  
 خاندانوں سے لڑ جاتے ہیں۔ ہر روز اتنی وسیع دنیا میں کسی نہ کسی گاؤں، قصبے اور  
 شہر میں کوئی خاوند اپنی بیوی اور اُس کے آشنا کو قتل کر کے خودکشی کر لیتا یا  
 سزائے موت لے لیتا ہے۔ بیویاں آشناؤں کے ساتھ قتل کروانوں کو قتل کر  
 دیتی ہیں۔ باپ اور بھائی قتل یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ آج کل ایک نئی تہذیب  
 نے دنیا کو گرفت میں لے لیا ہے۔ پاکستان میں اس تہذیب کو زیادہ مقبولیت  
 حاصل ہوئی ہے۔ اس کا یہ فائدہ سامنے آیا ہے کہ عورت کی خاطر قتل و غارت  
 نہیں ہوتی، حالانکہ نا جائزہ آشنائیاں بڑھ گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اب کسی کی  
 بہو بیٹی خراب ہو جاتی ہے تو گھر والے خسر سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی ایڈوانس

ہے، سوشل ہے۔ خاوند بیویوں کا تعارف غیر مردوں سے خود کرتے اور نتائج کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔

مجھے اپنی سردس کے سینکڑوں ایسے واقعات یاد آتے ہیں کہ خاوند نے بدچلن بیوی کو یا بھائی نے بدچلن بہن اور اُس کے آشنا کو موقع پر پکڑ کر قتل کیا اور آگے قتل سمیت تمھانے میں آگیا۔ میرے پاس ایسی بیویاں بھی آئیں جنہوں نے بدچلن خاوندوں کو دن دہاڑے قتل کیا اور میرے پاس اقبال مجرم کے لیے آگئیں۔ فوری اشتعال سے جو قتل کیا جاتا ہے اس کی مزاکم ہے بشرطیکہ اشتعال ثابت ہو جائے اور جب مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ قاتل حق بجانب تھا یا تھی تو میں استغاثہ میں گڑبڑ کر کے اُسے مزید فائدہ دلا دیا کرتا تھا۔ البتہ اُن قاتل مردوں اور عورتوں کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے جو بدکاری جاری رکھنے کی خاطر آشنائوں سے مل کر قتل کرتے تھے، میں استغاثہ کے ضلاء جھوٹی شہادتوں سے پُر کر لیا کرتا تھا۔

قانون سے لوگ ڈرتے ہیں لیکن عدالتوں میں قانون وکیلوں کے الفاظ اور دلائل کے ہیر پھیر میں بے بس ہو کے رہ جاتا ہے۔ گناہگار صاف نچ کے نکل آتے ہیں۔ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ گناہگار مجھے آزاد چلنا پھرنا نظر نہ آئے خواہ مجھے قانون اور سزا کا کوئی تقاضا پورا کرنے کے لیے جھوٹ ہی بولنا پڑے۔ انسوئناک حقیقت یہ ہے کہ ناجائز مراسم پیدا کرنے کا شغل مسلمانوں کے حصے میں ہی آیا ہے۔ اور دلچسپی والی بات یہ ہے کہ مسلمان بدکاری میں بھی شیریں ہیں اور جب بدکاری کے جرائم کسی مومن کے اپنے گھریں آجائیں تو قتل اور خودکشی

کی وارداتیں ہوتی ہیں لہذا میں انہیں ”بدکاری غیر تمدن“ کہا کرتا ہوں۔

جولائی ۱۹۴۰ء کی ایک صبح طلوع ہو رہی تھی۔ مجھے ایک کانسٹیبل نے گھر آ کر بتایا کہ خودکشی کی ایک رپورٹ آئی ہے۔ یہ سرحد پار دہلی کے ضلع کے ایک قصبے کا واقعہ ہے۔ میں مصلحتاً نام اور مقام چھپانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ خودکشی کرنے والا مر چکا تھا۔ صرف کاغذی کارروائی کرنی تھی۔ پوسٹ مارٹم کرانا تھا اور کیس ختم۔ تمھانیداروں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قتل کو بھی خودکشی ثابت کر دیں اور تفتیش کے لمبے چکر سے بچیں۔ میں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا کہ مرنے والا مر چکا ہے۔ تھوڑی دیر میں کارروائی مکمل ہو جائیگی۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اے۔ ایس۔ آئی سے کہو کہ موقع پر چلا جائے۔ اُس کا نام عثمان علی پٹھان تھا۔ رام پور کا رہنے والا یہ نوجوان اے۔ ایس۔ آئی بڑی شیطان چیز تھا لیکن میں نے اُسے لگام ڈال رکھی تھی۔ مجھے آبا جان کہا کرتا تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ کجخت عورتوں کا شیدائی تھا۔ رشوت عورت کی شکل میں لیا کرتا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا ”خدا کی قسم، ایک پیسہ رشوت نہیں لی“۔ بہر حال لڑکا برنور دار تھا۔

کانسٹیبل چلا گیا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ عثمان آگیا۔ کہنے لگا ”آبا جان! آپ کا حکم سر آنگھوں پر، میں موقع پر چلا جاتا ہوں لیکن خودکشی کی یہ رپورٹ ایک پٹانہ سی لڑکی لے کے آئی ہے۔ کہتی ہے کہ میرے خاوند نے خودکشی کر لی ہے۔ میں گیا تو پھر آپ کہیں گے کہ تم تفتیش کی بجائے لڑکی میں دلچسپی لیتے ہو۔ آپ خود آجائیں“

مجھے غصہ تو آیا لیکن میری ہنسی نکل گئی۔ ایک ہی مہینہ پہلے چوری کی ایک واردات کی نفی میں عثمان نے ایک جوان لڑکی کو اپنے ”دامِ محبت“ میں پھانس لیا تھا۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے عثمان کو اپنے گھر لاکر خوب پٹا تھا۔ اُس وقت میں اُسے اپنا ماتحت افسر نہیں بلکہ بٹیا سمجھ رہا تھا اور وہ بھی مجھے اپنا باپ سمجھ رہا تھا۔ آج وہ لڑکا یاد آتا ہے تو میں آنسو روک نہیں سکتا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد وہ ڈاکوؤں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔ اُس نے دراصل مجھے سچانے کے لیے جان دی تھی۔ یہ بڑا ہی لمبا واقعہ ہے کسی وقت سناؤں گا۔

”مجھے یہ لڑکی مشکوک طبیعت کی لگتی ہے“ عثمان نے کہا۔ ”اُس کے ساتھ ایک جوان آدمی ہے۔ کہتی ہے کہ چچا زاد بھائی ہے۔“

”مشکوک کیوں؟“ تم نے پوچھا۔

”اُس کے خاوند نے خودکشی کر لی ہے اور اُس کی آنکھیں خشک ہیں۔“ عثمان نے جواب دیا۔ ”اُس کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ شکاری ہے۔ شکل دار بھی ہے۔ ذرا سی اُچھ دکھاؤ تو پٹا خوں کی لڑمی کی طرح پٹ پٹ بولنے لگتی ہے اور جو آدمی اس کے ساتھ ہے وہ یا تو ہوشیار ہے یا ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں عثمان کے ساتھ تھانے میں گیا تو تین اور آدمی یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ قوستان کے باہر والے برے پر پمپل کے ایک درخت کے ساتھ ایک لاش لٹک رہی ہے گلے میں رتے کا پھندا ہے۔ میرے دفتر میں ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو لڑکی سے ایک دو سال بڑا تھا۔ لڑکی

کی عمر بائیس تیس سال تھی۔ عثمان ٹھیک کتا تھا۔ لڑکی شکل دار تھی۔ جسم میں کبھی کبھی تھکی اور صورت میں بھی۔ اس نے بتایا کہ صبح سویرے سویرے اس آدمی نے جسے میں کمانی بیان کرنے کے لیے ناد رکھوں گا، مجھے آکر بتایا کہ تمہارے خاوند کی لاش درخت کے ساتھ لٹک رہی ہے۔ اُس نے خودکشی کر لی ہے۔ آؤ تمہانے میں رپورٹ درج کرادیں۔ یہ مجھے تھانے میں لے آیا۔

”تم خاوند کی لاش دیکھ آئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں“ اُس نے جواب دیا۔ ”یہ (نادر) دیکھ آیا ہے۔ یہ جھوٹ تو نہیں بول سکتا“

”تم نے لاش کس وقت دیکھی؟“ میں نے نادر سے پوچھا۔

”صبح سویرے محلے میں شور شرابا ہوا کہ نوازش (مقتول) کی لاش پمپل سے لٹک رہی ہے“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں دوڑا گیا۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ لاش دیکھی۔ وہ نوازش کی ہی ہے جو اس کا خاوند ہے۔“

”میرے کسی سوال کے بغیر ہی اُس نے کہا۔“ اُس نے خودکشی کی ہے“ میں نے تہا را خیال بھی یہی ہے کہ تمہارے خاوند نے خودکشی کی ہے؟“ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

”جی ہاں؟“ اُس نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”خودکشی کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ وہ تو شریف آدمی تھا۔ کسی کے ساتھ اُس کی دشمنی نہیں تھی۔“

”تمہارے والد صاحب یا تمہارے خاوند کے والد صاحب رپورٹ کے لیے کیوں نہیں آئے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنے خاوند کے ساتھ سب سے الگ رہتی تھی“۔ اُس نے جواب دیا اور اس کا چچا زاد، نادربول پڑا۔ ”اُن سب پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ دونوں خاندان میلپل کے اردگرد اپنے سینے پیٹ رہے ہیں اور عورتیں اپنے بال نوچ رہی ہیں۔ اُن بے چاروں کو تو ہوش ہی نہیں“۔

میں نے لڑکی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُس نے نہ بال نوچے تھے نہ سینہ پٹیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اتنے سے آنسو بھی نہیں آئے تھے کہ رات کا کاجل ہی صاف کر دیتے۔ اگر میں چہرہ شناسی کی کچھ اہلیت رکھتا تھا تویری یرائے غلط نہیں تھی کہ اس خوبصورت لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور گھبراہٹ کے پردے میں اطمینان کی جھلک بھی تھی۔

میں نے ان دونوں سے کوئی اور بات پوچھنے کی بجائے بنا دٹی سی آہ بھری اور لڑکی سے کہا۔ ”اس جوانی میں بیوہ ہو جانا کتنا بڑا حادثہ ہے، خودکشی کرنے والے نے یہ تو سوچا ہی نہیں۔ اللہ سے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے“۔ ہمدردی کی دو چار باتیں کہ کر انہیں یہ تاثر دیا کہ یہ واردات خودکشی کی ہی ہے۔ میں نے متعلقہ عملہ ساتھ لیا۔ ایک کانٹیل کو کھجی کو موقوفہ واردات پر لانے کو دوڑایا اور پیپل کے اُس درخت تک پہنچا جس کے ایک ٹہن کے ساتھ لاش لٹک رہی تھی۔

تماشاٹیوں کا ہجوم تھا لیکن وہ کچھ دہشت کی وجہ سے درخت سے دور کھڑے رہے اور کچھ اس لیے بھی آگے نہ گئے کہ دو عقل مند قسم کے ہندوؤں نے انہیں یہ کہہ کر پیچھے رکھا تھا کہ پولیس آکر گھر سے دیکھے گی۔ اس سے میرا کام

آسان ہو گیا۔ وہ علاقہ قبرستان کا تھا اور شہر سے باہر۔ اس کے ایک طرف آبادی تھی۔ باقی اطراف پر کھیت اور ویرانہ تھا۔ پھل کا درخت بہت پُرانا تھا اور قبرستان کے ویران سرے پر تھا۔ اس کے ساتھ ایک وسیع نشیب تھا جو بارشوں کے پانی سے تالاب بنا ہوا تھا۔ اس سے پرے زمین اونچی نیچی تھی۔ کھڈنا لے تھے۔ جگہ قبرستان کی وجہ سے ڈراؤنی سی تھی۔ شام کے بعد اُدھر کوئی وارداتیا ہی جا سکتا تھا۔ یہ حال رات کے وقت وہاں سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ رات کے وقت اس علاقے میں رہزنی، آبروریزی اور قتل کی واردات بے خوف و خطر کی جا سکتی تھی۔ اُس زمانے میں آبادیاں کم تھیں۔ قصبے اور شہر آج کی طرح اتنے زیادہ پھیلے ہوئے نہیں تھے۔ روزمرہ زندگی میں آج کی طرح افزائی اور بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ اس قصبے کے بازار شام پڑتے ہی بند ہو جاتے اور لوگ جلدی سو جاتے تھے۔

## پیپل کے پیر سے لٹکتی لاش

میں نے لاش کی کیفیت دیکھی۔ متوفی کی عمر چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرے کا رنگ موت نے سفید کر دیا تھا لیکن زندگی میں یہ رنگ زرد تھا۔ چہرہ تندرست نہیں تھا۔ تقریباً تین انچ لمبی واٹھی تھی۔ منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں اتنی تنورٹی کھلی ہوئی تھیں کہ انہیں بند کیا جا سکتا تھا۔ گردن لمبی ہو گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جھنگے سے ریڑھ کی ہڈی اور کھوپڑی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ پھانسی میں ایک تو سانس مرگ جاتا ہے، دوسرے یہ ہوتا ہے

” اور آنکھیں بھی بند ہیں، مُنہ بھی بند ہے۔“ میں نے اُسے بتایا۔  
 ”گر دن کو اتنا شدید جھٹکا لگا ہے کہ اس کی لمبائی دیکھو مگر آنکھیں اور مُنہ بند  
 رہا۔ ہونہیں سکتا۔“

پھانسی سے مُنہ کھل جاتا ہے۔ بعض افراد کے ساتھ یوں بھی ہوتا ہے  
 کہ زبان باہر آجاتی ہے اور دانت اسے درمیان میں سے ٹکسنے کی طرح پکڑ لیتے  
 ہیں۔ آنکھیں اس طرح کھل جاتی ہیں کہ ڈھیلے باہر آنے لگتے ہیں۔ اس کے  
 علاوہ اس لاش کے کپڑوں پر خون تھا۔ اُس نے پا جامہ اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہاں  
 بازو سے، کُمٹی کے نیچے سے خون نکلا تھا۔ کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ پامبلے  
 پر گھاس کے سبز نشان تھے اور مٹی بھی تھی۔ پیٹھ پر گرتے گھاس اور مٹی کے گہرے  
 نشان لیے ہوئے تھے۔ متوفی کا جسم لاغر سا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چرٹے کے  
 پلکے سے چپل تھے جو اترے نہیں تھے کیونکہ ٹخنے کے پیچھے سے سٹریپ سے  
 بندھے ہوئے تھے۔ اُس کی دونوں مُٹھیاں بند تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ  
 مرنے والا چیل سمیت درخت پر چڑھا۔ وہ درخت پر چڑھ کر ہی اپنے آپ کو  
 پھانسی دے سکتا تھا۔ لاش کے پاؤں زمین سے کم و بیش دس فٹ اوپر تھے۔  
 میں نے اُس کی چیل کے تلوے دیکھے اور پیل کے تنے کے ارد گرد جہاں  
 سے اُوپر چڑھا جا سکتا تھا زمین دیکھی۔ کچھ روز پہلے دو بار بارش برس چکی تھی۔ زمین  
 نرم تھی۔ گہرے (پاؤں کے نشان) صاف تھے مگر ان میں ایک بھی نشان مرنے  
 والے کے پاؤں کا نہیں تھا۔ یہ تو بہت نہیں سکتا تھا کہ مرنے والا سیدھی لٹکا کر یارستہ  
 کسند کی طرح اتنے اُونچے ٹن پر پھینک کر چڑھا ہو۔ ٹن کی بلندی کا حساب کر لیں۔

کہ ریڑھ کی ہڈی کا آخری حصہ جو کھوپڑی کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے الگ ہو جاتا ہے۔  
 اسے عام فہم زبان میں منگ ٹوٹ جانا کہتے ہیں۔ اس سے مرنے والا مرنے سے  
 پہلے ہی بے حس ہو جاتا ہے۔ حیات کا انحصار اسی جوڑ پر ہوتا ہے۔ اس  
 سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ  
 اس نے ٹن پر جا کر رستے کا ایک سہرائٹن کے ساتھ باندھا، دوسرا اپنی گردن  
 سے باندھا اور ٹن سے کوڈ پڑا، ورنہ گردن اتنی لمبی نہ ہوتی۔

میں قریب سے جان چُھڑانے کے لیے اسے خودکشی کی واردات کہ سکتا  
 تھا۔ تمنا نیرا اسی میں اپنی عافیت دیکھا کرتے ہیں لیکن خداوند تعالیٰ نے میرے  
 ساتھ بے انصافی یہ کی ہے کہ مجھے تمنا نیاری کا رتہ تو عطا کر دیا مگر انسانوں والی  
 جیتیں اور زیادہ تیز کر دیں اور ایک جیت فالتو میرے اندر ڈال دی اور جذبات ایسے  
 دے دیئے جنہیں پولیس کی شعبہ بازیاں مار نہ سکیں۔

”کیوں بیٹا، کیا خیال ہے؟“ میں نے عثمان سے پوچھا۔

”لعنت بھیجے، ملک آبا، لکھو خودکشی۔“ اُس نے جواب دیا، اور متوفی  
 کی بیوی کی طرف دیکھا جو پرے کھڑی تھی۔ عثمان نے کہا۔ ”ہاں، ذرا پیکر بازی  
 ہو جائے تو گنگھلیوں کے بھی دام مل جائیں گی۔“

”بندر کی اولاد۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا لاش کو دیکھ۔ کیا یہ خودکشی ہے؟“  
 میں لڑکے کو ٹینگ بھی دینا چاہتا تھا۔

”اوں ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مار کر لٹکا یا گیا ہے۔ کپڑوں پر  
 خون ہے۔ گھاس کے نشان اور مٹی بھی ہے۔“



متوفی کے پاؤں زمین سے دس فٹ اوپر تھے۔ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ یا دس انچ تھا۔ ٹخن سے اُس کی گردن تک رستے کی لمبائی کم و بیش سات فٹ تھی۔ لہذا بلا شک و شبہ کہا جاسکتا تھا کہ متوفی خود اوپر گیا یا اُسے اوپر لے جایا گیا۔ کھڑے بتاتے تھے کہ اُسے اوپر لے جایا گیا کیونکہ وہاں متوفی کے کھڑے کی بجائے کسی اور آدمی کا کھڑا تھا۔

میں تماشاٹیوں کو دیکھنے لگا۔ متوفی کے خاندان کے افراد، خصوصاً عورتوں نے بڑی ہی دلخراش آہ و بیکا پکڑ رکھی تھی۔ اس کی دو بہنیں تھیں اور ماں۔ انہوں نے اپنے بال نونچ نونچ کر اور منہ پر ہاتھ مار مار کر اپنا حلیہ مہربانی پر بگاڑ رکھا تھا۔ تماشاٹیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ میں نے کانٹیلوں سے کہہ کر اس سارے ہجوم کو وہاں سے اتنی دُور بٹھا دیا جہاں سے وہ میری کارروائی نہ دیکھ سکیں۔ یہو سکتا تھا یہ واقعی قتل کی واردات ہو اور ملزم تماشاٹیوں میں موجود ہوں۔ کانٹیل تماشاٹیوں کو قبرستان کے دوسرے سرے پر لے گئے۔

اتنے میں کھوجی آگیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کی ماں اور بیوی بھی ساتھ تھیں۔ کھوجی ادھیڑ عمر مسلمان تھا۔ اُس کی ماں بہت بوڑھی تھی۔ یہ کُتبہ بیکانیر کے علاقے کے ایک مشہور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ صحرائی کھوج کے تویہ لوگ ماہر تھے، انہوں نے شہری کھوج اور پولیس کے گفتیشی کھوج کی بھی ٹریننگ حاصل کر لی تھی۔ کھوجی نے اپنی ماں کے متعلق مجھے بتایا کہ تین چار دن پہلے وہ اُن سے ملنے آئی تھی۔ اُسے کھڑے پہچاننے اور اٹھانے کی ٹریننگ ماں نے ہی دی تھی۔ اُس وقت اُس کھوجی کی عمر آٹھ نو سال تھی۔ اُس کا باپ ماہر کھوجی تھا۔ کھوجی چودہ سال کا تھا جب اس کا

باپ مر گیا تھا۔ کھوجی کی بیوی بھی اس فن سے واقف تھی۔ کانٹیل اسے گھر سے بلانے گیا اور واردات بتائی تو اس کی ماں بھی شوقیہ ساتھ چل پڑی۔ اس کے ساتھ بیوی بھی آگئی۔

اس سے پہلے سُنائی ہوئی کہانیوں میں میں آپ کو کھوجیوں کے متعلق بتا چکا ہوں کہ اپنے فن سے کس طرح حیران کر دیتے تھے۔ پاکستان میں ایسے کھوجی اب بھی موجود ہیں جو ملزموں کو زمین کی تہوں سے نکال سکتے ہیں اور مٹی میں دبے ہوئے کھڑے پہچان کر ملزموں کی نشاندہی کر سکتے ہیں مگر یہاں انہیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ لہذا اتنا اہم فن مہربان ہوا ہے۔

میں نے کھوجی کو لاش دکھائی جو ابھی تک رستے سے ٹک رہی تھی اور بتایا کہ یہ واردات خودکشی کی نہیں قتل کی ہے اور یہ بھی بتایا کہ مرنے والا اپنے پاؤں چل کر نہیں آیا۔ کھوجی کی ماں نے لاش کے نیچے جا کر اُس کے چہلے کے تلوے دیکھے۔ کھوجی نے بھی دیکھے۔ اُس کی بیوی نے بھی دیکھے۔ میں عثمان کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ موضوع یہی واردات تھی۔ کھوجی بلکہ کھوجیوں نے میری طرح تنہ کے ارد گرد کھڑے دیکھے۔

”قتل کر کے لٹکا یا گیا ہے“ ماں نے مجھے کہا۔

وہ تینوں زمین پر جھکے جھکے ایک طرف چلنے لگے اور اُس وسیع نشیب میں اتر گئے جہاں تالاب تھا۔ کنارے نم آؤد تھے۔ کچھ جگہ خشک بھی تھی اور ذرا انگ ہٹ کر مٹی کی قدرتی دیوار کھڑی تھی۔ وہ تینوں تالاب کے کنارے گئے اور بہت آگے جا کر تینوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے سر جوڑ لیے اور نیچے کو کر لیے تین

چار منٹ بعد کھوجی نے مجھے بلایا۔ میں دوڑ کر پہنچا۔ وہاں پاؤں کے نشان تھے۔  
 ”ایک عورت بھی ساتھ ہے۔“ کھوجی کی ماں نے کہا۔ ”وہ یہاں تک  
 ساتھ آئی ہے اور واپس چلی گئی ہے۔ مرد پر بوجھ ہے۔ بوجھ لاش کا ہی ہو سکتا  
 ہے۔۔۔ آگے چلو۔“

وہ تینوں سنبھل سنبھل کر آگے چلنے لگے۔ بعض گھرے مجھے بھی نظر آئے مگر میں  
 انہیں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔

”مرد آگے ہے۔“ ماں نے رُک کر کہا۔ ”اُس سے اچھی طرح چلا نہیں  
 جاتا۔ عورت پیچھے ہے۔ اُس کی چال بھی صحیح نہیں۔“ آپ سُن کر حیران ہوں  
 گے کہ کھوجی کی ماں نے کہا۔ ”عورت کی عمر تیس سال سے کم ہے۔۔۔ شادی شدہ  
 ہے۔ اس کی چال ایسی نہیں جیسی اُس بیوی کی ہوتی ہے جو پیدل سفر میں اپنے  
 خاوند کے پیچھے پیچھے ہنسی خوشی چلتی ہے۔ یہ مجرم اور گناہگار عورت کے قدم  
 ہیں۔ اس کے قدم اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں اُٹھ رہے۔ یہاں مرد رُک گیا  
 ہے۔ عورت اُس کے دائیں طرف آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔“ کھوجی نے ایک  
 طرف زمین پر دیکھ کر کہا۔ ”یہ بھی دیکھتے چلو۔ وہ واپس جا رہی ہے۔“

گھر سے ہمیں نشیب سے نکال کر اوپر لے گئے۔ وہاں جگہ پکی تھی اور اس  
 پر نوکدار کنکریاں تھیں۔ کوئی گھروا وضع نہیں تھا۔ کھوجیوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر  
 اس طرح دیکھا جیسے زمین کو سونگھ رہے ہوں۔ کھوجی کی ماں نے کنکریوں کو دیکھ کر  
 رُخ کا تعین کیا اور کہا۔ ”ادھر سے آئے ہیں۔“ پندرہ سولہ قدم آگے زمین  
 نرم آگئی جہاں گھرے اور زیادہ واضح تھے۔ ایک جگہ ماں رُک کر بیٹھ گئی تھوڑی سی

مٹی اٹھا کر ہتھیلی پر پھیلائی اور اُسے انگلیوں سے پھیلا پھیلا کر سونگھا۔ کہنے  
 لگی۔ ”یہ آدمی زخمی ہے یا یہ مقتول کا خون ہے۔“

میں نے مٹی سونگھی تو بوجھوں کی تھی۔ چھوٹا سا قطرہ وہاں گر ا تھا جو خشک  
 ہو چکا تھا۔ میں نے یہ مٹی اپنے رومال کے کونے میں باندھ لی، اور ماں سے  
 کہا کہ مجھے ایسی مزید مٹی کی ضرورت ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی عثمان سے کہا کہ وہ  
 ان دو گھروں کے مولڈ تیار کرائے۔ وہ وہیں سے چلا گیا۔ میں کھوجیوں کے ساتھ  
 آگے گیا۔ کچھ جگہ کچی تھی۔ سادوں کی وجہ سے رات اُدس پڑی تھی جس سے گھرے  
 اور زیادہ صاف ہو گئے تھے۔

”عورت کی چال بالکل قدرتی نہیں۔“ ماں نے کہا۔ ”مرد پر لاش کا بوجھ  
 ہے۔ عورت اُس کا بوجھ صحیح کر رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں نے  
 قتل کیا ہے۔“

## کھڈ میں ایک عورت، دو آدمی

دس بارہ قدم آگے جا کر گھر سے ہمیں ایک کھڈ میں اتار لے گئے۔ کھڈ آٹھ  
 دس فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ گہرائی اتنی کہ اس میں درمیانہ قد کا آدمی کھڑا ہو  
 جائے تو چھپ جاتا تھا۔ کنارے پر جھاڑیاں تھیں۔ کھڈ کے اندر ہری گھاس اُگی  
 ہوئی تھی۔ کناروں کے ساتھ بھی گھاس تھی۔ یہ گھاس جو نیچے تھی اور کناروں کے  
 ساتھ تھی وہ گھنی نہیں تھی۔ پھر بھی گھاس نے کہانی بیان کر دی۔ شہ کی گھاس جگہ جگہ

سے دہی مٹی ہوئی تھی۔ جو کچھ ہوا اسی کھڈ میں ہوا تھا۔ کھوجی، اُس کی ماں اور بیوی کھڈ کے باہر زمین کو دیکھ دیکھ کر گھومنے لگیں۔

”یہ کھرا لاشن کا ہے۔“ کھوجی نے کہا اور وہ ایک طرف چل پڑا۔ ایک جگہ رُک کر کہنے لگا۔ ”یہ تو ان کے ساتھ آ رہا ہے۔۔۔۔ اب یہ کھرا دیکھیں۔ یہ اُس کا ہے جو لاشن اٹھا کر پیل تک گیا ہے۔ اس پر کوئی دزن نہیں۔ بوڑھی ماں نے چند قدم دُور تک جا کر دیکھا اور واپس آ کر کہا۔ ”یہاں عورت اپنی اصل چال چل رہی ہے۔ قدموں کی لمبائی ایک جیسی ہے۔ دو آدمی ساتھ ہیں۔ تینوں آگے پیچھے چل رہے ہیں۔“

میں کچھ دُور تک کھڑے دیکھتا گیا۔ بعض صاف تھے، بعض ایک دُوسرے میں گڈنڈ ہو گئے تھے۔ صرف دو جگہوں پر میں نے مقتول کے چل کا کھرا دیکھا۔ ماں بھی میرے پاس آ گئی اور مجھے کچھ اور آگے لے گئی۔ ایک جگہ کھڑے بالکل ہی واضح نہیں تھے کیونکہ ایک دُوسرے پر چڑھے ہوئے تھے اور وہاں سے مٹی ہٹی ہوئی تھی۔

کھوجی کی ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کچھ سمجھے؟“ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ اُس نے آنکھ مار کر اور مسکرا کر کہا۔ ”تم ہاتھ کے نہیں، ذیل خانے کے داروغہ معلوم ہوتے ہو۔“ ستر بہتر سال کی بڑھیا کا یہ مذاق مجھے بہت ہی پسند آیا۔ اُس نے راز داری سے کہا۔ ”وہ اسے کھڈ میں لے جا رہا تھا۔ یہاں وہ بے قابو ہو گیا اور عورت کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ دوسرا آدمی رکا نہیں۔ اُس نے کہا ہو گا۔“ اُسے یہاں ٹھیک نہیں۔ آگے چلو۔۔۔

یہ سب عورت کا چہرہ ہے۔“

یہ واضح ہو گیا کہ مقتول کھڈ تک ایک عورت اور ایک آدمی کے ساتھ آیا۔ بہر حال یہ بالکل واضح ہو گیا تھا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔۔۔۔۔ تینوں قبضے سے آئے اور قبرستان کے پہلو سے گزرے۔ ہم واپس گئے تو کھڈ کے اندر میں اکیلا گیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ کوئی کام کی چیز مل جائے۔ کام کی دو چیزیں ملیں۔ ایک چاقو تھا جو جرائم پیشہ لوگوں والا بڑا چاقو نہیں بلکہ عام قسم کا گھریلو چاقو تھا۔ اس کا بلیڈ نوکدار تھا۔ یہ چاقو گھاس میں سے اس حالت میں برآمد ہوا کہ اس کا دستہ مٹی میں دبایا ہوا تھا۔ بلیڈ کا پچھلا حصہ بھی مٹی میں تھا۔ نوک باہر تھی اور نوک پر اتنا سا خون جما ہوا تھا جو عام آدمی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

بہت ہی غور سے دیکھنے سے کام کی ایک چیز اور مل گئی۔ یہ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا تھا جس کی لمبائی تقریباً نصف انچ تھی۔ مزید ٹکڑوں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ کُل چھ ٹکڑے ملے۔ تین نصف انچ سے بھی چھوٹے تھے اور باقی ذرا بڑے۔ یہ سب مٹی میں دبے ہوئے تھے۔ چاقو اور چوڑیوں کے ٹکڑے مٹی میں دبے ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں لڑائی ہوئی ہوگی اور یہ چیزیں پاؤں تلے آ کے نرم مٹی میں دب گئیں چاقو کے دستے پر انگلیوں کے نشان مٹ گئے تھے۔

کھوجیوں کو نیچے بلایا۔ انہوں نے بہت غور سے دیکھا۔ کوئی واضح کھرا نظر نہ آیا۔ انہوں نے زمین اور گھاس کو کئی جگہوں سے سونگھا۔ ماں نے رائے دی کہ یہاں ایک عورت پر دو مردوں کی لڑائی ہوئی ہے۔ چاقو کی نوک بتا رہی تھی کہ کسی کو چاقو لگا ہے۔ پیل سے لاشن کے کپڑوں پر خون تھا۔

## اُسے خاوند کی موت کا غم نہ تھا

میں لاش دیکھنے گیا۔ تماشائیوں میں سے دو معزز قسم کے آدمی، ایک ہندو اور ایک مسلمان بلائے۔ کاغذی کارروائی کی تصدیق کے لیے انہیں ساتھ رکھا۔ دفعت پر میں خود چڑھا کیونکہ میں اُوپر بھی کوئی عسراغ دیکھنا چاہتا تھا۔ چڑھنا مشکل نہیں تھا۔ بہت پرانا درخت تھا۔ تاج چڑا ہوا کر زمین سے دو تین گز اُوپر جا کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ٹہن موٹے تھے۔ اُوپر نیچے نہیں تھے۔ میں تنے اور اس کی کھوہ میں غور سے دیکھتا اُوپر چلا گیا۔ چار پانچ آدمیوں کو نیچے کھڑا کیا۔ اُوپر سے رستہ کھولا اور لاش آہستہ آہستہ نیچے جانے لگی۔ چار پائی آگئی تھی۔ لاش اس پر ڈال دی گئی۔

! نیچے آکر میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ اُس کے دائیں بازو سے خون بہتا رہا تھا جو جم گیا تھا۔ گرتے کی آستین وہاں چپک گئی تھی۔ میں نے آستین ہٹا کر زخم دیکھنے کی کوشش نہ کی کیونکہ پوسٹ مارٹم سے پہلے لاش کی حالت میں کوئی رد و بدل نہیں کرنا تھا۔ لاش کی مُٹھیاں بند ہو کر کڑ گئی تھیں۔ میں نے ایک مُٹھی کھولنے کی کوشش کی لیکن کھل نہ سکی۔ میں نے زیادہ زور نہیں دیا۔ گرتے اور باجہ ہٹا کر جسم دیکھا۔ بازو کے علاوہ اور کہیں چوٹ یا زخم نہیں تھا۔ گلے سے رستہ اُتار کر دیکھا۔ وہاں رستے کا کوئی نشان نہ تھا۔ البتہ ہاتھوں سے ہلاک کرنے کے نشان صاف تھے۔ میں نے ایسے کئی مقتول دیکھے تھے۔ پھانسی سے مرے میوٹے انسان کی گردن پر نشان اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مقتول کو قتل کر کے اس کے گلے میں رستہ

وہاں سے دو گھر سے باہر نکلے۔ ایک تو عورت کا تھا اور دوسرا آدمی کا۔ کھڈ کے کنارے عودی نہیں ڈھلانی تھے۔ ایک طرف سے آسانی سے اُترنا اور چڑھنا جاسکتا تھا۔ وہاں کھوجی کی بیوی نے غور سے دیکھ کر کہا کہ اس آدمی کی پیٹھ یا کندھوں پر لاش ہے اور وہ ہاتھ کھڈ کی ڈھلان پر رکھ رکھ کر اُوپر چڑھا ہے۔ عورت اس کے پیچھے باہر نکلی ہے۔ باہر نکلنے والے گھڑوں میں مقتول کا کھڑا نہیں تھا۔ وہ کھڈ میں زندہ داخل ہوا اور یہاں سے اُس کی لاش نکلی۔ مرنے والا تو مر گیا تھا۔ مجھے اب ملی ہوئی گھاس، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں اور مٹی سے یہ راز معلوم کرنا تھا کہ وہ عورت کون تھی جس نے اپنی عصمت دو مردوں کے درمیان رات کی تاریکی میں اس کھڈ میں لارکھی اور انہیں بھڑیے بنا دیا تھا اور مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون تھا جو لاش کو کھڈ سے پیل تک لے گیا۔ میرے ذہن میں یہ ارادہ آیا۔ ”عثمان کی بات مان لو۔ دیکھ دو خوشی۔“

”نہ احمد یار خان“ میرے ضمیر نے مجھے روک دیا۔ ”اگر تم نے اس عورت اور اس آدمی کو پکڑ کر اسی طرح نہ لٹکایا جس طرح پیل کے ساتھ لاش لٹک رہی ہے تو کل برسوں ایک اور خاوند کی لاش کہیں بیٹھی ہوئی ہوگی۔“

میرا دھیان فوراً مقتول کی بیوی اور اُس کے چچا زادہ نادر کی طرف گیا جنہوں نے تمھانے پورٹ درج کرائی اور کہا تھا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے۔ میرے پاس چوڑی یا چوڑیوں کے لال ٹکڑے تھے اور کھڑے۔ چاقو تو کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ مقتول کا بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال میرا اتھنا نیداری تجربہ بتا رہا تھا کہ بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کر خاوند کو ایسے طریقے سے قتل کرایا ہے کہ خودکشی کی واردات لگے۔

میں نے مقتول کی بیوی اور نادر کو مشتبه افراد میں شامل کر لیا۔

ڈالا گیا تھا۔ اُس وقت تک خون کی حرکت رگ چکی تھی۔ کُرتے اور پا جامے پر خون کے دھبے تھے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے سمجھرائی اور ساتھ ایک سوالنامہ مریا بھی بھیجا میں نے سول سرجن کے نام چٹھی میں لکھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ مقتول کے کپڑوں پر اُس کا اپنا خون ہے یا کسی دوسرے انسان کا بھی ہے۔ موت کا وقت ضرور لکھا جائے اور اس طرح کی چند اور باتیں پوچھیں جو عام طور پر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شامل نہیں کی جاتیں۔ پوسٹ مارٹم ڈاکٹروں کا معمول ہوتا ہے جو وہ معمول کے مطابق ہی کرتے ہیں۔

قصبے میں پوسٹ مارٹم کا انتظام تھا لیکن مرے ہوئے انسان کے خون اور خشک خون کے ٹیسٹ کا انتظام پچاس میل دُور کے شہر میں تھا۔ خون جب تک بہ جاتا ہے تو اس کا گروپ تو معلوم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی دیگر تفصیلات معلوم کرنا ممکن نہیں رہتا کیونکہ خشک ہوتے ہی BLOOD CELLS مریاتے ہیں گروپ معلوم ہو جانے سے ملزم پر شک ذرا پختہ ہو سکتا ہے لیکن شکل یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی گروپ کا خون بے شمار لوگوں میں ہو سکتا ہے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہ کر مخروں کو چمکا کر دیا۔ میرے مخروں میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ابتدائی تفتیش کے لیے میں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ سب سے پہلے مقتول کی بیوی کو بلایا۔ اپنے منگے کو وہاں سے ہٹا دیا۔ میں پیل کی موٹی سی جڑ پر بیٹھ گیا جو زمین سے ڈیڑھ ایک فٹ اُپر تھی۔ میں نے اس جوان لڑکی کو بڑی غور سے دیکھا اور اُسے کہا — ”گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ مجھ سے

گھبرانانہ لوگوں کی باتوں سے۔ تمہارے خاوند نے خودکشی کر لی ہے۔ کسی کی زبان بند نہیں کی جاسکتی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنا ئیں گے۔ خاموشی سے سُنتی رہنا۔“ اُس نے جب میرے مُنہ سے خودکشی کا لفظ سُنا تو اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہرائی اور گزر گئی۔ چند اور چہرہ دانہ باتوں سے میں نے اس کی گھبراہٹ ختم کر دی اور اس کی کلائیوں کو دیکھا۔ اس کی دونوں کلائیوں میں بالکل اسی رنگ اور اُس قسم کی چوڑیاں تھیں جس قسم کی چوڑیوں کے ٹکڑے مجھے کھٹے میں سے ملے تھے۔

میں ان کے متعلق اُس سے ابھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک کلائی میں تین اور دوسری میں پانچ چوڑیاں تھیں۔

”تم نے اتنے اعتماد سے کیوں کر دیا تھا کہ تمہارے خاوند نے خودکشی کی ہے؟ کیا وہ تمہیں بتا کر گیا تھا یا اُس نے اس سے پہلے کبھی خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟“

”وہ پریشان رہتا تھا۔“ اُس نے ذرا جھجک کر جواب دیا۔ ایسے سوال کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔

”پریشانی کیا تھی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اُس کی عادت ہی کچھ ایسی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”چُپ چُپ رہتا تھا۔ اُس کی بڑی بہن شادی شدہ ہے۔ اُس کے خاوند کو دو سال سے دق کا مرض لگا ہوا ہے۔ اب تو بے چارہ ختم ہونے والا ہے۔ میرے خاوند کو بہن کا بھی غم تھا۔“

”خاوند کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟“  
 اُس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ ”جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں۔“  
 رات کو وہ گھر سے کس وقت نکلا تھا؟

”کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد باہر گیا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”کوئی  
 ایک گھنٹے بعد واپس آیا اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔  
 تیزی سے باورچی خانے میں گیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔“  
 ”تم پریشان نہیں ہوؤں گے کہ وہ اتنی تیزی سے آیا اور باہر نکل گیا؟“

وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی۔ نہیں ابھی اُسے صرف بھانپنا چاہتا  
 تھا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اُسے خاوند کے مرنے کا کوئی غم نہیں تھا۔ اس کا یہ بیان صبح  
 نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کا خاوند باہر گیا، آیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ بہر حال میں نے  
 اُسے محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ مشتاق نمبر ایک ہے۔ اُسے تسلی دلا سے دے  
 کر یہ کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ میں نے اُس سے کیا پوچھا ہے۔ پھر اُسے رخصت کر  
 دیا اور اُس کے چچا زاد کو بلا یا جس کے اصلی نام کی جگہ میں فرضی نام نادر استعمال کر  
 رہا ہوں۔ اُس سے پوچھا کہ اُسے کس وقت پتہ چلا تھا کہ اُس آدمی کی لاش درخت  
 کے ساتھ لٹک رہی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ابھی بہت سویر تھی۔

”کس سے پتہ چلا تھا؟“

”باہر گلی میں لوگ باتیں کر رہے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں  
 اپنے گھر والوں کے ساتھ باہر نکلا تو یہ خبر سُنی۔ میں دوڑتا ہوا آیا اور لاش دیکھ کر  
 اس کی بیوی کو جاب بتایا۔“

”بیوی کیا کر رہی تھی؟“

”سوئی ہوئی تھی۔“

”تم نے دروازہ کھٹکھٹایا ہوگا؟“

”میں اندر چلا گیا تھا۔“ اُس نے گھبرا کر کہا اور فوراً بولا۔ ”نہیں۔۔۔۔“

دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ چُپ ہو گیا اور سوچ کر بولا۔ ”دروازہ تو کھٹکھٹا تھا۔“

”گھر میں اور کون تھا؟“

”یہ لڑکی ایک تھی۔“ اُس نے انکشاف کیا۔ ”لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ

اکیلی رہتی تھی۔ مقتول کے والدین الگ اپنے مکان میں رہتے ہیں۔“

”تم نے متوفی کی بیوی کو بتانے کی بجائے متوفی کے گھر والوں کو کیوں نہ بتایا اور

اُس کے باپ کو کیوں نہ ساتھ لے کے تھانے میں آئے؟ بیوی کو ساتھ لانے کی

کیا ضرورت تھی؟“

وہ بل گیا۔ اُس نے جواب دیا مگر اس کی عقل اور زبان کا رشتہ ٹوٹ چکا

تھا۔ میں نے اُسے بڑی گہری نظر سے دیکھا اور اُسے بھی یہ تاثر دیا کہ اُس نے

اچھا کیا کہ متوفی کی بیوی کو جا کر اطلاع دی اور اس کی رہائش گاہ کے اُسے تھانے لے

آیا۔ اُسے شاباش دی۔ اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اُسے میں نے رخصت کر دیا

اور کھوجی کو بلا یا۔ اُسے مقتول کی بیوی اور نادر کے گھرے دکھائے۔ اُس نے غور سے

دیکھے۔ اپنی بیوی اور ماں کو بلا یا۔ لڑکی کے گھرے کے متعلق تینوں نے رائے دی کہ

پاؤں کا سائز ملتا ہے۔ جو ترقی بدلی ہوئی ہے۔ نادر کے گھرے کے متعلق بھی انہوں

نے یہی رائے دی۔ بہر حال ان دونوں پر میرا شک پکتا ہو گیا۔

مقتول کے والدین کے بیان مندرجہ ذیل تھے۔ اُس کی ماں کو بلانا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ ماں ہے اور اس وقت اُس کے جذبات بڑی طرح بھڑکے ہوئے ہیں، کوئی کام کی بات نہیں کر سکے گی۔ پھر یہ سوچ کر اُسے بلایا کہ بیڑے کے ہوئے جذبات میں اُس کے مُنہ سے ایسی باتیں بھی نکل آئیں گی جو نارمل حالت میں نہیں کہی جاتیں۔ مقتول کی دو بہنیں بھی تھیں۔ انہیں بلانا ضروری نہیں تھا۔ مقتول کے باپ کو اور اس کی ماں کو بلایا۔ ماں نے تو مجھے بھی ہلکے رکھ دیا۔ اُس کا جوان بیٹا مارا گیا تھا۔ اُس کے خاوند نے تحمل سے میرے سوالوں کے جواب دیئے۔ ماں نے مقتول کی بیوی کو اپنے بیٹے کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ میں نے دو گھنٹے صرف کیے اور جو معلومات حاصل ہوئیں وہ مختصر الفاظ میں یہ تھیں کہ ساڑھے تین سال گزرے مقتول کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ لوگ اپنے مکان میں رہتے تھے جو خاصا کشادہ تھا مگر لڑکی نے سسرال کے ساتھ بے سلوکی شروع کر دی۔ مقتول بھلا ماں آدمی تھا۔ اس کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا جس کا ثبوت اس کی داڑھی تھی۔ یہ گھرانہ غریب اور متوسط درجے کے درمیان کا تھا۔ مقتول قبیلے میں چھوٹے سے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ یہ ایک ہندو کا کارخانہ تھا جس میں لکڑی کے کھلونے، ٹیلیں اور فلوریسپیوں کے سٹیٹ بنیتے تھے۔

## خاوند مسکین، لڑکی شو قین

لڑکی نے سسرال کے خلاف اپنے خاوند کے کان بھرنے شروع کر دیئے

وہ بے چارہ اُس کی ماں لیتا اور جب اُسے ماں اور بہنوں سے اس کے جواب میں باتیں معلوم ہوتیں تو وہ پریشان ہو جاتا۔ مقتول کی بیوی دراصل چاہتی یہ تھی کہ اپنے خاوند کے ساتھ الگ مکان میں رہے۔ خاوند اور اُس کے گھروالوں کے لیے یہ صورت مالی لحاظ سے نقصان دہ تھی۔ مکان کا کرایہ الگ تھا، مگر بیوی ایسے حالات پیدا کرتی جا رہی تھی کہ خاوند کے والدین اُسے الگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

نادراں لڑکی کے چچا کا بیٹا تھا۔ یہ گھرانہ صحیح معنوں میں امیر تھا۔ نادراں دو بہنوں میں اکلوتا لڑکا تھا۔ والدین نے لاڈ پیار سے اُسے بہت سر جوڑھا لیا تھا۔ وہ قاتل کی بیوی کے رشتے کا خواہشمند تھا۔ اُن کا آپس میں میل جول بھی تھا جس کے متعلق لوگ باتیں بھی کرتے تھے لیکن نادراں کے والدین اس لڑکی کا رشتہ صرف اس لیے قبول نہیں کرتے تھے کہ لڑکی غریب گھرانے کی تھی اور یہ گھرانہ ان کی شان و شوکت کے مطابق جمیزو دینے کے قابل نہیں تھا۔ دو گھنٹے بھائیوں میں امیری اور غریبی کی دیوار کھڑی تھی۔ ان کی اولاد اسی تقریب کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لڑکے کے لیے تو چھوٹے داروں اور تاجروں کی بیٹیوں کے رشتوں کے پیغام آ رہے تھے مگر یہ لڑکا اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی صناد کر رہا تھا۔ یہ ساری ایک ہی ذات برادری تھی۔ مقتول کے والدین نے لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ نادراں لڑکی سے ہلتا جھلتا ہے، اس لیے وہ اس لڑکی کا رشتہ مانگنے سے بھجکتا ہے۔

ایک روز نادراں کے باپ نے مقتول کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے لڑکے کا رشتہ اس لڑکی سے کرادے۔ بلکہ اُسی نے رشتہ طے کرادیا اور مقتول کے والدین کو تسلی دی کہ لڑکی خراب نہیں۔ نادراں اور وہ بہن بھائی ہیں۔ اُن کا

پیار پاک اور صاف ہے۔ چنانچہ لڑکی کو مقتول کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ نادر کے والدین خوش تھے کہ جس لڑکی کو وہ چاہتا ہے وہ بیاہی گئی ہے اور اب وہ ان کی پسند اور مرضی کا رشتہ قبول کرے گا مگر اُس نے کوئی رشتہ قبول نہ کیا۔ اس کی بجائے وہ اسی لڑکی کے پیچھے پڑا رہا مگر سسرال میں وہ لڑکی سے کھلے بندوں نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ لڑکی خاوند کے ساتھ آگ رہے آخر اُس نے خاوند کو الگ کر لیا اور نادر نے انہیں اپنا چھوٹا سا ایک مکان خالی کر دیا۔ یہ مکان ان سب کے گھروں سے دُور تھا اور کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ نادر نے یہ مکان مقتول کو صرف چار روپے ماہوار کرائے پر دے دیا۔ اُس زمانے میں مکانوں کے کرائے بہت کم ہوتے تھے۔ مکانوں کے مالک کر ایہ داروں کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ آج شہر میں جس مکان کا کر ایہ ایک سو روپے ہوتا ہے وہ اُس دور میں پانچ روپے سے مل جاتا تھا۔

مقتول اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں چلا گیا تو نادر وہاں کھلے بندوں جانے لگا۔ اکثر لوگ بتاتے تھے کہ مقتول کا رخنے چلا جاتا تھا تو نادر اُس کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ مقتول آدمی تنخواہ والدین کو دے دیتا تھا۔ اس پر اُس کی بیوی نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ یہ لڑکی بعض اوقات اپنے ہاتھوں اپنی ساس کو پیسے دے آتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر لڑکی کو چوری پیچھے پیسے دیتا تھا۔ مقتول کے والدین کے بیان کے مطابق چھ سات ماہ بعد مقتول پریشان رہنے لگا۔ وہ نادر کا گھر میں آنا جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک سال بعد میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔ لڑکی ایک بار میکے

گئی تو مقتول نے اُس کے والدین سے کہہ دیا کہ وہ اُسے اپنے گھر نہیں لائے گا۔ سمجھوتہ کر لیا گیا۔ اُدھر نادر نے شادی سے انکار کر دیا۔ وہ ماں باپ کا لاڈ سے بگڑا ہوا بچہ تھا۔ اُس کا گھر نہ امیر اور نہ شور و سونخ والا بھی تھا۔ برادری پر اس گھرانے کا دیدہ بہ تھا۔ ایک بار مقتول نے نادر کے باپ سے شکایت کی کہ اُس کا بیٹا اُسے بدنام کر رہا ہے۔ باپ نے اُلٹا مقتول کو ڈانٹ دیا۔

دو سال گزرے تو مقتول نے والدین سے کہا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ والدین نے اُسے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس میں اپنی بے عزتی ہے۔ برادری میں مخالفت پیدا ہو جائے گی۔ سب سے بڑی شکل یہ تھی کہ حق مہر پانچ ہزار روپیہ لکھا گیا تھا اور بیس روپے ماہوار خرچ تھا۔ مقتول کے گھرانے میں اتنی رقم ادا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کی بجائے انہوں نے اُسے شہرہ دیا کہ بیوی کے بڑے بھائی سے بات کرو۔ اس لڑکی کا یہ بڑا بھائی بدعاشی میں قدم رکھتا تھا۔ رکھ رکھاؤ والا بھی تھا اور عرا بھی کھیلتا تھا۔ چرس بھی پیتا تھا۔ گھر میں اُس نے ایک گائے اور ایک بھینس رکھی ہوئی تھی۔ محلے والے اس سے دُودھ بھی لیتے تھے۔ اُس کی عادتیں اچھی نہیں تھیں لیکن آدمی اچھا تھا۔ مقتول نے ایک روز ڈرتے بھجکتے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن کے تعلقات نادر کے ساتھ اچھے نہیں اور اگر وہ باز نہ آئی تو مقتول اُسے طلاق دے دے گا۔

لڑکی کے بھائی نے اُسی وقت مقتول کے ساتھ اُس کے گھر جا کر اپنی بہن مقتول کی بیوی کو اس قدر پٹیا کہہ دوڑ تو وہ گھر کا کام کاج بھی نہ کر سکی۔ مقتول نے اپنے والدین کو یہ سارا واقعہ سنایا تھا۔ اُس کی بیوی کے بھائی نے اُس کی بیوی سے



## لال چوڑیوں والی قاتلہ

اس لڑکی کے بھائی سے ملنا ضروری تھا جس نے اس کی پٹائی کی تھی۔ میں ان لوگوں سے فارغ ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مقتول کی ماں وہاں سے ہٹتی نہیں تھی۔ کہتی تھی کہ اس لڑکی کو اور نادر کو اسی درخت کے ساتھ پھانسی دی جائے۔ بڑی مشکل سے اُسے اُٹھایا۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ لڑکی کے بھائی کو بلالائے۔ تماشائی قبرستان کے دوسرے سرے پر تھے۔ کانسٹیبل نے اُسے اس ہجوم میں بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ میں اُس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ اُس کے گھر آدمی دوڑا یا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے کہیں باہر نکل گیا ہے۔ اسی میں آدھا دن گزر گیا۔

ہسپتال سے ایک کانسٹیبل آیا۔ اُس نے کہا کہ سول سرجن مجھے بلا رہا ہے۔ میں ہسپتال چلا گیا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ مجھے ہسپتال بلانے کی ضرورت پیش آئی تھی کہ لاش کی بندھنی سے کچھ برآمد ہوا تھا۔ یہ چوڑی کا ایک ٹکڑا تھا جس کی لمبائی پون اسی تھی۔ یہ اس طرح ٹوٹا تھا کہ اس کے دونوں سرے سونٹیوں کی طرح نوکیلے ہو گئے تھے۔ ٹکڑا مقتول کے ہاتھ میں رہا اور اُس کی مٹھی بند ہو گئی۔ ٹکڑے کے دونوں سرے اس کی ہتھیلی میں اتر گئے۔ میں نے یہ ٹکڑا بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ اُن ٹکڑوں جیسا تھا جو میں نے کھڈ سے اُٹھا کر رومال میں باندھے تھے۔ مقتول کی بیوی کی چوڑیاں

کہا تھا۔ اتنا نیک خاوند، اور تم اس کی داڑھی کو داغدار کر رہی ہو۔ اس کے پاؤں میں سر رکھو۔ اور لڑکی نے مقتول کے پاؤں میں سر رکھ دیا تھا۔

چند دنوں بعد مقتول نے اپنے والدین کو بتایا کہ نادر نے اُسے دھکی دی ہے کہ اگر اُس نے پھر کبھی اپنی بیوی کی شکایت اس کے بھائی سے کی تو اُسے بڑا خوفناک نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ مقتول جھلے مانس اور نیک آدمی تھا۔ اُس میں لڑائی بھڑے اور بہرا پھیری کی بوجھ نہیں تھی۔ یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ ڈر گیا تھا یا اپنی عزت کی خاطر چُپ ہو گیا تھا۔ اتنا ضرور پتہ چلا کہ اپنی بیوی کے ساتھ اُس کی بول چال بند ہو گئی تھی۔ مقتول کی دو بہنیں تھیں۔ ایک چھوٹی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور ایک بڑی جس کی شادی مقتول کی شادی سے چند ماہ بعد ہوئی تھی۔ مقتول کی ماں بیٹے کے گھر نہیں جاتی تھی۔ بہنیں جمایا کرتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ میاں بیوی اکٹھے تو رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے بولتے نہیں۔ بیوی کھانا پکا کر اُس کے آگے رکھ دیتی ہے اور وہ کھا لیتا ہے۔ غم اور پریشانی سے وہ دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر اُس نے طلاق کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسے کسی نے مشورہ دیا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کے چال چلن کے خلاف گواہیاں مل سکتی ہیں، وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کر دے کہ اُس کی بیوی بد چلین ہے اس لیے وہ اسے مجبوراً طلاق دینا چاہتا ہے۔ اس طرح اُسے حق مہر اور ماہوار خرچ میں بہت رعایت ہو جائے گی۔

گھر والے اُسے اس کا روائی سے روک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ برادری کے معزز افراد کے سامنے یہ مسئلہ پیش کریں۔ ساڑھے تین سال ہو گئے تھے۔ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہونے کے بھی آثار نہیں تھے۔

اسی قسم کی تھیں بلکہ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی کی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔

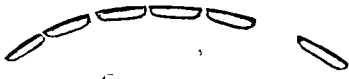
ہتھیلی والے ٹکڑے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی نے اپنے آشنا کی مدد کرتے ہوئے مقتول کو پکڑا ہوا اور مقتول کے ہاتھ میں لڑکی کی کلائی اگئی ہوگی۔ ایک دو چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں اور یہ ٹکڑے اُس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ عین اُس وقت اُس کا کلا اتنی زور سے دبا گیا کہ اُس کی مٹھیاں بند ہو گئیں اور ٹکڑے کے سرے اُس کی ہتھیلی میں اتر گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ لڑکی نے قتل میں مدد دی ہے۔

ڈاکٹر نے مجھے لاش کے بازو کا زخم دکھایا۔ ڈاکٹر ایسے زخم پوسٹماٹم رپورٹ میں لکھ دیا کرتے ہیں۔ وہ بالکل مندری نہیں سمجھتے کہ تھانیا رول کو بلا کر زخم دکھائے جائیں۔ اس ڈاکٹر نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ وہ میرا دوست تھا اور میری اس عادت سے واقف تھا کہ میں بال کی کھال اتار کرتا ہوں۔ یہ زخم کچھ اور ہی قسم کا تھا۔

”یہجے ملک صاحب! آپ کے ایک ملزم کی نشاندہی تو میں ہی کر دیتا ہوں“ ڈاکٹر نے مجھے کہا۔ ”وہ لال چوڑیوں والی ہے اور اُس کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے یا آدھا ہے۔ بہر حال اُس کے سامنے کے دانتوں میں ایک دانت کاٹا نہیں۔“

ڈاکٹر نے مجھے لاش کا دایاں بازو دکھایا۔ میں نے لاش میں پہلی چیز دیکھی کہ ابھی غراب ہونی شروع نہیں ہوئی۔ رات بھر باہر ہوا میں لٹکتی رہی

تھی۔ دایاں بازو دیکھا۔ کہنی سے نیچے جہاں گوشت کا پتلا زیادہ موٹا ہوتا ہے وہاں کسی انسان کے دانت اترے ہوئے تھے۔ اتنی زور سے کسی نے بازو کاٹا تھا کہ وہاں سے خون چھوٹ کر بہ نکلا تھا۔ اس کے بعد مقتول مگر گیا تو خون بند ہو گیا اور زخم پر کڑی چیک گیا۔ ڈاکٹر مجھے ہی زخم دکھانا چاہتا تھا۔ اُس نے زخم دھو ڈالا تھا۔ اس کی شکل یہ تھی:



سات دانت نیچے کے گوشت میں اترے تھے مگر اوپر کے سات میں سے چھ دانت اترے تھے۔ دائیں طرف کے آخری دانت کے ساتھ والے دانت کی جگہ خلا تھا۔ میں نے بڑی غور سے دیکھا تو اس خلا میں مجھے ہلکا سا نشان نظر آیا لیکن یہ زخم نہیں تھا۔ صرف دباؤ پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دانت مارتے والے کا دائیں طرف سے ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اب لاش کو تو دفن ہو جانا تھا۔ میں نے ایک باریک کاغذ لیا۔ اسے زخم پر رکھ کر قلم سے زخموں پر اسی شکل کی لکیریں ڈالیں۔ اس طرح میرے پاس مندرجہ بالا شکل محفوظ ہو گئی۔ بال برابر فرق نہیں رہنے دیا۔ یہ نہایت کارآمد سراخ تھا۔

میں نے مقتول کی بیوی کو غور سے نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے دانت کیسے

تھے مجھے اب فوری طور پر اُسے پکڑنا تھا۔ اس لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کھانا کھا کر باہر نکلا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے اسے جھوٹ ثابت کر دیا کیونکہ لاش کا معدہ خالی تھا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق موت رستے سے نہیں انسانی ہاتھوں سے گلا دبانے سے واقع ہوئی ہے۔ موت کا وقت رات نو بجے تعیین کیا گیا۔ گردن کا منہ ٹوٹنے کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ مقتول کی لاش درخت پر لے جانی گئی اور گلے میں رستہ ڈال کر پھینکی گئی جس سے منہ ٹوٹ گیا اور گردن لمبی ہو گئی۔

لاش کے گھٹنوں اور گھٹنیوں پر ایسے نشان تھے جیسے گھسیٹے گئے ہوں اور کوئی زخم نہیں تھا۔ اس سے میں نے یہ قیاس آرائی کی کہ چاقو مقتول کے پاس تھا۔ اگر قاتل کے پاس ہوتا تو مقتول کے جسم پر چاقو کے زخم ہوتے۔ چاقو کی نوک پر خشک خون تھا۔ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کی لہذا یہ کہا جاسکتا تھا کہ قاتل زخمی ہے۔

ڈاکٹر نے اسی روز چاقو اور مقتول کے کپڑے خون کی شناخت اور گروپ معلوم کرنے کے لیے بھجوا دیئے۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ ان کپڑوں پر صرف مقتول کا خون تھا یا قاتل کا بھی تھا۔

میں یہ سوچتا ہوا اٹھانے کی طرف چل پڑا کہ یہ غوغائی ڈرامہ کس طرح کھیلا گیا۔ میرے سامنے ایک کہانی یہ آئی کہ مقتول کی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ کھڑیں گئی۔ خاندان نے اُس کا تعاقب کیا۔ وہ چاقو لے کر گیا تھا۔ اُس نے دونوں کو عین موقع پر پکڑ لیا۔ چاقو کا وار کیا لیکن بیوی نے یا اُس کے آشنا نے اُس کے ہاتھ

سے چاقو گرانے کے لیے اُس کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ یہ حرکت عام طور پر عورتوں کی ہوتی ہے۔ مرد دانتوں سے نہیں کاٹتا کرتے۔ چاقو اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ چاقو کے اوپر لڑائی ہوئی۔ چاقو مٹی میں دب گیا۔ مقتول کو گرایا گیا یا کھڑے کھڑے اُس کا گلا دبا دیا گیا۔

ایک صورت یہ بھی ذہن میں آئی کہ مقتول کسی عورت کے ساتھ اس کھڑیں تھا کہ عورت کا خاندان تعاقب میں آ گیا۔ اُس نے مقتول کو گلا دبا کر مار دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا عورت نے اپنے خاندان کو بچانے کے لیے مقتول کو دانت مارے تھے؟ یا کیا خاندان نے مقتول کو کاٹا اور اُس کے ہاتھ سے چاقو گرایا تھا؟ کیا مقتول ایسے چال چلن کا تھا کہ وہ کسی غیر عورت کو کھڑیں لے گیا؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مقتول اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی عورت کو ساتھ لے گیا اور کھڑیں رقابت جاگ اُٹھی۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور عورت نے قاتل کا ساتھ دیا۔

میں دماغ میں واردات کی کوئی سی بھی خیالی فلم چلاتا تھا تو مقتول کی بیوی کی تصویر سامنے آجاتی تھی۔ اگر میری فالتو جس مجھے دھوکہ نہیں دے رہی تھی تو ملزم بیوی تھی۔ چوڑیاں اُسی کی تھیں۔ باقی کوالف بھی اسی سے ملتے اور اسی کی نشاندہی کرتے تھے۔

زیادہ وقت ضائع کرنا شہادت تباہ کرنے والی بات تھی۔ مجھے فوری طور پر اس حسین اور جوان لڑکی پر اور اُس کے غور و اور تو انا چچا زاد، نادر پر حملہ کرنا اور انہیں گھٹنوں بٹھانا تھا۔ نادر کو میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ اُس کی باتوں سے

ظاہر ہوتا تھا کہ خطر سے مول لینے کی ہمت رکھتا ہے اور جسم ایسا تھا کہ مقتول کی لاش اٹھا کر درخت پر چڑھ سکتا تھا۔ مقتول ڈبلا پتلا تھا۔

میں نے کہا تو میری ایک مخبر عورت آئی ہوئی تھی۔ یہ اُدھیڑ عمر عورت تھی۔ بدکار نہیں تھی۔ اُس کا خاوند مر گیا تھا۔ گھروں میں محنت مزدوری کر کے بچوں کو نہ صرف روٹی کھلاتی تھی بلکہ انہیں تعلیم بھی دلا رہی تھی کسی نے مجھے کہا تھا کہ شریف عورت ہے اور مدد کی حقدار۔ میں نے اس کی یہ مدد کی کہ مخبری کی ڈیوٹی دے دی اور خاص طور پر ہدایت دی کہ جھوٹ نہ بولے اور کسی کو دھوکہ نہ دے۔ گھروں میں تو وہ جاتی ہی تھی۔ اس کی زبان میٹھی تھی۔ اس نے پہلے پہل مجھے دو رپوٹیں دیں جو بالکل صحیح تھیں۔ میں اُسے خاصی اُجرت دلا دیتا تھا۔ اُس نے مجھے مقتول کی بیوی اور نادر کے تعلقات کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو مقتول کے والدین بتا چکے تھے۔ اس لڑکی اور نادر کے شادی سے پہلے کے تعلقات تھے جو ابھی تک قائم تھے۔ یہ مخبر یہ اطلاع بھی لائی کہ مقتول اور اس کی بیوی میں ان بن تھی۔ طلاق کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن لڑکی طلاق نہیں لینا چاہتی تھی۔

مقتول کے متعلق اُس نے بتایا کہ ہر کوئی اُس کی تعریف کرتا ہے۔ وہ نیک اور ملنسار تھا۔ زیادہ تر رُجھان مذہب کی طرف تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ داڑھی منڈھوادو، مجھے بہت بُری لگتی ہے۔ مقتول کی بیوی کی سہیلیوں سے یہ مخبر عورت یہ سن کر آئی کہ وہ ان کے پاس بیٹھ کر خاوند کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ بلکہ وہ اس قدر منہ پھٹت ہے کہ اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی تھی ”شادی کسی سے، یاری کسی سے“

## رات کے کپڑے اور تصویر

میں ان دونوں کو کسی جواز کے بغیر حراست میں نہیں لے سکتا تھا۔ یہ نظر محسوس ہونے لگا کہ دونوں کہیں بھاگ نہ جائیں۔ میں نے اسے۔ ایس۔ آئی عثمان سے کہہ کر ان کے گرد جاسوسوں کا حصار کھڑا کر دیا۔ عثمان نے گھروں کے مولڈ بنانے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے پیڈ کانشیل اور دو کانشیلوں کو ساتھ لیا اور مقتول کے گھر جا دھکا۔ وہاں تالہ لگا ہوا تھا کیونکہ گھر کا آدمی مر چکا تھا۔ لاش لواحقین کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مقتول کی بیوی مسرال میں تھی۔ میں نے اُس سے بلوا لیا۔ تالا کھلو اگر اُسے اندر لے گیا۔ اُس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ میں نے سب سے پہلے اُس کے دانت دیکھے اور یقین ہو گیا کہ مقتول کے بازو پر اسی کے دانتوں کے نشان ہیں۔ اُس کے دائیں طرف کے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔

آج کل سونے کے دانتوں کا فیشن نہیں ہے۔ پاکستان بننے سے دوچار سال پہلے تک بعض مرد اور عورتیں سامنے کے ایک دانت پر خالص سونے کا خول چڑھا لیا کرتی تھیں۔ بعض شوقین مزان عورتیں سامنے کے دو دانتوں میں دیا سلائی جتنے چڑھے سوراخ کرا کے ان سوراخوں میں سونے کے کیل ڈبوا لیا کرتی تھیں۔ امیر لوگ دانت ٹوٹ جائے تو اس کی جگہ خالص سونے کا دانت لگوا لیا کرتے تھے۔ فیشن کے کچھ شیدائی ایسے بھی تھے جو سامنے کا ایک

اچھا بھلا دانت نکلوا کر اس کی جگہ سونے کا دانت لگوا لیا کرتے تھے۔ سونے کا دانت یا سونے کا خول دانت کی طرح نیچے سے اتنا تیز نہیں ہوتا تھا کہ قدرتی دانتوں کی طرح کاٹ سکتا۔ خول تو نیچے سے کچھ موٹا ہی ہوتا تھا۔ ایسے دانت کھانے کے نہیں بلکہ دکھانے کے ہوتے تھے۔

مقتول کی بیوی بھی انہی شوقینوں میں سے تھی۔ اُس کے اُس دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا جس نے مقتول کے بازو کے زخم میں خلا پیدا کر دیا تھا۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس نے مچڑیاں وہی پہن رکھی تھیں جن کے ٹکڑے میرے پاس محفوظ تھے۔ ان کا ایک ٹکڑا مقتول کی مٹھی سے برآمد ہوا تھا۔

میں اُسے اندر کمرے میں لے گیا اور اُسے کہا کہ اُس کے پاس جوتیوں کے جتنے جوڑے ہیں وہ میرے سامنے رکھ دے۔ اتنے میں اُس کا ماپ، ماں اور دیگر رشتہ دار اندر آ گئے میں نے سب کو باہر نکال دیا۔ ان کی گھبرائٹ قدرتی امر تھا۔ لڑکی بھی ڈری ہوئی تھی۔ اب میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی کوئی بات نہیں کی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جوتیوں کے چار جوڑے آگے رکھ دیئے۔ میں نے یہ جوڑے کانٹیل کے حوالے کر دیئے۔

”رات کو جو تم نے کپڑے پہنے تھے وہ دکھاؤ۔“  
 اُس نے پہنے ہوئے کپڑے دکھا کر کہا۔ ”میری پہنے تھے۔“  
 میں نے ان کپڑوں کو غور سے دیکھا۔ کہیں بھی مٹی کا یا گھاس کا یا خون کا نشان نہیں تھا۔ میں نے اُس کے گھر کی تلاش لیٹی شروع کر دی۔ ہر ایک

ٹرنک اور سوٹ کیس کھول کر تمام چیزیں باہر نکالیں۔ ایک سوٹ کیس متعل تھا۔ اس کا تالا کھلوا کر ہر چیز باہر نکالی۔ اس میں ریشمی کپڑے اور زیورات تھے۔ سب سے نیچے اخبار کا کاغذ بچھا ہوا تھا۔ یہ ہٹا کر دیکھا تو اس کے نیچے سے ایک ریشمی رومال برآمد ہوا جو عطر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس میں کاغذات پلٹے ہوئے تھے۔ رومال کی تھیں کھولیں تو تین نہایت خوبصورت عید کارڈ نکلے جو نادر نے اس کے نام لکھے ہوئے تھے۔ نادر نے ”میری جان سے زیادہ عزیز“ لکھا تھا۔ ایک دوسرے عید کارڈ میں سے پوسٹ کارڈ سائز کا ایک فوٹو نکلا۔ یہ نادر اور اس لڑکی کا اکٹھا فوٹو تھا۔ دونوں کے بازو ایک دوسرے کے گلے میں تھے اور ان کے گال ملے ہوئے تھے۔

میں نے عید کارڈ اور فوٹو رومال میں لپیٹ کر رومال جیب میں ڈال لیا۔ لڑکی سے کہا کہ وہ کپڑے اور زیورات سوٹ کیس میں رکھ کر تالا لگا دے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کہا کہ یہ سوٹ کیس اپنے باپ کو دے دو۔ وہ ذرا جھجکی۔ اُس کی تو زبان ہی بند ہو گئی تھی۔

”یہیں نہ پڑا رہنے دوں؟“ اُس نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چوری کا ڈر ہے۔ میں نہیں

تھانے لے جا رہوں۔“  
 ”تھانے؟“ اُس نے ایسے کہا جیسے ہلکی سی چیخ ماری ہو، اور اُس نے لیک کر میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ اُس کے آنسو پھوٹ آئے۔ گڑگڑا کر کہنے لگی۔ ”آپ کو اپنے اللہ کا واسطہ ہے، مجھے تھانے نہ لے جائیں۔ آپ

مجھے کیوں تھانے لے جائیں گے؟

”میں مجبور ہوں“ میں نے جواب دیا۔ ”میری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ تمہارے خاوند نے خودکشی کی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔“

”جی ہاں“ اُس نے کہا۔ ”ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ اُس نے خودکشی کی ہے۔ اُسے کسی نے قتل تو نہیں کیا۔ اگر کسی نے اُسے قتل کیا ہے تو مجھے کیا معلوم؟“

”میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ رات کو جو تم نے کپڑے پہن رکھے تھے وہ دکھا دو۔“

اُس نے ہر ملزم کی طرح خدا، رسول اور قرآن کی قسمیں کھا کر کہا کہ اُس نے رات کو یہی کپڑے پہنے تھے جو اُس نے اب پہن رکھے ہیں۔ میں نے اس کے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر کچھ نہ ملا۔ آخر اُس کے باپ کو اندر بلایا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کا گھر سنبھالیں، میں اسے تفتیش کے لیے تھانے لے جا رہا ہوں۔ باپ بے چارہ تو غش کھانے لگا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا۔

”میں اسے گرفتار نہیں کر رہا۔ تفتیش کے لیے لے جا رہا ہوں۔“

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کے خاوند نے خودکشی کی ہے جس کی کاغذی کارروائی کے لیے اس کے بیان قلمبند کروں گا۔“

اس سے لڑکی بھی مطمئن ہو گئی۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور رخصت

لے گیا۔ میں تھانیدار تھا مگر انسان بھی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ اس لڑکی اور اس کے خاندان کو ذلیل و رسوا کر دیں گے۔ میرا اصول تو یہ تھا کہ میں مسلمان عورت کو تھانے سے بچایا کرتا تھا اور پوچھ گچھ رات کے وقت دردی اُتار کر اُس کے گھر جا کر کیا کرتا تھا لیکن اس لڑکی کے ساتھ میں کوئی رعایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نیک اور زاہد خاوند کو اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اس بے رحمی سے مروا دیا تھا۔

پولیس انکسپٹر عموماً یوں کرتے ہیں کہ تمام مشتبہ افراد کو ایک ہی بار تھانے میں بلا کر بٹھا دیتے ہیں۔ میرا طریقہ کار مختلف تھا۔ میں بعض مشتبہ افراد کو دانستہ نظر انداز کر کے اُن کے پیچھے اپنے جاسوس اور مخبر چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے ایک دو ساتھیوں کو کپڑا لیتا اور میرے جاسوس اُس کا رد عمل اور سرگرمیاں دیکھتے رہتے تھے جسے میں آزاد رکھتا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ مجھے نادر کے گھر کی تلاشی لے کر اُسے بھی تھانے بٹھالینا چاہیے تھا لیکن میں نے بظاہر اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ اُس پر توجہ مرکوز رکھنے کا کام دو جاسوسوں کے سپرد تھا۔

میں نے لڑکی سے کہا:

”مجھے دانستوں سے کاٹو“

لڑکی کو تھانے لے جا کر میں تفتیش کے کمرے میں لے گیا اور دروازہ

اندر سے بند کر دیا۔ اندر ایک چار پائی رکھی تھی اور دو کرسیاں۔ اُسے چار پائی پر بیٹھا کر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ہیر پھیر کرنے کی بجائے اُس پر سیدھا حملہ کیا۔

”تمہارے خاندان نے خودکشی نہیں کی“۔ میں نے کہا۔ ”اُسے قتل کیا گیا ہے“  
 ”قتل کیا گیا ہے؟“۔ اُس نے ہلکے سے کہا۔ ”کس نے؟“  
 ”تم نے اور نادرنے“

”اللہ... اللہ کی قسم...“۔ اُس کی زبان ہلکلا گئی۔  
 ”نہ قسمیں کھاؤ“۔ میں نے کہا۔ ”خدا کو ناراض نہ کرو۔ اُس کی ذاتِ باری سے گناہوں کی بخشش مانگو۔ ہو سکتا ہے ذاتِ باری میرے دل میں رحم ڈال دے اور میں تمہیں منہ سے صاف بچا لوں۔ اگر ساری بات خود بتا دو گی تو فائدہ سے میں رہو گی۔ اگر بات میرے منہ سے کھلو اور گی تو اس کچی عمر میں جیل جاؤ گی اور اُس وقت نکلو گی جب تمہارے بال سفید ہو چکے ہوں گے۔ تمہاری یہ خوبصورتی جو تمہارے خاندان کے قتل کا باعث بنی ہے جیل خانے میں داخل ہوتے ہی گندگی میں بدل جائے گی۔“

وہ رونے لگی۔ تھر تھر کا پینے لگی۔ مجھے ایک تویہ دیکھنا تھا کہ مقتول کے بازو پر اسی کے دانتوں کے زخم تھے اور دوسرے یہ کہ مقتول کا چاقو اس لڑکی کو لگا تھا یا نادر کو۔ میں نے اپنا دایاں بازو لڑکی کے آگے کر کے اُس جگہ انگلی رکھی جہاں مقتول کے بازو میں دانت اترے تھے۔ لڑکی سے کہا کہ یہاں مجھے دانتوں سے کاٹو۔ وہ سمجھی میں مذاق کے موڈ میں آ گیا ہوں۔ اُس نے

عجیب سی مسکراہٹ سے میرے بازو پر ہونٹ رکھ دیئے اور بازو چوم کر کہا۔ ”کاٹوں کیوں؟ آپ مجھے کتیا سمجھتے ہیں؟“  
 ”میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ یہاں کاٹو۔“

اُس نے حیران سا ہو کر میرے بازو کا پٹھا منہ میں لے لیا لیکن اوپر کے صرف تین دانت گوشت پر رکھے۔ میں نے اُس کا منہ پورا کھول کر بازو کا پٹھا اس طرح اُس کے منہ میں فٹ کر دیا کہ اُس کے اوپر اور نیچے کے سات سات دانت گوشت پر آ گئے۔

”زور سے کاٹو“۔ میں نے کہا۔

اُس نے تھوڑا سا زور لگایا۔

میں نے حکمانہ گرج سے کہا۔ ”پورے زور سے کاٹو۔“

اُس نے دانت اور دبائے۔

”اور زور سے“۔ میں نے کہا۔

اُس نے اب کے اتنی زور سے دانت دبائے کہ درد سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

میرے کئے بغیر اُس نے منہ میرے بازو سے ہٹا لیا۔ میں نے دیکھا کہ تمام دانت کھال میں اتر گئے تھے۔ خون نہیں نکلا تھا۔ سونے کے نول والے دانت کا نشان معمولی تھا۔ میں نے جیب سے وہ باریک کاغذ نکالا جس پر مقتول کے بازو کے زخم کا سیکیج بنایا تھا۔ یہ سیکیج اپنے بازو پر دانتوں کے نشاؤں پر رکھا۔ بال برابر فرق تھا۔ میں نے اسی کاغذ کی خالی جگہ نشاؤں

پرناچ رہی ہے۔ میں آج بھی خدائے ذوالجلال کا شکر سجدہ ریز ہو کر ادا کرتا ہوں کہ اُس کی ذاتِ اقدس نے مجھ پر شیطان کا غلبہ کرنے کی بجائے میرے اندر جتنے کی انکھیں بھڑکا دی۔ میں آخر انسان تھا اور مرد تھا۔ اگر میں ایک دو سیکنڈ سوچ میں پڑ جاتا تو شیطان مجھے دبوچ لیتا۔ تھانیداروں کا دین اور ایمان ہر وقت باریک سی تار پر چلتا رہتا ہے۔ تھانیداروں کو اکثر دولت اور عورت اس تار سے لٹھکا کر اونڈھے منہ گراتی ہیں۔ قاتل اور ڈاکو بخشے جاتے ہیں، قانون کی دھمیاں اڑ جاتی ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ تفتیش کتنی ہی پیچیدہ اور دشوار کیوں نہ ہو، تھانیدار بارانا چاہے تو نہیں ہارتا۔ اُس کی سب سے بڑی مشکل دولت اور عورت ہوتی ہے۔

معلوم نہیں وہ کونسی قوت تھی جو میرے سینے میں بم کی طرح پھٹی اور مجھ سے گرج کی طرح کھلوا یا۔ ”کھڑی ہو جاؤ۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اُس کے گرد گھوم کر اُسے بہر طرف سے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔ ”فوراً کپڑے پہن لو۔“ اُس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔

اُس نے حیرت اور خوف سے پوچھا۔ ”کیوں؟“ — پھر آہستہ سے بولی۔ ”میں نے انکار تو نہیں کیا۔“

میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ میں شاید دو حصوں میں کٹنے لگا تھا میں نے اُس کی طرف پٹیجھ کر لی اور کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔ جلدی کرو۔“ میرے ہونٹ اپنے آپ پل رہے تھے۔ میں نے ذرا دیر بعد محسوس کیا کہ میری

پر رکھی۔ کاغذ اتنا باریک تھا کہ اس میں سے دوسری طرف بھی نظر آ جاتا ہے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے قلم سے نشانوں پر لکیریں ڈالیں۔ یہ کام نہایت باریک تھا۔ اس سکیچ کو دوسرے لکچ پر رکھ کر دیکھا۔ یا تو میں سکیچ صحتی بنا سکتا تھا یا واقعی دونوں میں فرق تھا۔ مجھے ایک بال جتنا فرق نظر آیا۔ البتہ خلا وہیں تھا۔ میں نے لڑکی کا منہ کھلو کر اس کے دانت دیکھے۔ اس کا سونے کے نخل والا دانت قدرتی دانتوں سے ذرا اونچا تھا۔

وہ اس طرح تیراگی سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے بے دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔ میں نے اب یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے جسم پر چاقو کا زخم ہے یا نہیں اُسے کہا۔ ”کپڑے اتار دو۔“

کمرہ بند تھا۔ ہم دونوں کے سوا اندر کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے بلا جھجک شلوار اتار کر چارپائی پر پھینک دی اور عجیب سی مسکراہٹ سے مجھے دیکھنے لگی۔ مجھ پر اُس وقت کوئی اور ہی جنون طاری تھا۔

”فیمینس ہی آتار دو۔“ میں نے کہا۔

اُس نے فیمینس بھی اتار دی اور دوستانہ سی بے حیائی سے بولی۔

”پہلے وعدہ کریں کہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ اور وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔

مجھے یوں دھک لگا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار میرے جسم کے ساتھ لگا دیئے ہوں۔ میں کسی اور جنط میں گم تھا اور وہ کچھ اور سمجھ بیٹھی تھی۔ اُس نے مجھے پولیس انسپکٹر سے ہوں کار مرد بنا دیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی خوبصورت اور ایسی جوان لڑکی میرے قابو میں ہے جو میرے اتنا



زبان آیتہ کریمہ کا ورد کر رہی تھی اور میرے دل پر ایسا خوف طاری ہونے لگا تھا جو اس سے پہلے کبھی طاری نہیں ہوا تھا۔  
خدا نے مجھے سچا لیا اور اُس کی آواز سنائی دی۔ ”میں نے کپڑے پہن لیے ہیں۔“

”چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کرے میں ہلستا رہا۔ بہت مشکل سے اپنے آپ کو پولیس انکپٹر بنایا۔ اُس کی اس حرکت نے مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ لڑکی خاصی بدکار ہے، ورنہ وہ کپڑے اتارتے جھبکتی اور شرماتی اور یوں بے حیائی سے مجھے گناہ کی دعوت نہ دیتی۔  
”تمہارے خاوند کا چاقو کسے لگا تھا؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔  
”نادر کو؟“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اُس نے حیرانگی سے کہا۔ ”مجھے آپ کی کوئی بات سمجھ نہیں آرہی۔“

”تونسو“ میں نے کہا۔ ”میں بات الف سے شروع کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ بتا دوں کہ بات جیل خانے میں ختم ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ خاوند تمہیں طلاق کیوں دینا چاہتا تھا؟“ یہ کہہ کر میں نے وہ فوٹو اُس کے سامنے کر دیا جو اُس نے نادر کے منہ کے ساتھ منہ لگا کر اُتر دیا تھا۔ اُس کا جواب سُننے بغیر میں نے اُس سے پوچھا۔ ”یہ تصویر کب اُتروائی تھی؟“

”شادی سے پہلے۔“

”شادی کو نسی تاریخ کو ہوئی تھی؟“

اُس نے تاریخ، مہینہ اور سال بتایا۔ میں نے فوٹو اٹھا کر کے اُسے دکھایا۔ وہاں شادی کے چھ ماہ اور سترہ دن بعد کی تاریخ لکھی تھی۔  
”یہ تاریخ پڑھو۔ پڑھ سکتی ہو؟“

”ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُردو پڑھ سکتی ہوں۔“

”جھوٹ کیوں بولا؟“ میں نے کہا۔ ”اُس سے پہلے بھی تم ایک جھوٹ بول چکی ہو۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ شام کو تمہارا خاوند کھانا کھا کر باہر نکلا تھا مگر اُس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اُس کا پیٹ سالی تھا۔ تم گھر نہیں تھیں۔ تم نادر کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھیں۔ تمہارا خاوند گھر آیا تو کھانا کھائے بغیر تمہارے پیچھے چلا گیا۔“

”قرآن لے آؤ۔“ اُس نے کہا۔ ”میں اُس کے ساتھ باہر کبھی نہیں گئی۔“  
”کیونکہ تمہارے خاوند کی غیرحاضری میں وہ تمہارے گھر آ جاتا ہے۔“  
میں نے کہا۔ ”یہاں اگر جھوٹ بولو گی تو حالات میں بند کر دوں گا۔ نادر کے ساتھ تمہارے جو تعلقات ہیں وہ اپنی زبان سے بتا دو۔ میرے پاس گواہ موجود ہیں۔ خود بتاؤ گی تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری مدد کروں گا۔“  
”پھر آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟“ اُس کے آنسو بہنے لگے۔

”پہلے یہ دیکھو کہ تم کتنا سچ اور کتنا جھوٹ بولتی ہو۔“ میں نے کہا۔  
”میں اپنے وعدے کا پکا رہنوں گا، تم اپنے وعدے کی پکی رہنا، اور یہ نہ سمجھو لٹنا کہ تم قتل کے الزام میں پولیس کے پاس ہو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ اپنے

آپ کو جیل خانے بھیجا دیا عزت سے آزاد ہو جاؤ۔“

اُس نے سر جھکا لیا۔ سر اٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پہلے تو اُس کی زبان ہلکائی پھر میری حوصلہ افزائی سے وہ کھل کر بولنے لگی۔ کہنے لگی۔  
 نادر کی میں بہت کیا کرتی تھی کہ اب مجھے آزاد کر دو اور اپنے خاندان کے ساتھ دل لگانے دو مگر وہ کہتا تھا کہ تم اُس کی نہیں میری بیوی ہو۔ میں نے تمہاری خاطر شادی نہیں کی۔ ساری عمر تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ یہ کہہ کر وہ بسکیاں لینے لگی۔ بہت ہی روئی اور کہنے لگی۔ ”میری حالت کو آپ نہیں جان سکتے۔ دن کو میں نادر کی بیوی ہوتی تھی اور رات کو خاوند کی، مگر یہ بھید کھل گیا۔ شادی سے پہلے ہماری محبت موتیوں کی طرح صاف رہی۔ ہم نے شادی کے وعدے کیے تھے۔ نادر امیر خاندان کا لڑکا تھا۔ مجھے بڑے قیمتی تھے اور پیسے دیتا تھا۔ مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے کہ میں نے اُس سے کبھی کوئی چیز نہیں لی تھی۔ ہم لوگ اتنے غریب تو نہیں لیکن نادر کے گھر کے مقابلے میں ہم بہت غریب ہیں۔ میں شادی سے پہلے اُن کے گھر جاتی تھی تو نادر کی ماں مجھ سے گھر کے کام کراتی تھی اور پھر کتنی تھی کہ روٹی نہیں کھائی تو یہاں سے لے جاؤ، ماں کو بھی دینا میرا مطلب یہ ہے کہ اُس گھر میں میری حالت نوکرانیوں والی تھی۔ صرف نادر تھا جو مجھے کہا کرتا تھا کہ تم میرے دل کی رانی ہو۔ ہم اکیلے بھی ملے تو ہم نے کوئی گندی حرکت نہیں کی۔۔۔۔

## مجھے بدکاری کے طعنے ملے

”نادر نے بہت کوشش کی کہ اُس کے والدین میرا رشتہ مانگ لیں مگر وہ غریبوں کے ساتھ رشتہ نہیں جوڑنا چاہتے تھے۔ نادر نے بہت ضد کی اور اُس نے گھر والوں کو طرح طرح کی دھمکیاں بھی دیں۔ اُس کی کسی نے نہ سنی۔ اس کی ماں اور بہنوں نے مجھے اُن کے گھر جانے سے منع کر دیا۔ نادر میرے گھر آ جاتا تھا۔ اُس کے باپ کو پتہ چل گیا۔ اُس نے میرے باپ کی بے عزتی کر دی۔ نادر اکلوتا بیٹا ہے۔ بہت دلیر آدمی ہے کسی کی منٹا نہیں۔ اُسے میرے باپ نے مرثت کر کے کہا کہ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے ہماری برادری ایک ہی ہے۔ ایک ہی ذات ہے لیکن غریب کی تو کوئی ذات نہیں ہوتی۔ ہم چوری چھپے ملتے رہے۔ نادر نے کہیں بھاگ چلنے کا مشورہ دیا جو میں نے اپنے باپ کی عزت کی خاطر نہیں مانا۔ نادر کے باپ نے اپنے ہاتھوں میرا رشتہ نوازش (مقتول) سے کرا دیا۔ وہ مجھے نادر کی نظروں سے اوجھل کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل کہیں اور تھا اس لیے دل نے نوازش کو قبول نہ کیا۔ اگر وہ نادر کی طرح سندرست اور توانا اور سنس مکھ ہوتا تو میں دل پر پتھر رکھ کر اُسے قبول کر لیتی، مگر وہ نادر کے بالکل الٹ تھا۔ چُپ چاپ اور بہت ہی سنجیدہ رہتا تھا۔ اُس کی داڑھی تو مجھے بہت ہی بُری لگتی تھی۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ بُرقعہ اوڑھ کر باہر نکلا کرو اور پانچوں نمازیں پڑھا کرو لیکن میں اُسے کہتی تھی کہ میں نے کبھی بُرقعہ نہیں اوڑھا اور اُسے یہ بھی کہا کہ داڑھی صاف کرا دو۔ جسمانی لحاظ سے بھی وہ

مريض تھا۔ کبھی کہتا کہ میری ٹانگیں دکھتی رہتی ہیں۔ کبھی کہتا کہ سر میں چکر آتے ہیں۔ گم غم رہتا تھا جیسے زندگی سے بیزار ہو چکیوں کی دو اٹیاں کھا تارہتا تھا۔ ڈبلا پستلا تھا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی کہ جسے خدا کے نام پر قبول کیا ہے اسے دل سے بھی قبول کروں۔۔۔۔

” لیکن اُس نے، اُس کی ماں نے اور اُس کی بہنوں نے میرے پاؤں جمنے نہ دیئے۔ وہ اشاروں اشاروں میں مجھ پر اس شک کا اظہار کرتی رہتیں کہ میں جب میکے جاتی ہوں تو نادر کے ساتھ گلچرے اڑاتی ہوں۔ شادی کے چھ مہینے بھی نہیں گورے تھے کہ خاوند نے مجھے کہا، اگر تمہارے دل سے نادر بھی نکلا نہیں تو مجھ سے طلاق لے لو۔ میں تم پر زبردستی نہیں کروں گا۔ میں جان گیا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں، میں اُس کے آگے بہت روئی اور اُسے کہا کہ وہ نادانی کی عمر تھی جب میں نے نادر کو پسند کیا تھا اور اُس نے مجھے دل میں بٹھالیا تھا۔ تمہارے پاس آئی تو میں کنواری تھی۔ اب بیوی بن گئی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بھچلی باتیں بھول جانے دیں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اس کی ماں اور بہنیں بھی مجھے شادی سے پہلے کی دوستی کے طعنے دیتی رہتی ہیں۔ میں نے بہت قسمیں کھائیں۔ خاوند پر تو اثر اچھا ہوا لیکن اُس نے اپنی ماں اور بہنوں کو طعنوں سے منع کیا تو انہوں نے اشاروں کی بجائے مجھے صاف لفظوں میں کہنا شروع کر دیا کہ میں اُن کے بیٹے کی نہیں نادر کی بیوی ہوں۔ مجھ میں خرابی یہ تھی کہ میری طبیعت شوقین تھی۔ مجھے ریشمی کپڑے اچھے لگتے تھے۔ بن سنور کر رہتی تھی۔ میں نے شادی سے دو سال پہلے باپ اور بھائی سے ضد کر کے اس

دانت پر سونے کا خول چڑھایا تھا، لیکن میں نے گھر کے کام کاج میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ میری دوسری عادت یہ بھی تھی کہ میں گھر کیلڑکیوں کی طرح گھٹی ہوئی اور چُپ چاپ نہیں رہتی تھی، ہنسنے کھیلنے اور ہر بات کھل کر کہنے کی عادی تھی۔ میرے مذاق کو اسی قسم کے ہوتے تھے۔ اس سے میرے سُسرال کی عورتیں مجھے بے حیا اور بدکار کہتی تھیں۔ خدا نے مجھے رنگ سُسرال اور نقش اچھے دیئے ہیں۔ یہ بھی میرے خلاف استعمال ہوتے تھے۔۔۔۔

” مجھ سے کوئی برتن ٹوٹ جائے یا کوئی غلطی ہو جائے تو سراسر مجھے بخشتی نہیں تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ دھرے رہتے تھے۔ ” تو تو بڑی حویلی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اُن کی بہو تو شادی سے پہلے ہی بن گئی تھی۔ تیرا دھیان اس گھر میں ہو تو برتن نہ ٹوٹیں۔“ میری قسموں پر اور میرے آنسوؤں پر ان عورتوں نے ذرہ بھر اعتبار نہ کیا۔ آخر ایک روز میں پھٹ پڑی۔ گھر میں ہمت لڑائی ہوئی۔ نوازش (خاوند) گھر آیا تو ماں اور بہنوں نے اُسے اپنی سنائی۔ میں نے رات کو تنہائی میں اپنی سنائی۔ وہ بُدھو آدمی تھا۔ سوائے پریشان ہونے کے کچھ بھی نہ کر سکا۔ پھر لوک جھونک کا یہ سلسلہ روز بروز کا معمول بن گیا۔ میں نے ان لوگوں کا کوئی لحاظ اور احترام نہیں کیا۔ خاوند کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سے الگ ہو جائے، میں ان کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں اتنی تنگ آ گئی تھی کہ ایک روز نادر سے کہا کہ مجھے اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کے لیے الگ مکان چاہیئے۔ اُن کا ایک مکان کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ اُس نے خالی کر دیا اور میں خاوند کے ساتھ وہاں چلی گئی۔ نادر ہم سے

کرایہ نہیں لیتا تھا۔ لوگوں کو ہم چار روپے کرایہ بتاتے تھے....

”سسرال نے ساری برادری میں یہ مشہور کر دیا کہ میں نادر سے آزادی سے ملنے کے لیے خاوند کو الگ لے گئی ہوں۔ میں پیچھ تو نہیں تھی۔ ان لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ جس گناہ سے میں بچ رہی تھی وہ گر گزروں۔ بدنام تو میں ہو ہی گئی تھی۔ خاوند کو میں اپنے اوپر جوہر کر کے قبول کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں سب کی نظروں میں بے وفا اور مجرم تھی۔ ایک روز خاوند کام پر گیا تو نادر میرے گھر آگیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ اُس نے مجھ سے شادی سے پہلے کی محبت مانگی....

”میں جلی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر کے کہا۔“  
 ”میرے سسرال اور خاوند نے ہمیں میرا خاوند بنا رکھا ہے۔ آؤ، آج سے تم ہی میرے خاوند ہو۔ یہی ایک گناہ تھا جو میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے شرم اتار دی اور اُس کی بیوی بن گئی۔ میں نے وہ کپڑے پہنے جو مجھے بہت پسند تھے۔ نادر کے ساتھ بازار گئی اور اُس کے ساتھ یہ تصویر اتروائی جو آپ کے پاس ہے۔ خاوند بے خبر نہیں تھا۔ نادر اُس کی موجودگی میں بھی آجاتا تھا۔ خاوند نے مجھے کئی بار نادر سے دوستی ترک کرنے کو کہا لیکن میں اُسے یہ کہتی تھی کہ داڑھی صاف کرادو، کھاؤ پھاؤ اور نادر کی طرح سندرست اور توانا بنو....

”وہ بے چارہ طبیعت کا بھی کمزور تھا اور جسم کا بھی۔ مجھے طلاق دینا چاہتا تھا لیکن اُس کے پاس حق مہر کی رقم نہیں تھی۔ طلاق سے اُسے ماں باپ بھی روکتے تھے۔“

”نادر نے تمہیں کبھی نہیں کہا تھا کہ اس سے طلاق لے لو اور کہیں بھاگ چلیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اُس نے شادی سے پہلے کہا تھا کہ بھاگ چلیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”شادی کے بعد جب وہ میرے گھر آنے لگا تو میں نے اُسے بتایا کہ نوازش مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔ نادر نے مجھے سختی سے کہا کہ طلاق نہ لینا کیونکہ طلاق کے بعد بھی تمہاری شادی میرے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جو گناہ کہہ نہیں کہیں ایسی جگہ بیاہ دیں گے جہاں ہمارا اتنی آزادی سے ملنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بدنامی کی وجہ سے تمہیں کوئی بھی قبول نہ کرے۔ پھر تم اپنے گھر میں قید ہو جاؤ گی....

”میں نے خاوند سے کہہ دیا کہ تم طلاق دینا چاہتے ہو تو دو سے دو، میں اس گھر سے نہیں نکلوں گی۔ اگر نکلوں گی تو پانچ ہزار روپیہ نقد لے کر نکلوں گی اور بیس روپیہ ماہوار خرچ ٹھونک، بجا کر لوں گی۔ اس کے بعد میری اور اُس کی بول چال بند ہو گئی۔ میں اُس کے لیے کھانا پکا دیتی تھی۔ گھر کے سارے کام کرتی تھی مگر ہم میاں بیوی نہیں رہے تھے۔ میں اب نادر کی بیوی تھی۔ خاوند بالکل ہی چُپ چاپ اور گم غم رہنے لگا۔ میں نے اُس سے کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا نہ کبھی اُس سے لڑی۔ اُس نے ایک بار میرے بڑے بھائی سے شکایت کی۔ بھائی نے میرے گھر آکر مجھے بہت مارا اور کہا کہ نوازش کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی، مگر یہ جھوٹی اور دکھاوے کی معافی تھی۔“  
 ”نادر نے کبھی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ نوازش کو کسی طریقے سے

ذہن پر زور دیا تو یہ شک اُبھر کہ اس لڑکی میں بے حیائی کی کوئی کمی نہیں ہو سکتا ہے کسی اور کے ساتھ بھی اس کی آشنائی ہو اور اُس آشنائے سے کہا ہو کہ مقتول کو راستے سے ہٹا کر شادی کر لیں گے۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔ ”نادر ہے تو میں کسی کے مُنہ پر تھوکتی بھی نہیں“

اسے میں آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے بہت منت سماجت کی کہ اُسے گھر جانے دوں لیکن میں نے اُسے ایک صاف سُتھرے کرے میں جہاٹھایا اُس کے لیے کھانا منگوا دیا اور تسلی دی کہ وہ اپنے آپ کو حراست میں نہ سمجھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ واقعی خاوند کے قتل کی مجرم تھی مگر مجھے اس ثبوت کی بھی ضرورت تھی کہ وہ بے گناہ ہے۔ نادر کا بیان ضروری تھا۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ میں نے دو کانسٹیبل ساتھ لیے اور نادر کے گھر چلا گیا۔ وہ مقتول کے جنازے سے واپس آ رہا تھا۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور اُس کے گھر کی تلاشی لی۔ یہ امیروں اور عزت داروں کا بہت بڑا گھر تھا۔ اس گھر میں پولیس کا چھاپہ اور تلاشی بہت بڑا واقعہ تھا۔ تماشائیوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ نادر کے باپ کی حالت بہت بُری تھی۔ وہ مجھے خانہ تلاشی سے روکنے لگا۔ میں نے نادر کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے کہا۔ ”اسے کہو کہ رات اس نے جو کپڑے پہنے تھے وہ میرے حوالے کر دے۔ میں گھر کی تلاشی نہیں لوں گا“

انہوں نے مجھے صاف سُتھرے کپڑے دکھا دیئے۔ میں نے سارے

راستے سے ہٹا دیا جائے؟“ — میں نے پوچھا۔  
 ”کبھی نہیں“ — اُس نے جواب دیا۔ ”وہ تو کہا کرتا تھا کہ دُعا کرو تو ازل زندہ رہے ورنہ ہماری ملاقاتیں ختم ہو جائیں گی۔ ایسا بُدھو اور بُزدل خاوند تمہیں کبھی نہیں ملے گا“

”تم یہ بتا سکتی ہو کہ تمہارے خاوند کے تعلقات کسی عورت کے ساتھ تھے؟“ — میں نے پوچھا۔ ”ہو سکتا ہے امتقا، ہی کہیں دوستی لگا بھی ہو۔“ — میں نہیں مان سکتی۔ ”اُس نے جواب دیا۔ ”وہ تو بچکا مومن تھا، اور کوئی عورت اُسے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کسی عورت کے مطلب کا آدمی تھا ہی نہیں“

میں نے لڑکی پر بہت جرح کی۔ مجھے شک تھا کہ وہ نادر کو بچانے کے لیے کہہ رہی ہے کہ وہ کہتا تھا کہ طلاق نہ لینا اور اُسے راستے سے نہ ہٹانا، اور اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو قتل کی وجہ کیا تھی؟ اور قاتل کون تھا؟ اور چوڑیوں والی عورت کون تھی؟ میں نے مقتول کی بیوی کا خول والا دانت ایک بار پھر دیکھا اور مقتول کے بازو کے زخم کو ذہن میں لا کر سوچنے لگا کہ باقی دانت اتنے گہرے اتر گئے تھے کہ خول کو بھی ذرا سا کھال میں اترنا چاہیئے تھا۔ اس لڑکی نے مجھے اپنی جو جڑتیاں دکھائی تھیں اُن کے سائز موقعہ دار دانت کے کھڑوں سے ملتے تھے، باقی کوئی مشابہت نہیں تھی۔ تو کیا میں غلط لڑکی سے تفتیش کر رہا تھا؟ صرف اتنی سی بات تھی کہ چوڑیاں وہی تھیں اور اب اُس نے یہ بھی اعتراف کر لیا تھا کہ نادر کے ساتھ اُس کے ناجائز مراسم تھے۔

گھر کی تلاشی لی۔ یہ بھی معلوم کیا کہ کپڑے دھو بی کے پاس جاتے ہیں یا گھر دھلتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کپڑے گھر دھلتے ہیں اور گھر بھی استری ہوتے ہیں۔ کوئی کام کی چیز نہ ملی سوائے رشوت کی پیش کش کے۔ میں نے نادر کے باپ کو الگ لے جا کر پوچھا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ نادر کے تعلقات کیسے تھے۔

”میرا بیٹا تو مٹی کا باوا ہے جی۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”اسے کوئی حد نہ لگائے لگ جاتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ لڑکی اسے اُتو بنائے رکھتی ہے۔ ویسے کوئی گڑبڑ والی بات نہیں۔ نوازش کے ساتھ نادر کی گہری دوستی تھی۔“

بوڑھے نے اپنے بیٹے کو مٹی کا باوا اور مجھے اُتو کا پھٹا بنانے کی بہت کوشش کی۔

میں نے اُسے اتنا ہی کہا ”آپ اُس تھانیدار کے ساتھ بات کر رہے ہیں جو مٹی کے باوا کو تھکانے لے جا کر اُن میں جان ڈال دیا کرتا ہے اور وہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔“

میں نادر کو تھکانے لے گیا اور اُسی کمرے میں اُسی چار پائی پر بیٹھا دیا جہاں اُس کی ”جان“ سے زیادہ عزیز، ”کو بیٹھا کر ساری کہانی سنی تھی۔ باپ کی طرح بیٹا بھی طرح دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ مقتول کی بیوی کو میں تھکانے لے آیا ہوں۔

”وہ کہاں ہے؟“ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پوچھا کون تو اُس نے کہا۔ ”نوازش کی بیوی“  
”نوازش کی بیوی یا تمہاری؟“ میں نے مسکاکر کہا۔

”آپ داروغہ ہیں۔“ اُس نے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے تھکانے میں ہوں۔ آپ کے منہ میں جو آئے کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ آج ہی بیوہ ہوئی ہے اور اس کی بھی عزت ہے۔“

”گھبراؤ نہیں دوست۔“ میں نے کہا۔ ”اُسے میں نے عزت سے الگ کرے میں بیٹھا رکھا ہے۔ ابھی تو اُس کے ساتھ بات بھی نہیں کی۔ پہلے تمہارے ساتھ دو چار باتیں کر کے اُسے تمہارے سامنے بیٹھاؤں گا۔ اگر تم نے مجھے مطمئن کر دیا تو دونوں کو باعزت طریقے سے گھر بھیج دوں گا۔۔۔۔۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے یہ رپورٹ کس طرح اعتماد کے ساتھ دی تھی کہ نوازش نے خودکشی کی ہے؟“

”اُس کی لاش درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”گلے میں رتہ تھا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اُسے قتل کر کے لاش درخت کے ساتھ لٹکا دی ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”لیکن میں پولیس انسپکٹر نہیں ہوں۔ اگر لاش زمین پر بیوی، گلے میں رتہ نہ ہوتا تو میں کہتا کہ نوازش قتل ہو گیا ہے خواہ اُس نے خودکشی ہی کی ہوتی۔“

”نوازش کو قتل کر کے درخت کے ساتھ لٹکا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ وہ نیک اور پارسا آدمی تھا۔ اُسے راستے سے ہٹایا گیا ہے۔ اس مجرم میں اُس کی بیوی بھی شریک ہے کیونکہ وہ خاوند کو ناپسند کرتی تھی اور کسی اور کو چاہتی تھی۔

”اور کسے چاہتی تھی؟“

”نادر نام کے ایک جوان آدمی کو“۔ میں نے کہا۔ ”اور وہ نادر شاید

تم ہی ہو۔“

## محبت ہو تو ایسی ہو

”تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے نوازش کو قتل کیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ کا یہ شک محض وہم ہے۔“

”تو میری مدد کرو۔“ میں نے کہا۔ ”میرا یہ وہم دور کر دو اور میری راہنمائی کرو کہ نوازش کا قاتل کون ہے۔“

”میں نہیں ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں ساری رات گھر رہا ہوں۔ رات آٹھ بجے ہمارے گھر فیض آباد سے چھ مہمان اچانک آ گئے تھے۔ اُن میں چار عورتیں ہیں۔ اُن سے پوچھ لیں کہ میں آٹھ بجے گھر تھا۔ اُن کی خاطر تواضع اور کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا۔ رات ساڑھے دس گیارہ انہی کے ساتھ نج گئے۔ وہ میرے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے رشتہ دینا چاہتے ہیں اور میری بہن کا رشتہ لینا چاہتے ہیں۔ میں اپنے رشتے کی مخالفت کر رہا تھا۔“

مہمان عورتوں نے مجھے گھیرے رکھا اور رات کا ایک بج گیا۔

”اپنے رشتے کی مخالفت کیوں کرتے رہے؟“

”مجھے وہ لڑکی پسند نہیں۔“

”تم کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”بات صاف کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔“ میں نے کہا۔

صاف کہ دو کہ تم نوازش کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ بولو، ہاں یہ درست ہے۔“

وہ میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ شادی نہ کر کے مگر شادی کے

بغیر اُس کے خاوند بن گئے۔ بولو جواب دو۔ کو ہاں یا نہیں۔“

”میں اس لڑکی سے محبت ضرور کرتا ہوں۔“ اُس نے جھکتے ہوئے کہا۔

پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور

پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کو یہ شک ہے کہ نوازش کی بیوی نے اُسے

قتل کیا ہے اور اگر آپ اسے اس مجرم میں پکڑنا چاہتے ہیں تو اُسے چھوڑ

دیں۔ کاغذ قلم لیں اور جو بیان آپ کے دل میں آتا ہے خود ہی لکھیں۔ مجھے

قاتل لکھیں اور اس پر میرے دستخط کرالیں۔ اس لڑکی کو تھانے سے باہر نکال دیں۔

سارا الزام میرے سر پر رکھ دیں۔ پھانسی کا رتہ میرے گلے میں ڈال دیں۔

میں نے جس لڑکی کو اس دل کے اندر رکھا ہوا ہے اُس کی خاطر جان بھی

” اس کے ساتھ تمہارے تعلقات بہنوں بھائیوں والے تھے یا میاں بیوی والے؟“

” ان کے درمیان درمیان سمجھ لیں۔“

” جنہیں ناجائز کہا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

” آپ کو یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟“ اُس نے پوچھا، اور چونک کر

بولی۔ ”اوہ.... میں سمجھ گیا۔ آپ نے پیل کے نیچے بیٹھے نوازش کے باپ

اور اُس کی ماں کو بلایا تھا اور تین گھنٹے بیان لیتے رہے تھے۔ انہوں نے تنزیر

کے اور میرے خلاف بہت بکو اس کی ہو گی۔ تنزیر کو انہوں نے زندگی اور بازاری

کہہ کر گھر سے نکالا تھا۔“

” انہیں اس کے خلاف کیا دشمنی تھی؟“

” دشمنی تو کوئی نہیں تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وجہ یہ ہے کہ جن کی

اپنی بیٹیاں بدکار ہوتی ہیں وہ دوسروں کی بیٹیوں کو بھی بدکار سمجھتے ہیں۔ نوازش

کی بڑی بہن کی شادی نوازش کی شادی سے تین ماہ بعد ہوئی تھی۔ تین سال سے

اُس کا خاوندِ دق کا مریض ہے۔ اس عورت نے تنزیر کے بھائی کے ساتھ شرتہ

جوڑ رکھا ہے۔ ساری برادری جانتی ہے۔“

” یہ وہی بھائی تو نہیں جس نے ایک بار تنزیر کو اس کے خاوند کی شکایت

پر مار لپیٹا تھا؟“ میں نے پوچھا اور میں کچھ پریشان بھی ہوا کیونکہ یہ ابھی میرے

تفتیشی ڈھانچے کو لگاؤ کر باتوں باتوں میں مجھے کسی اور ہی طرف لے جا رہا تھا۔

میں نے ہی طریقہ اپنا لیا۔ اس طریقے کے تحت مُشبتہ کو کھل کر بولنے کا موقع دیا

دے سکتا ہوں۔ اُسے چھوڑ دیں لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ اگلے جہان

آپ کے گلے میں پتہ ڈال کر خدا کے سامنے کھڑا کروں گا اور کہوں گا کہ

یہ ہے وہ داروغہ جو بے گناہوں کو سُولی چڑھا دیتا تھا۔“

” تم پھانسی کا رستہ اپنے گلے میں کیوں ڈالتے ہو؟“ میں نے بڑے ہی

تجمل سے کہا۔ ”میں نے کہا ہے کہ میں اندھیرے میں ہوں، میرا ہاتھ پکڑو

اور مجھے دو باتیں بتاؤ۔ ایک یہ کہ تم قاتل نہیں ہو اور دوسری یہ کہ قاتل کون ہو

سکتا ہے.... سنو نادرا میں جانتا ہوں تم دل و جان سے تنزیر (مقتول کی بیوی)

پر فدا ہو۔ تم نے اس کے لیے یہ قربانی بھی کی ہے کہ شادی نہیں کی مگر یہ بھی ہو

سکتا ہے کہ تنزیر کا چاہنے والا کوئی اور بھی ہو اور اُس نے اُسے کہا ہو کہ

خاوند کو راستے سے ہٹاؤ اور میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا۔“

” سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اُس نے کہا۔ ”خاوند نے تنزیر کو پچاس

بار کہا تھا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں لیکن اُس نے طلاق نہیں لی تھی۔ نوازش

جتنا شریف تھا اتنی ہی شرافت سے وہ تنزیر کے راستے سے خود ہی ہٹ رہا

تھا مگر تنزیر نہیں مانتی تھی۔“

” کیونکہ تم نے اُسے کہا تھا کہ طلاق نہ لینا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نوازش

کے پردے میں ملاقاتوں کا سلسلہ آسانی سے جاری رکھ سکتے تھے۔“

” یہ بات نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے اُسے طلاق لینے

سے روکا ضرور تھا لیکن اس لیے روکا تھا کہ وہ بہت بدنام ہو جائے

گی اور ساری عمر گھر بیٹھی رہے گی۔ بدنام لڑکی کے ساتھ کون شادی کرتا ہے؟“



جاتا ہے۔ اگر وہ باتونی ہو تو اُسے پتہ ہی نہیں چلنا کہ اُس کے منہ سے وہ باتیں بھی نکلی جا رہی ہیں جو اگر تعانیدار اُس سے پوچھے تو وہ کبھی نہ بتائے۔

میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا۔ ”جی ہاں، یہ وہی بھائی ہے جس نے تنزیر کو بہت بُری طرح پٹیا تھا، لیکن نواز شس کے والدین نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اس پٹائی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نواز شس نے تنزیر کے خلاف شکایت کی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ تنزیر ایک روز سہرا ل گئی۔ نواز شس کی شادی شدہ بہن گھرائی ہوئی تھی۔ تنزیر کی ساس اور نواز شس کی بڑی بہن نے تنزیر کو بھروسہ ہی ملنے دیا کہ وہ نادر کو ختم بنانے کے لیے خاوند کو مال باپ سے الگ کر کے لے گئی ہے۔

تنزیر نے نواز شس کی بڑی بہن سے کہا۔ ”اگر نادر میرا ختم ہے تو تم نے میرے بھائی کو ختم بنا رکھا ہے۔ تمہارا اپنا خاوند تو سوکھے سے مر رہا ہے۔ میرے بھائی کی جوئے کی ساری آمدنی تیرے اندر جا رہی ہے۔“ اُدھر نواز شس کی بہن نے تنزیر کے بھائی کو یہ بات بتادی۔ اُدھر نواز شس نے اُسے کہا کہ اپنی بہن کو سمجھاؤ، وہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ بھائی صاحب کو غصہ دوسری بات کا تھا جو اُس نے شریف بن کر نواز شس کی شکایت کو سامنے رکھ کر نکالا۔ تنزیر کے ساتھ میرے تعلقات جیسے کیسے بھی تھے، بہت پُرانے تھے۔ اس سے پہلے اُسے کیوں غصہ نہ آیا؟

میرا سر جھکانے لگا۔ اس لیے نہیں کہ تفتیش پیچیدہ ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ ہندوؤں کی اکثریت کے علاقے میں یہ چند ایک مسلمان گھرانے تھے جن کی بہو، بیٹیاں اور بیٹے بدکاری اور فریب کاری میں پڑے ہوئے تھے اور ہندو

تماشا دکھ رہے تھے۔ میں نے نادر پر جرح شروع کر دی۔ اُس نے جھوٹے جواب بھی دیئے اور سچے بھی۔ تنزیر کے ساتھ اپنی نوٹ دیکھ کر اُس نے بتایا کہ شادی کے بعد کی ہے۔ بہر حال اُس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ اُس کے مراسم تھے۔

اُس کے تمام مجرموں کے تلوے دیکھے۔ گھروں میں فرق تھا۔ اُس کے کپڑے اُتروا کر دیکھے۔ اُس کے جسم پر خراش تک نہیں تھی۔ میں نے رات گزارہ بچے تک اُس پر گھاگھا کر اور پھر پھر کر۔ الم کیے۔ اپنا پورا تجربہ آزما ڈالا مگر اُس نے میرے شک کو ہلا ڈالا اور میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ نواز شس کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں۔

## خدا کا اشارہ ملا

میں نے اُسے اپنے دفتر میں جا بٹھایا۔ اُس کے لیے نہایت اچھا کھانا منگوایا۔ وہ تنزیر کے لیے بہت پریشان تھا۔ میں نے ہر پہلو پر غور کیا۔ آخر تنزیر کو بلا کر اُس کے پاس بٹھا دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ سونا چاہیں تو بستر چارپائی کا بندوبست کر دیتا ہوں لیکن ابھی انہیں آزاد نہیں کروں گا۔ دراصل مجھے خود آرام کی ضرورت تھی۔ دماغ شل ہو گیا تھا۔ سارا دن بک بک کرتے گزر گیا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تو میری مدد کریں۔ دماغ پر زور دیں اور میں جب واپس آؤں تو مجھے مایوس نہ کریں۔

میں گھر چلا گیا۔ نہاد صوکر کھانا کھایا اور لیٹ گیا۔ فوراً آنکھ لگ گئی۔  
 کہتے ہیں بلی کو خواب میں بھی پھینچنے سے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تمہا نیدار خواب  
 میں بھی تفتیش ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خواب میں ایک درخت کے ساتھ  
 ایک لاش دیکھی۔ اس کے نیچے ایک آدمی کھڑا مجھے کہ رہا تھا۔ ”اسے میں  
 نے قتل کر کے اُپر لٹکا دیا ہے۔ تم لاش لے جاؤ، میں اپنا رستہ لے جاتا ہوں“  
 — میں نے اُس سے پوچھا۔ ”یکس کی لاش ہے؟“ — اُس نے جواب  
 دیا۔ ”یہ میری بہن کا خاوند تھا“ — میں لاش کو اتارنے کے لیے درخت پر  
 چڑھنے لگا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے طارج جلائی اور گھڑی  
 دیکھی۔ سحر کے تین بجنے والے تھے۔

کیا خدانے مجھے کوئی اشارہ دیا تھا؟ مقتول کی بیوی کے بھائی کو تو  
 میں تمہانے بلانا ہی چاہتا تھا۔ اب جبکہ نادر نے بتایا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ  
 مقتول کی بہن کے مراسم تھے تو اُسے تفتیش میں شامل کرنا اور زیادہ ضروری ہو گیا  
 تھا، مگر میں سوچنے لگا کہ خواب میں وہ مجھے کیوں نظر آیا ہے۔ میں وہی آدمی  
 نہیں تھا پھر بھی خواب میرے ذہن پر سوار ہو گیا۔ رستے کے متعلق تو میں نے  
 سوچا ہی نہیں تھا۔ مقتول کی لاش جس رستے سے بندھی تھی وہ بالکل نیا تھا  
 اور یہ وہ رستہ تھا جس سے کمز میں سے پانی نکالنے والا ڈول باندھا جاتا  
 ہے۔

وہ چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں صرف ایک بازار تھا۔ اس میں رستوں وغیرہ  
 کی صرف ایک دکان تھی۔ رستہ وہیں سے خرید لیا ہوگا۔ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں

تھا کہ رستہ کس نے خرید لیا تھا۔ ابھی تو تین بجے تھے۔ دکانیں کھلنے میں چار  
 پانچ گھنٹے باقی تھے۔ میں تمہانے میں گیا۔ برآمدے میں دو چار پائیاں بھی  
 تھیں۔ نادر اور تنویر سوئے ہوئے تھے۔ حالات کا سفری اُن کے قریب  
 رائل تھا مگر کھڑا تھا۔ میں نے دونوں کو جگایا اور دفتر میں لے گیا تفتیش  
 کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے۔ ملزموں پر  
 جوں جوں نیند کا غلبہ ہوتا ہے وہ بے قابو ہو کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

میں نے دونوں کو اکٹھا بٹھا کر وہی سوالات دہرانے شروع کر دیئے  
 جو میں اُن سے کئی کئی بار پوچھ چکا تھا۔ تنویر سے میں نے کہا کہ تم نے اپنے بھائی  
 کے متعلق یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہارے خاوند کی بہن کے ساتھ اس کی درپردہ دوستی  
 ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہ تھا؟

اُس نے جواب دینے کی بجائے نادر کی طرف دیکھا۔ نادر نے اُسے  
 کہا۔ ”انہیں میں نے بتایا تھا۔ تم بھی بتادو۔ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں“  
 ”ہاں جی۔ یہ ٹھیک ہے۔“ — لڑکی نے مجھے کہا۔

میں نے پھر پوچھا کہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟

”دراصل وجہ یہ ہے جی کہ میرا خاوند اس وجہ سے بھی پریشان رہتا  
 تھا کہ اس کی بہن اتنی زیادہ بدنام ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”یہ بھی تو اُس  
 کی خودکشی کی وجہ تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ آپ کو اپنے بھائی کے متعلق بتا دیا تو  
 آپ اُسے بھی پکڑ لیں گے، اور میں اس لیے بھی ڈرتی تھی کہ بھائی کو پتہ چل گیا  
 کہ میں نے اُس کے خلاف پولیس کو کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے جان سے مار دے

کا۔ وہ طبیعت کا بہت سخت ہے۔ اپنی بیوی کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر پیٹ ڈالتا ہے۔

”اُس کی بیوی کیسی ہے؟“

”جیسا میرا خاوند تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بالکل سیدھی سادی اور غریب طبع ہے۔ اگر اُس کی شادی میرے خاوند کے ساتھ ہو جاتی تو دونوں بہت خوش رہتے۔ بے چاری خاموشی سے مار کھا لیتی ہے۔“

”وہ کنوئیں والی بات بھی سناؤ۔“ نادر نے اُسے کہا۔

”ایک روز اُس کی بیوی نے اُسے کہہ دیا کہ تم اگر باہر کی دوستیوں سے خوش ہو تو میں کیوں نہ کنوئیں میں ڈوب مروں۔ میرے بھائی نے اُسی وقت کنوئیں کے رستے سے اُس کی دونوں ٹانگیں باندھ کر کنوئیں میں لٹکادیا۔ وہ بے چاری چیخنے لگی۔ ہم نے اُسے بڑی مشکل سے چھڑایا تھا۔“

”کنوئل کہاں تھا؟“

”ہمارے صحن میں کنوئل ہے۔“ تنویر نے جواب دیا۔

”تصیوں میں نلکے نہیں ہوتے تھے۔ اکثر لوگوں نے گھول میں کنوئیں کھود رکھے تھے۔ وہ علاقہ دریا کے قریب تھا۔ گیارہ بارہ گز تک پانی نکل آتا تھا۔ لڑکی نے جوئی کنوئیں کا نام لیا مجھے رستہ یاد آگیا۔ لاش والا یہ رستہ کنوئیں کے ڈول والا تھا اور بنا تھا۔“

”تمہارا بھائی کیا کام کرتا ہے؟“ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

”گھر میں ایک بھینس اور ایک گائے رکھی ہوئی ہے۔“ اُس نے

جواب دیا۔ ”محلے والے اُس سے گھر سے ہی دودھ لے جاتے ہیں.... اور وہ باہر سے بھی کچھ کھاتا ہے۔“

”وہ جو ابھی کھیلتا ہے۔“ نادر بول پڑا۔ ”اُس کی باہر کی سونائی ابھی نہیں۔ چرس بھی پیتا ہے۔“

”تم نے اُسے کب دیکھا تھا؟“ میں نے تنویر سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے چھ سات مہینے ہو گئے ہیں۔“ تنویر نے جواب دیا۔

”میں نے اُسے کل صبح دیکھا تھا۔“ نادر نے کہا۔

اب تو میں نے انہیں اس آدمی سے پہننے نہ دیا۔ مجھے ایسے

محسوس ہونے لگا تھا کہ مجھے قاتل مل گیا ہے یا قاتل کا ساتھی۔ البتہ اس سوچ نے مجھے اُلجھا دیا کہ اس کے ساتھ کھڑے عورت کون تھی؟ وہ اس کی بہن نہیں ہو سکتی تھی۔ بہن ہوتی تو اپنے سگے بھائی کو کاٹتی نہ اور اُسے قتل نہ کراتی۔ وہ کوئی اور عورت ہوگی جس کے ساتھ مقتول کے تعلقات ہوں گے اور درمیان میں تنویر کا بھائی آگیا ہوگا۔ پھر خیال آیا کہ بھائی ہوگا نہ بہن۔ تنویر اور نادر ہی ہوں گے یا کوئی اور ہوں گے۔ بہر حال قتل میں ایک عورت ضرور شریک تھی۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”کل میں نے اُسے بہت ڈھونڈا ہے وہ کہیں ملا نہیں۔“ میں نے

نادر سے کہا۔ ”اُس کے گھر دو دفعہ آدمی بھیجا۔ وہ گھر بھی نہ ملا۔ تم نے اُسے

قبرستان میں جو لوگ جمع تھے ان میں دیکھا تھا؟“

”میں نے اس سے پہلے اُسے دیکھا تھا۔“ نادر نے جواب دیا۔

”مجھے جب پتہ چلا کہ نوازش کی لاش درخت کے ساتھ ٹک رہی ہے تو میں لاش کو دیکھ کر تنزیر کے گھر کو چل پڑا۔ راستے میں بند رائل ڈسپنسر کی دکان میں تنزیر کے بھائی کو دیکھا۔ بند رائل اُس کی بائیں ران پر بچی باندھ رہا تھا۔ میں دکان میں چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے معلوم ہے کہ نوازش نے خودکشی کر لی ہے؟ اُس نے جواب دیا — ”ہاں یار، میں نے ابھی ابھی سنا ہے۔ رات کو میں بھینس کے کیل سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔ نیچے کہال سدھی پڑی تھی۔ اس نے ٹانگ کا ٹ دی ہے۔ بند رائل کو بچی کے لیے جگا کر لایا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری بہن کے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو تھلنے رپورٹ درج کرانی ہوگی۔ اُس نے کہا — ”تم چلو، میں آتا ہوں“۔ پھر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔“

میری فالٹو جس جاگ پڑی۔ وقت دیکھا۔ چار بج چکے تھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ ناشتے کے وقت ان دونوں کے لیے گھر سے ناشتہ لا دو۔ اور ان دونوں سے کہا کہ وہ چاہیں تو تھوڑی دیر اور سولیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو باہر بلا کر پوچھا کہ اسے بند رائل ڈسپنسر کے گھر کا علم ہے؟ بند رائل کسی ڈگری کے بغیر معمولی سی ڈاکٹری اور ہم پٹی کیا کرتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے تین چار کانسٹیبلوں سے پوچھا تو ایک نے بتایا کہ اُسے گھر کا علم ہے۔ میں اُسے ساتھ لے کے چل پڑا۔

بند رائل کا جادروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا تو پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”اکمل نام کے ایک آدمی نے کل صبح تمہیں گھر سے جگا کر دکان کھولائی اور ران

کے زخم پر ہم پٹی کرائی تھی“۔ میں نے اُس سے پوچھا — ”وہ زخم کیسا تھا؟“

”کہتا تھا کہال پر گرنا ہوں“۔ بند رائل نے جواب دیا — ”لیکن زخم کہال کا نہیں تھا۔ میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ سرکاری ہسپتال میں کیا ڈنڈ رہ چکا ہوں۔ سوئی سے لے کر کھارٹی تک کے زخم دیکھے ہیں۔ اس شخص کا زخم نوکدار چیز کا تھا۔ تقریباً پون ارب گہرا تھا۔ یہ چاقو، چھری اور خنجر کی نوک کا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال کہال کا نہیں تھا۔“

”زخم تازہ تھا؟“۔ میں نے پوچھا — ”زخم کے فوراً بعد وہ تمہارے پاس آ گیا تھا؟“

”نہیں“۔ بند رائل نے کہا — ”زخم رات کا تھا۔ اُس نے اس میں کورے سوت کی آٹی جلا کر بھر رکھی تھی لیکن خون رکتا نہیں تھا۔“

”کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ زخم نوکدار چاقو کا تھا؟“

”تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ زخم چاقو کا تھا“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”بہر حال ہتھیار جو بھی تھا اس کی نوک نوٹ سے درجے کے زاویے پر ران میں گئی ہے۔“

## شلوار مل گئی

میں نے اُسے کہا کہ اُسے گواہی دینی پڑے گی۔ وہ انکار نہیں کر سکتا

تھا۔ کانسیبل اکل رتنور کے بھائی کے گھر سے بھی واقف تھا۔ وہاں گئے اُس کے باپ نے دروازہ کھولا۔ اکل کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ کل صبح نکلا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ واردات کی رات کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا کہ اُس کی بیوی کو معلوم ہوگا۔

میں اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی صحن کی دوسری طرف کے کمرے میں رہتی تھی۔ کمرے میں کی وجہ سے لوگ چھتوں پر سوتے تھے۔ میں نے اُس کی بیوی کو بلایا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔ اُس سے واردات والی رات کے متعلق سوال کرنے لگا۔ اچانک مجھے کونٹوں کے رستے کا خیال آگیا۔ میں اُٹھ کر صحن میں گیا۔ ایک کونے میں کینواں تھا۔ ڈول کارسہ دیکھا۔ بہت بوسیدہ حالت میں تھا۔ تین تو اس میں کانٹھیں تھیں۔ میں کمرے میں گیا اور اس کی بیوی سے پوچھا کہ واردات والی رات اکل کس وقت گھر سے نکلا اور کس وقت گھر آیا تھا۔

”وہ شام سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُدھی رات سے ذرا پہلے آیا تھا۔“ وہ فوراً چُپ ہو گئی جیسے آگے بتانا نہ چاہتی ہو کہ کیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے لقمہ دیا تو کچھ گھبرا گئی۔ میں نے اندھیرے میں تیرے چلایا: ”اُس کی شلوار خون سے بھری ہوئی تھی۔“

اُس نے سہمی ہوئی سرگوشی کی۔ ”جی۔“

”پھر تم نے وہ شلوار فوراً دھو ڈالی تھی؟“

”جی۔“ وہ جھجک گئی اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی: ”اگر

آپ کو ساری بات کا علم ہے تو میری زبان سے نہ کہلوائیں۔ وہ مجھے اس

کنوٹوں میں پھینک دے گا۔“

”میں تمہاں نیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے جو کچھ بتاؤ گی وہ میں اُسے نہیں بتاؤں گا۔۔۔ اور مجھے جو کچھ بتاؤ گی اس پر وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔ تمہیں ساری بات بتانی پڑے گی۔ مجھے وہ شلوار کڑتہ دکھاؤ جو اُس نے کل رات پہنا تھا ورنہ میں سارے گھر کی تلاشی توں گا۔“

اکل کے باپ کو میں نے بلا کر کہا کہ خانہ تلاشی سے بچنا چاہتے ہو تو اسے کہو کہ میں جو مانگتا ہوں وہ مجھے دے دے۔ پوٹھے نے اُسے کہا کہ داروغہ جی کے حکم کی تعمیل کرو ورنہ یہ سب کو تھانے لے جائیں گے۔ میں نے محلے کے دو آدمی مشیر نامہ تیار کرنے کے لیے بلا لیے۔

اکل کی بیوی نے شلوار اور کڑتہ نکال دیا۔ شلوار ران سے اُس جگہ سے چھٹی ہوئی تھی جہاں اکل کو چاقو لگا تھا۔ چھٹی ہوئی نہیں بلکہ کٹی ہوئی تھی۔ یہاں سے چاقو گذرا تھا۔ بیوی نے شلوار اور کڑتہ دھو ڈالا تھا مگر گھٹنوں نے گھاس پر جہاں رگڑ کھائی تھی وہاں سے گھاس کا رنگ پوری طرح نہیں اُترا تھا۔ بیوی نے یہ بیان بھی دیا کہ اکل کی ران پر زخم تھا جس میں اُس نے سوت جلا کر اس کی راکھ بھری تھی اور بیوی سے کہا تھا کہ کپڑے ابھی دھو ڈالے اور باہر کسی سے بات نہ کرے۔

شلوار کڑتے کی برآمدگی، بیان اور مشیر نامہ تیار کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ سورج طلوع ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنے کانسیبل کو یہ کہہ کر تھانے بھیجا کہ لاش سے جو رستہ کھولا گیا تھا وہ لے کر بازار میں آجائے۔ میں یہاں سے فارغ

ہو کر بازار گیا۔ دکانیں کھل رہی تھیں۔ رستوں کی دکان ابھی نہیں کھلی تھی۔  
چند منٹ بعد دکاندار آگیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ پرسوں شام اکمل  
نام کے ایک آدمی نے اُس سے کونٹوں کے ڈول کا رستہ خریدنا ہے؟  
اُس نے سوچ کر جواب دیا۔ ”اکمل جو نجیب خان کا بیٹا ہے؟“  
میں نے کہا۔ ”ہاں وہی۔“

اُس نے کہا۔ ”میں دکان بند کر رہا تھا تو وہ ادھر سے گزرا۔ مجھے  
دیکھ کر رُک گیا اور کہنے لگا۔ ”لالہ جی! آپ کی دکان دیکھ کر یاد آگیا ہے۔ ڈول  
کا رستہ بیکار ہو گیا ہے۔ تیرا گزرتہ دے دو۔ میں نے دکان پھر کھولی۔ لالٹین  
جلائی اور اُسے تیرا گزرتہ کاٹ دیا۔“  
اتنے میں کانسٹیبل رستہ لے کر آگیا۔ دکاندار نے دیکھ کر کہا۔ ”یہ میری  
دکان سے گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اُس کی پیمائش کرو۔“ اُس نے ناپا تو پورا تیرا گزرتہ نکلا۔  
میں نے اُس کی کلاٹیاں دیکھیں تو میں چونک پڑا۔ اُس کی چوڑیاں بالکل وہی  
تھیں جن کے ٹکڑے مجھے کھڑے سے ملے تھے۔ ایک بازو میں تین اور دوسری میں  
صرف ایک تھی۔ تنزیر کی چوڑیاں بھی ایسی ہی تھیں۔ میں نے توقیر کی ایک چوڑی  
والی کلاٹی پر ایک خراش دیکھی جو گہری سُرُخ تھی۔ اس میں سے خون بھی نکلا تھا۔  
میں نے اُس کی کلاٹی پکڑ کر خراش پر اُنکلی پھیری اور پوچھا۔ ”یہ شاید ٹوٹی ہوئی  
چوڑی کا زخم ہے۔“

”بازو دیوار کے ساتھ جا لگا تھا۔“ اُس نے کہا۔

بغیر ایک کانسٹیبل کو بھیج کر مقتول کی بڑی بہن کو گویا لیا۔ اُس کی ماں اور اُس کا باپ  
بھی ساتھ آگئے۔ انہیں میں نے اک بٹھا دیا اور تسلی بخشی دے کر کہا کہ خود کشی کی  
نفتیش مکمل کرنے کے لیے مجھے اس رُک کی کو یہاں بلانا ضروری تھا۔ چند ایک باتیں  
معلوم کر کے اُسے آپ کے ساتھ بھیج دوں گا۔

میں اُسے نفتیش کے کرے میں لے گیا جہاں ایک چار پائی اور ایک کرسی  
رکھی تھی۔

یہ جوان عورت تھی۔ خدا نے اُسے بھی خوبصورتی دی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں  
خوف بھی تھا اور آنسو بھی۔ اُس سے میں اکمل کے تعلقات کے متعلق مقتول اور تنزیر  
کے تعلقات کے متعلق اور نادر کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں  
سکتا تھا کہ اتنے نیک اور مخلص سبائی کو اُس کی بہن نے قتل کر دیا ہوگا۔ اکمل کے  
متعلق تو مجھے شک ہو رہا تھا کہ روپوش ہو گیا ہے۔ میں نے مقتول کی بہن کو سر  
سے پاؤں تک دیکھا اور نام پوچھا تو اُس نے کہا۔ ”توقیر“

میں نے اُس کی کلاٹیاں دیکھیں تو میں چونک پڑا۔ اُس کی چوڑیاں بالکل وہی  
تھیں جن کے ٹکڑے مجھے کھڑے سے ملے تھے۔ ایک بازو میں تین اور دوسری میں  
صرف ایک تھی۔ تنزیر کی چوڑیاں بھی ایسی ہی تھیں۔ میں نے توقیر کی ایک چوڑی  
والی کلاٹی پر ایک خراش دیکھی جو گہری سُرُخ تھی۔ اس میں سے خون بھی نکلا تھا۔  
میں نے اُس کی کلاٹی پکڑ کر خراش پر اُنکلی پھیری اور پوچھا۔ ”یہ شاید ٹوٹی ہوئی  
چوڑی کا زخم ہے۔“

وہ جب بول رہی تھی میں اُس کے دانت دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اُس کا ایک طرف کا ایک دانت غائب ہے مجھے شدید جھٹکا لگا۔ چھٹے اور ساتویں دانت کے درمیان خلا تھا۔ میں نے اُس کی دونوں جڑتیاں اُتروائیں اور دفتر میں لے گیا جہاں دونوں پاؤں کے مولڈ آگئے تھے۔ دونوں جڑتیاں ان میں فرٹ آگئیں۔ واردات کے علاقے میں یہی جڑتیاں گئی تھیں۔ واپس اس کمرے میں گیا اور جڑتیاں تو قیر کے آگے رکھ کر میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی تو میرا سر جھک جاتا اور کبھی میں رگ کر اس جوان عورت کو دیکھنے لگتا۔ میں تمنا نیدار تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن وارداتیں دیکھی تھیں۔ میں نے ایک آدمی دیکھا تھا جس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا تھا۔ ایک بھائی دیکھا تھا جس نے بردہ فروشوں کی طرح اپنی سگی بہن کو بیچ ڈالا تھا۔ ایک نیک گھرانے کی پردہ نشین لڑکی کو ایک نظر ناک ڈاکو جو پانچ ڈاکوں اور سات قتل کی وارداتوں میں مطلوب تھا اُس کے حق میں بیان دیتے اور اُس کی خاطر روتے دیکھا تھا۔ میں نے اپنی سروس میں ناقابل یقین واقعات دیکھے ہیں، مگر میں اس بہن کو یہ کہتے ڈر رہا تھا کہ کیا تم نے اپنے بھائی کو قتل کر لیا ہے؟ تمنا نیدار کو اتنا حیرانی نہیں ہونا چاہیے، لیکن میں جذباتی ہو گیا تھا۔

میں ٹہلتے ٹہلتے روک گیا اور اُسے بڑی غور سے دیکھنے لگا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ اُس کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہو چکا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بھی سفیدی آگئی تھی۔ کمرے میں گرمی تھی۔ جولائی کا مہینہ تھا لیکن اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شاید میرے ہاتھ بھی کانپ

رہے تھے۔ میں اپنے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا ”توقیر!“ اُس نے میری طرف دیکھا تو غرت سے اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آگئے۔ میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ رومال نکالا جس میں چوڑیوں کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے۔ رومال کھول کر اُس کے آگے کیا اور جھک کر اُس کی چوڑی والی کلائی رومال پر رکھ دی۔ نیچے میرا ہاتھ تھا۔ میں نے ٹکڑے اُس کی چوڑی کے ساتھ ملا دیئے اور نہایت تحمل سے جس میں پیار کا رنگ بھی تھا، کہا ”توقیر! یہ تمہاری چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں۔ جانتی ہونا مجھے کہاں سے لے ہوں گے؟“

وہ آنکھیں پھاڑے میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔  
 ”ان ٹکڑوں میں سے کسی ایک نے تمہاری کلائی زخمی کی ہے“ — میں نے کہا۔

اُس کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ آنکھیں تو اُس کی پھٹی جا رہی تھیں۔ اُس کا منہ بھی کھل گیا۔ مجھے اُس کے دانتوں کا خلا نظر آنے لگا۔

## شریف لڑکی دھوکے میں آگئی

میں نے رومال پیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور اپنا دایاں بازو آگے کر کے بازو کے اُس پٹھے پر انگلی رکھی جہاں مقتول کو دانت لگے تھے۔  
 ”اس جگہ دانت رکھ کر کاٹو“ — میں نے کہا۔ ”منہ سارا کھولو اور یہاں

گئے تھے۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ میں دُعا کر رہا تھا کہ ڈاکٹر جلد ہی آجائے۔  
 کمرے میں بیٹھا نہیں تھا۔ ایک کانسیبل کو بلایا جو دستی پکھلے سے اُسے ہوا  
 دینے لگا۔

ڈاکٹر آگیا۔ میرے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا۔ ”کس قسم کی سختی کی  
 ہے تاکہ میں اُس کے مطابق دوائی دوں“۔ وہ سمجھتا تھا شاید میں نے اُسے  
 مارا پیٹا ہے۔

میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ یہ مقتول کی بہن ہے اور غالباً قاتل بھی ہے۔  
 یہ مجرم اور دہشت کا اثر ہے۔ ڈاکٹر نے ایک دوائی اُس کی ناک کے آگے رکھی۔  
 ایک دوائی کے چند قطرے اُس کے دانوں کے خلا سے اُس کے منہ میں ڈالے۔  
 تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر ایک انجکشن کیا۔ آٹھ دس منٹ بعد اُس کے جسم میں  
 حرکت پیدا ہونے لگی۔ دانوں کا شکنجہ کھل گیا۔ پھر اُس کی آنکھیں کھلیں۔ گھبراہٹ  
 صاف ظاہر تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر نے اُسے باتوں سے جذباتی سہارا دیا اور جب  
 اٹھ بیٹھی تو ڈاکٹر نے دودھ منگوانے کو کہا۔ دودھ آیا تو ڈاکٹر نے اُسے ایک گولی  
 دودھ کے ساتھ دے دی۔

”تمہیں یہاں کسی نے پریشان کیا ہو تو مجھے بتا دو.... میں سرکاری ڈاکٹر  
 ہوں۔“ ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا۔ ”میں تمہارے بیان لکھ کر تمہیں اپنے  
 ساتھ لے جاؤں گا۔“

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ  
 اسے کہیں ہوا میں بٹھاؤ۔ میں اُسے برآمدے میں لے گیا۔ سادہ شروع ہو

سے میرا بازو منہ میں لے لو۔“  
 وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اگر وہ چار پائی پر بیٹھی نہ ہوتی تو پیچھے کو بھاگ جاتی  
 اُس کا منہ جو زرا سا کھلا تھا وہ بھی اُس نے بند کر دیا۔  
 ”کالو تو قیر! ڈرو نہیں۔“

میں اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے چہرے  
 پر بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح پسینہ چھوٹ آیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے  
 اُس بازو پر رکھ دیئے جو میں نے آگے کر رکھا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ وہ میرے  
 اوپر گری۔ میں اُسے سہارا دینے ہی لگا تھا کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔  
 وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ بہانہ نہیں تھا۔ میں نے اُسے اٹھا کر چار پائی پڑال  
 دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے مر گئی ہو۔

میں دوڑ کر باہر نکلا۔ ہیڈ کانسیبل سے کہا کہ دوڑ کر جائے اور سول سرجن  
 کو یہ بتا کر ساتھ لے آئے کہ ملزمہ کسی تشدد کے بغیر بے ہوش ہو گئی ہے۔ مجھے  
 بیان لینے ہیں، جلدی آجائے۔

مجھے ڈرتا تھا کہ اس عورت کے دل کی حرکت ہی بند نہ ہو جائے۔ وہ  
 کوئی عادی مجرم یا قاتل تو نہیں تھی۔ اُس کا بھائی مارا گیا تھا خواہ اسی کے ہاتھوں  
 مارا گیا ہو۔ اپنی چوڑیوں کے ٹکڑے دیکھ کر اور اپنے منہ کے ساتھ لگا ہوا میرا  
 بازو دیکھ کر اُس پر اپنی ہی واردات کی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ میں اُس کے  
 بیان لینے تک اُسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں پانی لایا۔ اُس کے منہ پر چھینٹ  
 دیئے، چند قطرے منہ میں ٹپکائے۔ اُس کے دانت ایک دوسرے پر جام ہو



چکاتا تھا۔ بڑی اچھی ہوا تھی۔ دو ایسوں اور دودھ نے لڑکی میں جان ڈال دی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ تم دل سے اتار دو کہ میں تمھارا نہیں ہوں۔ تمھارے سینے میں جو غبار ہے وہ نکال دو۔۔۔ ایسی بہت سی باتیں کر کے میں نے اُس کے دل پر قبضہ کر لیا مگر وہ جو روٹی ہے، میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کیسا روانا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ پھر بے ہوش ہو جائے گی۔ ڈاکٹر مجھے ایک اور گولی دے گیا تھا۔ مجھے گولیوں کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ نشہ آور معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اُسے دوسری گولی بھی کھلا دی اور پاؤ بھر اور دودھ پلا دیا۔

کچھ دیر بعد سنبھل گئی۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سمجھ گئی ہے کہ میرے پاس اُس کے جرم کی ساری شہادت موجود ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ہر ایک بات جانتا ہوں اُس سے پوچھا۔ ”اس کے بعد اکل تمہیں ملا تھا؟“

اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا ”نہیں“۔ اور اُسے گالی دے کر کہا۔ ”اللہ کرے وہ کہیں مر گیا ہو اور اُس کی لاش گتے کھا رہے ہوں!“ میری حوصلہ افزائی اور جھوٹے وعدوں پر اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ اُس کا بیان اور بیان کے دوران میرے سوال اور ان سوالوں کے جواب اتنی لمبی تحریر تھی کہ میں مکھ مکھ کر تھک گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ جوں جوں جرم کا غبار نکالتی جا رہی تھی اُس کی زبان رواں ہوتی جا رہی تھی۔ قصہ مختصر یہ تھا کہ تنزیہ و مقول کی بیوی، تو شادی سے پہلے ہی عشق و محبت کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ یہ عورت (توقیر) ایسی نہیں تھی۔ نوازش و مقول، کی طرح مذہب پرست تو

نہیں تھی البتہ عورت اور شرافت والی تھی۔ اُس کی شادی اپنے مقتول بھائی کی شادی کے بعد ہوئی تھی۔ خاوند اچھا تھا۔ گھر بھی اچھا تھا۔ معاشی لحاظ سے اُس کے سسرال غریب تو نہیں تھے البتہ تھوڑا سا سبھی مانی پوچھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔

شادی کے ایک ہی سال بعد اُس کے خاوند کو دق کا مرض لگ گیا۔ اس سے پہلے وہ اس مرض کو چھپاتا رہا تھا۔ توقیر کو پتہ چل گیا کہ ڈاکٹر نے اُس کے خاوند سے کہا تھا کہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے شادی نہ کرنا۔ اُس دقت مرض ایسے ابتدائی مرحلے میں تھا جس میں وہ صرف چلتا پھرتا ہی نہیں تھا بلکہ کام کاج بھی کرتا تھا۔ اُسے ہلکی ہلکی کھانسی اور جسم ٹھنڈے کی شکایت رہتی تھی۔ اُس کے والدین کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ اسے دق کا عارضہ ہے۔ انہوں نے اسے چھپائے رکھا اور توقیر کا رشتہ مانگ کر اس کی شادی کر دی۔

ہمارے ہاں اس قسم کی خطرناک اور احمقانہ حرکتیں آج بھی ہوتی ہیں کہ لڑکی یا لڑکا جسمانی لحاظ سے شادی کے قابل نہ ہوں تو پردہ پوشی سے کام لے کر شادی کر دی جاتی ہے۔ یہ سب ”ناک“ کی خاطر ہوتا ہے۔ معاشرے میں اس کے نتائج آئے دن سامنے آتے ہیں پھر بھی والدین عبرت حاصل نہیں کرتے۔ توقیر کے ساتھ یہی ظلم ہوا۔ اُس کے دو لہانے بھی اُسے نہ بتایا کہ وہ دق کا مریض ہے۔ اُس زمانے میں ابھی دق کا علاج ایجاد نہیں ہوا تھا سڑ پٹی پٹی مین کے انجکشن اور اے۔ پی۔ ایس کی گولیاں بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ شادی ہوئی تو دو لہا میاں اپنی جسمانی حالت کو فراموش کر بیٹھے۔ چھ سات مہینوں بعد توقیر کھ گئی

کہ اس کا خاوند سندرست نہیں۔ وہ اب تیزی سے دق کے جبڑوں میں جانے لگا۔ اُن دنوں وہ ایک حکیم کا علاج کرا رہا تھا۔ ایک رات توفیر نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا ہے اور وہ دو ایشیاں کیوں لے رہا ہے۔ خاوند ہار چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر توفیر سے کہا کہ وہ دق کا مرہین ہے۔

توفیر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی لیکن شریف لڑکی تھی۔ اُس نے اتنی سخت کڑوی اور ڈراؤنی حقیقت قبول کر لی اور خاوند سے کہا کہ وہ اُس کی ہر طرح خدمت اور وفا کرے گی۔ اپنے والدین سے بھی ذکر نہیں کرے گی لیکن وہ اتنا کرے کہ اُس سے دُور رہے۔ پکا وعدہ ہو گیا مگر کبھی کبھی وعدہ ٹوٹ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاوند دق کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو گیا جس میں جراثیم پھیلنے لگیں اور پھینکے لگتے اور پھینکے لگتے ہیں۔

توفیر نے اُسے ہر طرح کا پرہیز کرانا شروع کر دیا۔ اُس کے خاوند کی نوکری چھوٹ گئی۔ وہ اب صرف چل پھر سکتا تھا۔ توفیر کا سسر کچھ کما لاتا تھا۔ اس کے خاوند کا بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا۔ اپنے بیمار بھائی کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ گھر میں تنگدستی شروع ہو گئی۔ زیادہ تر پیسے علاج میں نکل جاتے تھے۔ ایک سال گزر گیا۔ توفیر کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ خاوند کی پوری پوری خدمت کرتی، حکیم سے اُس کے لیے دوائی لاتی، وفاقاری میں اس نے کوتاہی نہیں کی، باقی ہر لحاظ سے وہ احتیاط کرتی تھی مگر مرض تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔

تقل کی واردات سے ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ توفیر حکیم سے دوائی لا رہی تھی، راتے میں اُسے اکمل مل گیا۔ اکمل اس کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اکمل کی

بہن توفیر کے بھائی (نواز شمس) کی بیوی تھی۔ اکمل نے توفیر سے اس کے خاوند کے متعلق پوچھا تو وہ رو پڑی اور بتایا کہ خاوند کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے اور گھر میں تنگدستی ہے۔ اکمل نے جھردی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ توفیر کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ اُس کے خاوند کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے پہلی پیشکش یہ کی کہ نصف سیر دودھ ہر روز بلا قیمت دینے کا وعدہ کیا۔ اُس کے گھر میں ایک گائے اور ایک بھینس تھی۔ اسی روز وہ آدھا سیر دودھ خود لے آیا۔ پھر وہ ہر صبح اتنا ہی دودھ خود دینے جاتا رہا۔

اُسے معلوم تھا کہ توفیر تیسرے دن حکیم کے پاس دوائی لینے جاتی ہے۔ اُس روز اکمل حکیم کی دکان کے قریب موجود مہرتا۔ توفیر آتی تو اکمل بھی اس کے ساتھ دکان میں چلا جاتا اور دوائی کے پیسے دے دیتا۔ توفیر نے ابتدا میں یہ پیشکش قبول کرنے سے گریز کیا لیکن اکمل کا رویہ ایسا مخلصانہ اور بے غرض تھا کہ توفیر نے پیشکش قبول کر لی اور اُس کی گردیدہ بھی ہو گئی لیکن نیت میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ اکمل کی آمدنی دراصل دودھ کی اتنی نہیں تھی، زیادہ آمدنی جوئے کی تھی، جو وہ توفیر کے خاوند پر خرچ کرتا رہا۔ تیسرے چوتھے روز اکمل پاؤ بھر گوشت توفیر کے گھر لے جاتا اور کتا کہ خاوند کو اس کی نینھی پلاؤ۔ توفیر ایک پاؤ گوشت کی نینھی بنا تی اور تین دن خاوند کو پلاتی رہتی۔

ایک روز توفیر اکمل کے گھر گئی تو اکمل نے اُسے اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اُس کی بیوی تو بیمار بھیڑکی مانند تھی۔ وہ اپنے کام کاج میں لگی رہی۔ توفیر نے اکمل سے کہا کہ وہ اُسے احسانات کے بوجھ تلے داتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ

کی حفاظت کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہ کہ زوری عورت کی فطرت میں شامل ہے۔  
توقیر کی عمر ہی کیا تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ خاوند کے سائے میں بیٹھتی، خاوند اس  
کے لیے ہیبت ناک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ خیالوں کے سیلاب میں ڈوبتی رہتی تھی۔  
اُس نے شادی کی خوشیاں تو دیکھی ہی نہیں تھیں۔

## مقبرے کا چراغ، کھٹکے کا اندھیرا

پانچ چھ مہینے اکل اُس کی مدد کرتا رہا اور اُس کے گھر جاتا رہا۔ اُس کا  
خاوند بھی اُس کا مرید بن گیا۔ خاوند کی جسمانی حالت یہ تھی کہ وہ اب چار پائی سے  
اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ توقیر نے خانقاہوں کا سہارا بھی لیا۔

قبرستان میں کسی بزرگ کا مقبرہ تھا۔ ہر جمعرات کی شام عورتیں اس میں  
دیئے جلا یا کرتی تھیں۔ مشہور تھا کہ اس بزرگ کے پاس ہر روگ کا علاج ہے۔  
یہ بھی مشہور تھا کہ خواجہ خضر ادھر سے گزریں تو رات اس مقبرے میں بسر کرتے  
ہیں۔ اگر اُس رات کوئی دیا جلائے تو اُس کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے مگر کسی  
کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ خواجہ خضر کونسی رات مقبرے میں آتے ہیں۔ توقیر نے خاوند  
کی صحت کے لیے اس مقبرے میں ہر شام دیا جلانا شروع کر دیا۔ دیا جلا کر وہ روتی  
اور کہتی ”خواجہ خضر، اگر آپ یہاں ہیں تو میرے سماگ کو دق سے بچاؤ یا مجھے اپنے ساتھ لے  
ایسی ہی ایک شام تھی۔ توقیر نے مقبرے میں جا کر دیا جلا یا۔ اُس شام وہ  
خاصی دیر سے گئی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ توقیر دیا جلا کر دُعا کے لیے بیٹھ

ہی اُس نے کہا کہ اگر وہ ان کی مدد نہ کرے تو گھر میں فاقہ کشی تک نوبت پہنچی ہوگی  
تھی۔ ذرا سی آمدنی تھی وہ حکیم اور دق کے جراثیم کھائے جا رہے تھے۔  
اکمل نے مظلوموں کے لیے میں کہا ”میں نہیں یا تمہارے خاوند کو  
خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ یہ تو میں اپنا دل بہلا رہا ہوں۔ ذرا میری بیوی  
کو دیکھو۔ اس کی جگہ میں ایک اور گائے یا بھینس خرید لانا تو دودھ تو دیتی۔ یہ  
عورت تو ریت کی ڈھیری ہے۔ یہ سمجھ لو کہ دن رات ریت پھانکتا ہوں۔ مجھے  
خدا نے درد والا اور محبت والا دل دیا ہے۔ پیسے کو تو میں کچھ نہیں سمجھتا، مجھے  
انسانوں سے محبت ہے۔ دل کو جو انسان اچھا لگتا ہے اُس سے پیار کی نیرات  
مانگتا ہوں۔ ہمیشہ خالی ہاتھ رہتا ہوں۔ میں تمہیں ایسی بات نہیں کہہ سکتا کیونکہ  
تم عورت ذات ہو، خوبصورت بھی ہو، تم غلط سمجھ بیٹھو گی۔ پھر تم بہت دکھی بھی  
ہو۔ میں کہتا ہوں مجھ سے کوئی جو چاہتا ہے لے لے، میری کھال بھی اتار لے  
مگر پیار کے دو ٹیٹھے بول دے دے۔ میرا تو من ہی مر گیا ہے۔“

توقیر نے اپنے بیان میں کہا کہ اکمل نے یہ باتیں اور ایسی بہت سی باتیں  
ایسے دیکھے ہوئے لیے میں کہیں کہ اُسے اس پر ترس آگیا اور وہ سوچنے لگی کہ وہ  
اسے دلی اطمینان کس طرح دے سکتی ہے۔ توقیر پر اُس کے احسان، تھوڑے  
اور معمولی تو نہیں تھے۔ اکمل نے اُسے صرف مالی نہیں جذباتی سہارا بھی دے  
رکھا تھا اور اُسے کہا کہ تمہارا مجھے مرد نہ سمجھا کرو، اپنی سہیلی سمجھو اور دل کا بوجھ  
ہلکا کر لیا کرو۔ اس طرح اکمل توقیر کے اعصاب پر اور اُس کی عقل پر بڑے ہی پیارے  
آسیب کی طرح غالب آگیا۔ عورت کتنی ہی جابر اور مٹہ پھٹ کیوں نہ ہو وہ مرد

گئی۔ باہر شام اندھیری ہو گئی۔ جب وہ باہر آئی تو ڈر گئی۔ دو ہی قدم چلی تھی اکل سامنے آ گیا۔

”اتنی دیر سے نہ آیا کرو“ اکل نے اُسے کہا۔ ”علاقہ ویران ہے میں نے تمہیں ادھر آتے دیکھ لیا تھا۔ اپنا کام چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس اندھیرے میں تم ڈرو گی۔“

وہ واقعی ڈر رہی تھی۔ اکل اُس کے لیے فرشتہ بن گیا اور یہ فرشتہ اُسے بڑی ہی پُراثر باتوں میں لگائے اُس کھڈ میں لے گیا جہاں اس ڈرامے کا آخری منظر کھیلایا گیا تھا۔ توقیر جو ان لڑکی تھی۔ جذباتی لحاظ سے اُس میں گھٹن تھی جو اُسے مارے جارہی تھی۔ اکل کے احسان کی قیمت بھی دینا چاہتی تھی بہت سے عناصر جب اکٹھے ہوئے تو توقیر جو شریف اور با وفا بیوی تھی اخلاقی پستی کے گہرے کھڈ میں اتر گئی۔

اس کے بعد تیسرے چوتھے روز توقیر دانستہ دیر سے مقبرے میں دیا جلانے جاتی اور اکل وہاں پہنچ جاتا اور دونوں قبرستان سے پرے کھڈ میں چلے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک سال چلا۔ گناہ چھپے نہیں رہ سکتے۔ ان کی آشنائی کے چرچے ہونے لگے۔ توقیر کے بھائی (مقتول) نے اکل کو روکا کہ وہ توقیر کے گھر نہ جایا کرے۔ اکل نے اُسے شرافت سے سمجھایا کہ لوگ بکو اس کرتے ہیں، وہ لوگوں کی باتیں نہ سنے مگر مقتول کی تسلی نہ ہوئی۔ اُس نے توقیر کو بھی پُراہلجا کہا اور یہ بھی کہا کہ میری بیوی بھی بدنام ہے اور میری بہن بھی بدنام ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا یا تینوں بدکاروں

کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ وہ اکل اور توقیر کے پیچھے پڑا رہا۔ توقیر کے سامنے اکل نے مقتول کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

اس دوران توقیر کے خاوند کی حالت آخری مرحلے میں جا پہنچی۔ عورتوں نے اُسے بتایا کہ وہ خواجہ نقشبندی کے پاس جائے۔ اُن کے تعویذوں میں بڑی برکت ہے۔ اُس قصبے میں ایک آدمی اپنے آپ کو خواجہ نقشبندی کہلاتا تھا۔ اُس کا کاروبار تعویذ اور ٹوٹے ٹوٹکے تھا۔ سنا جاتا کہ بے اولاد عورتیں اُس سے زیادہ فیض حاصل کرتی ہیں۔ توقیر بھی ایک۔ روز اُس کے پاس چلی گئی اور اپنے خاوند کا روگ بتایا۔ خواجہ نے اُسے تعویذ دیئے جن میں سے ایک تو گلے میں باندھنا تھا اور دوسرے دو نہار منہ پانی میں گھول کر بلانے تھے۔ خواجہ نے توقیر سے کہا تھا کہ وہ مسلسل سات روز اُس کے پاس آئے کیونکہ وہ ہر روز پینے والا یا تعویذ دیا کریں گے۔

وہ جاتی رہی۔ اس دوران خواجہ نے اس خوبصورت لڑکی پر ڈور سے ڈالنے شروع کر دیئے۔ توقیر جھینپ گئی۔ وہ تو اس شخص کو خدا اور رسول صلعم کے بعد کا درجہ دے بیٹھی تھی مگر خواجہ نقشبندی شیطان کے روپ میں آ گیا۔ توقیر نے مجھے بتایا کہ اُس کی دائرہی اور اس کا قدرت باکل اُس کے مقتول بھائی نازش سے ملتا جلتا تھا۔ توقیر نے اُس کے ہاں جانا چھوڑ دیا، حالانکہ وہ اکل کے ساتھ غلط دوستی میں ڈوبی ہوئی تھی مگر اسے وہ جائز سمجھتی تھی۔ وہ کسی اور غیر مرد سے کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

خواجہ اس کے گھر پہنچ گیا اور اس کے خاوند پر دم دُرود کرنے اور تعویذ

دینے لگا۔ اداکاری خوب کرتا تھا مگر توقیر اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اُسے پتہ چل گیا کہ توقیر شام کو مقبرے میں دیا جلائے جاتی ہے۔ ایک شام اُس نے توقیر کو مقبرے کے باہر کپڑا لیا۔ توقیر نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ شور مچا دوں گی۔ اس کے بعد دو دفعہ خواجہ نے اس کا پیچھا کیا اور راستے میں روکا۔ توقیر نے اکل کو بتا دیا مگر خواجہ اکل کے ہاتھ نہ آیا۔

پھر وار دات کی شام آگئی۔ توقیر کو اکل نے ایک روز پہلے کہا تھا کہ کل شام آؤں گا۔ اُس شام توقیر گھر سے اُس وقت دیا جلائے نکلے گی جب سورج غروب ہو چکا تھا۔ مقبرے میں گئی۔ دیا جلا یا اور اندر ہی انتظار کرتی رہی۔ اکل معمول سے کچھ دیر سے آیا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ چاند کی تیسری یا چوتھی تھی۔ چاندنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ توقیر اکل کے ساتھ کھڈ کی طرف چل پڑی۔ اکل کے ہاتھ میں رستہ تھا۔ توقیر کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کنوئیں کا رستہ بالکل خراب ہو گیا ہے۔ بازار سے گزر رہا تھا تو رستہ خرید لیا پھر یاد آیا کہ تم انتظار کر رہی ہو گی۔ میں گھر نہیں گیا، سیدھا ادھر ہی آ گیا۔

وہ قبرستان سے نکل کر دوسرے راستے سے کھڈ کی طرف جا رہے تھے کہ توقیر نے چونک کر کہا — ”کوئی آ رہا ہے۔“ اُسے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تھی جو دوڑ تھی۔ اکل نے ادھر ادھر دیکھا تو پھسکی پھسکی چاندنی میں اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ توقیر نے اُسے کہا — ”کوئی ہوا بھی تو وہی خواجہ ہو گا، تو نیندوں والا۔ مردود نے پریشان کر دیا ہے۔“

اکل نے کہا — ”اگر اس وقت سامنے آ گیا تو بچ کے نہیں جائیگا۔“

## بہن کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں

وہ آہستہ آہستہ چلتے کھڈ تک پہنچے اور کھڈ میں اتر گئے۔ دو ہی منٹ بعد توقیر کو کھڈ کے اوپر ایک آدمی کھڈ نظر آیا۔ اکل کی اُس طرف بیٹھ تھی کھڈ کے اوپر جھڑیاں بھی تھیں۔ چاندنی بہت ہی مدہم تھی۔ آسمان کے پس منظر میں وہ داغی اور قربت خواجہ نقشبندی کا تھا۔ توقیر نے اُسے کھڈ پر آ کر رکتے اور ایک ٹانے میں بہت تیزی سے نیچے اترتے دیکھا۔

”اکل“ — توقیر نے چلا کر کہا — ”وہ مردود آ گیا ہے۔“ اندھیرے میں توقیر نے اُس کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا۔ اکل گھوما اور پھرتی سے دار چنانے لگا۔ چاقو اُس کی ران میں لگا۔ حملہ آور اوپر سے بہت تیزی سے آیا تھا۔ وہ سنبل نہ سکا۔ اکل سے ٹکرایا تو اکل گر پڑا۔ حملہ آور اس پر سوار ہو گیا۔ اُس وقت توقیر اُسے خواجہ نقشبندی سمجھ رہی تھی۔ خواجہ نے گرسے مہرے اکل کی بیٹھ پر بیٹھ کر چاقو والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ توقیر نے ایک ہی جست میں آگے ہونے پر حملہ آور کا بازو کہنی کے نیچے سے منہ میں لے لیا اور خواجہ کے خلاف اس کے دل میں جتنی نفرت اور جتنا غصہ تھا وہ دانتوں میں آتا دیا اور اس قدر زور سے کاٹا کہ خواجہ بلبلا اٹھا۔ چاقو اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ توقیر نے اُسے پرے دھکیل دیا۔ اکل اٹھ کھڑا ہوا۔

سب جانتے ہیں کہ اس دنوازشس کی بیوی بدچلن ہے اور سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ نوازش بہت پریشان رہتا تھا۔ تم یہیں سے گھر چلی جاؤ۔ میں اس کی لاش کے گلے میں پھندا ڈال کر کسی درخت کے ساتھ لٹکا دوں گا۔ لوگ کہیں گے کہ اس نے بیوی سے تنگ آکر خودکشی کر لی ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم دونوں پھانسی چڑھیں گے۔“

بہن کس طرح برداشت کرتی کہ اُس کے بھائی کی لاش درخت کے ساتھ لٹکا دی جاتی۔ وہ تو رو رو کر باگل بھٹی جا رہی تھی۔ اکل نے کُرتے کی جیب سے ایک سگریٹ نکالا۔ اس میں کچھ رکھ کر ماچس جلانی اور اسے آج دے کر تمباکو میں ملایا اور تمباکو سگریٹ میں ڈال کر سگریٹ سٹکا یا۔ تو قیر کو معلوم نہیں تھا کہ یہ چرس ہے اکل نے سگریٹ تو قیر کو دے کر کہا کہ ہلکا سا کش لے کر دھواں اندر لے جاؤ۔

اُس نے کش نکایا تو اُسے کھانسی مٹھی۔ اکل نے آہستہ آہستہ اُسے سگریٹ پلایا۔ چرس نے رنگ دکھایا۔ تو قیر پر نشہ طاری ہو گیا۔ رونا پینا بند ہو گیا اور اُس پر کچھ اور ہی موڈ طاری ہو گیا۔ اُس نے اکل سے کہا۔ ”اٹھو۔ لاش کو اٹھائیں اور کہیں لٹکا دیں۔“

اکل نے اُسے کہا کہ وہ گھر چل جائے اور زبان بند رکھے۔ اکل نے سوچ سوچ کر کہا۔ ”جہرستان کے پاس پیلپ کا ایک درخت ہے۔ اس پر میں لاش کو اٹھا کر چڑھ جاؤں گا۔“

اُس نے لاش دونوں کندھوں پر ڈالی۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کھڑ کی ڈھلان چڑھا۔ اوپر جا کر تو قیر سے کہا کہ رستہ دے دو۔ تو قیر نے لپٹا ہوا رستہ

اُن میں ایک آدھ منٹ لڑائی ہوئی۔ تو قیر نے حملہ آور کو پیچھے سے ٹھننے سے پکڑا اور اُس کی ٹانگ اٹھا کر مروڑ دی۔ حملہ آور نے تو قیر کی کلائی پکڑ کر مروڑی تو چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ پھر اُس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ وہ پیٹھ کے بل گرا۔ اکل اُس کے سینے پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن دبا لی۔ چوڑی کے ایک ٹکڑے سے تو قیر کی کلائی زخمی کر دی اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا حملہ آور کی مٹھی میں رہا اور موت نے اُس کی مٹھیاں کھلنے نہ دیں۔

ذرا سی دیر بعد حملہ آور کی حرکت بند ہو گئی۔ اکل نے اُسے چھوڑ دیا اور گالی دے کر کہا۔ ”چوڑیا جتنا آدمی ہے۔ مر ہی نہ گیا ہو۔“ اُس نے ماچس جلانی۔ روشنی ہوئی تو تو قیر کی چیخ نکل گئی۔ وہ تو اُس کا اپنا بھائی نوازش تھا۔ اس کی داڑھی اور قد بہت خوب اور نقش بند کی کے مشابہ تھا۔ چاندنی بہت ہی مدہم تھی اور کھڈ میں تو اور کم نظر آتا تھا۔ اکل بھی اُسے خواہر سمجھتا رہا۔

تو قیر اپنے بھائی پر گر پڑی۔ اُس نے اکل کے سر اور منہ پر دو ہتھ مارے۔ اُس کا بھائی مرجکا تھا۔ اکل کی ٹانگ سے اور نوازش کے بازو سے خون بہ رہا تھا۔ تو قیر تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ چرٹیلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اکل کے بھی ہوش اُٹ گئے۔ اس نے روتی چلاتی تو قیر کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا۔ ”اب ہوش میں آؤ۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ تم بھی قاتل ہو میں بھی قاتل ہوں۔ دونوں پھانسی چڑھیں گے اور دونوں کے گھروں کی رسوائی ہوگی۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ قریب ہی وہ رستہ پڑا تھا جو اکل اپنے کونٹوں کے لیے خرید لیا تھا۔ رستے کو دیکھ کر اُس نے کہا۔ ”ایک طریقہ دماغ میں آیا ہے۔“

اُسے دے دیا۔ اکل قبرستان کی طرف چل پڑا۔ پھر تالاب کے نشیب میں اُتر گیا۔ تو قیروہاں تک اُس کے ساتھ گئی۔ اکل نے دُک کر اُسے کہا — ”تم گھر پہنچو۔ واپس جاؤ۔ ڈرنا مت۔ گھر والے پوچھیں تو کہنا کہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔“

وہ وہیں سے واپس چلی گئی۔ اُسے کچھ پتہ نہیں کہ اکل نے لاش کس طرح پیپل پر چڑھ کر لٹکائی۔ وہ گھر گئی۔ چرس کے نشے نے اُس کے دل اور دماغ سے اتنے زبردست حادثے کا اثر اُتار دیا تھا۔ گھر والوں کو اُس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کو دیکھنے چلی گئی تھی۔ صبح اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب ساس اُسے سمجھو پڑ کر جگا رہی تھی اور کہہ رہی تھی — ”اری اٹھ، تیرے نوکر ہم ہی چل گئے ہیں۔ تیرے بھائی نے گلے میں پھنڈا ڈال کر پھانسی لے لی ہے۔“

وہ چیخیں مارتی اٹھی چرس کا نشہ ختم ہو چکا تھا۔ حقیقت سامنے آگئی تھی۔ وہ چڑیلوں کی طرح چیختی باہر کو دوڑ پڑی۔ اُس نے قبرستان میں جا کر بھائی کی لاش پیپل سے لٹکتی دیکھی۔ پہلے بے ہوش ہوئی۔ ہوش میں آئی تو اُس نے اپنے بال نونچ ڈالے۔ ہاتھ مار مار کر اپنا چہرہ لال کر دیا۔ اب جبکہ ہر کوئی رورہا تھا، تو قیروہ کے رونے اور پلٹنے پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ دن میں دو بار بے ہوش ہوئی۔ کسی کو اُس پر شبہ نہ ہوا۔ میرے پاس آکر بھی بے ہوش ہوئی۔ مجھے یہ ڈر لگا رہا کہ نو دیتے بھر بے ہوش نہ ہو جائے مگر اتنا لمبا بیان دے کر وہ نارمل رہی۔ ایک تو سینے کا غبار یعنی جرم کا بوجھ اُتر گیا تھا دوسرا اثر ڈاکٹر کی گولیوں کا تھا کہ گولیاں کا اثر بھی ختم ہو گیا۔ اُس نے اپنے بال نونچے شروع کر دیئے۔ میں نے اُسے

بھلانے کی کوشش کی لیکن ناممکن تھا۔ اُس کا بھائی اُس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ میں اُسے مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر بیان ریکارڈ کرانا چاہتا تھا مگر اُس نے مہلت نہ دی۔ اُسے حوالات میں بند کیا تو اندر جاتے ہی اُس نے دروازے کی سلاخوں سے سر بارنا شروع کر دیا۔ اُس کا ماتھا لوہان ہو گیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں رستیوں سے بندھوا کر پیٹھ کے بل فرش پڑا دیا۔ اُس نے سر اٹھا اٹھا کر ماسٹی زور زور سے فرش پر مارا کہ تمھانہ بل گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

یہ الزام مجھ پر آتا تھا کہ میں نے تمھانے میں اس سے بیان لینے کے لیے اسے ٹاچر کیا ہے۔ میں نے سول سرجن کو بلوایا اور خود مجسٹریٹ کے پاس دوڑ گیا۔ قصبے میں درجہ اول مجسٹریٹ نہیں ہوتا تھا۔ ایک سول سرج اور ایک آنریری مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ میں نے دونوں کو یہ واردات سنائی۔ دونوں تمھانے میں آگئے۔ ڈاکٹر بھی آگیا۔ لڑکی کو ہسپتال لے گئے، لیکن وہ پاگل ہو چکی تھی۔ اپنے بھائی کو بڑی زور زور سے پکارتی تھی اور کہتی تھی — ”نوازش آجا۔ دونوں اکل کی لاش کو لٹکائیں گے۔“ کبھی قصہ لگاتی اور کبھی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتی۔

اگر وہ پاگل نہ ہوتی تو میں اسے شک میں بری کرانے کی کوشش کرتا۔ وہ مظلوم لڑکی تھی۔ دھوکے سے اُسے دق کے مریض کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ وہ ٹریف اور وفا دار رہی مگر تنگدستی نے خاندان کی تیار داری نے اور ایک شیطان کے چھوٹے مخلوص نے اُسے عزت اور عصمت سے بھی محروم کر دیا۔ پھر خواجہ نقشبندی نام کے ایک نو سر باز نے اُسے جال میں پھانسنے کی کوشش کی اور

اُس کے دھوکے میں اس کے بھائی کا خون بہ گیا۔

## نقشبندی عورتوں کا سکاری

اُسی شام اکمل بکڑا گیا۔ وہ جوئے کے اڈے سے پکڑا گیا تھا میں تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن اس آدمی کو پھلے کرے میں لے جا کر میں نے گھونسوں سے اس قدر پٹیا کہ میری مٹھیاں اور میرے کندھے در در کرنے لگے۔ پھر بھی میرا تختہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے بے حال کر کے میں نے کہا ”تم قبالی بیان دو نہ دو میرے پاس پوری شہادت موجود ہے۔“

توقیر جو جرم کی معادوں اور نہایت اہم گواہ تھی پاگل ہو چکی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کیسے چوٹ ہو گیا ہے۔ میں نے اکمل کو نہیں بتایا کہ توقیر پاگل ہو گئی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ توقیر اقبال جرم کر چکی ہے اور یہ اُس کا بیان ہے۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میرے پاس کیا کچھ ہے۔

اُس نے صرف اتنا کہا ”اگر میں بھی اقبال جرم کر لوں تو عالی جاہ مجھے کچھ فائدہ دیں گے؟“

میں نے ٹھوٹا وعدہ کیا اور اُس نے قبالی بیان دے کر توقیر کے بیان کی تصدیق کر دی۔

نادر اور تنویر کو میں نے آزاد کر دیا لیکن نادر کے باپ کو تھانے بلایا۔ اُسے اندر لے جا کر خوب ذلیل کیا اور اُسے کہا کہ تمہاری ان سفید ٹوپوں ،

کلف لگے گرتوں اور پاجاموں میں غلاطت بھری ہوئی ہے تمہاری سفید پٹی میں سیاہ کا لے دل لپیٹے ہوئے ہیں۔ شرم کرو اور غیرت کو پہچانو میں تمہاری غیرت کے رُعب سے کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا ایمان مجھے مجبور کر رہا ہے کہ تمہیں شرم دلاؤں۔ یوں کرو کہ یہ کیسے ذرا رفع ہو جائے تو ان دونوں (نادر اور تنویر) کو آپس میں سیاہ دو، ورنہ یہ لڑکی ساری عمر ذلیل ہوتی رہے گی اور تمہارا بیٹا کبھی شادی نہیں کرے گا۔ پھر تمہارے ہاں معلوم نہیں کتنے اور قتل ہوں گے اور کتنی اور کارکن تمہاری سفید وارہی پر ملی جائے گی۔

اکمل کے خلاف میں نے نہایت کامیابی سے استغاثہ بنایا مقتول کے کپڑوں پر جو خون تھا اس کی رپورٹ بھی آگئی تھی۔ یہ دو مختلف گروپوں کے خون تھے۔ میں نے اکمل کا خون بھجوا یا تو اس کا گروپ ایک گروپ سے مل گیا۔ توقیر کی قسمت میں پاگل خانہ کھنا تھا۔ اُسے کورٹ میں اسی حالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اُس کی گواہی نہیں لی جاسکتی تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ لڑکی اس حادثے سے پاگل ہوئی ہے۔ وہ بے چاری پاگل خانے میں ہی مر گئی ہوگی۔ اکمل کو سزائے موت دی گئی۔ اپیل کی تو قیامی کورٹ نے سزائے موت اور سزائے موت برقرار رکھی۔

میں خواجہ نقشبندی کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک تو میں بچپن سے ہی پیر پرستی اور تعویذوں ٹوکوں کے خلاف ہوں ہو دوسرے یہ کہ یہ نوسر باز ایک نیک اور پارسا آدمی کے قتل کا باعث بنا تھا۔ میں اُسے بلاوجہ گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہمارے مسلمان بہن بھائی ایسے پیروں اور بزرگوں کی کٹوت کو جرم سمجھتے



ہی نہیں۔ میں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ سمسکروں کو اور چوں افیون وغیرہ غیر قانونی طریقے سے بیچنے والوں کو بگس گا ہک بھیج کر پکڑا جاتا ہے۔ انہیں بگس پر چیزز کہتے ہیں۔ پولیس اور عدالتوں والے انہیں بی پی کہتے ہیں۔

میں نے خواجہ صاحب کو پھانسنے کے لیے تھپے کے دو بد معاشوں کے ذریعے ایک بد معاش لڑکی بلانی جو عصمت فروشی کرتی تھی۔ چھوٹا سا مکان لیا۔ اس لڑکی کو پہلے ٹریننگ دی۔ بد معاشوں کو بھی تیار کیا۔ پھر لڑکی کو مسائل کی حیثیت سے یعنی بگس پر چیزز بنا کر خواجہ کے پاس بھیجا۔ لڑکی نے اُس سے اولاد مانگی۔ خواجہ صاحب مست ہو گئے۔ لڑکی نے کہا کہ میرے گھر چلیں خواجہ صاحب بُو گھر گئے کی طرح وہاں چلے گئے جہاں میں نے پھندا لگا رکھا تھا۔ دیر بعد محلے والوں کو ایک لڑکی کی جنمیں سنائی دیں۔ میرے بد معاش گھات میں تھے وہ دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر دیواریں کو ڈو کر اندر گئے۔

لڑکی نے اپنی شلوار پھاڑ رکھی تھی اور آٹاری ہوئی تھی۔ اپنے ہی ناخنوں سے اُس نے اپنے چہرے پر خراشیں ڈال لی تھیں۔ خواجہ نقشبندی صاحب بُرمانی کی حالت میں تھے۔ پکڑے گئے اور سیدھے تھانے لائے گئے۔ میں بھرا بیٹھا تھا۔ رات بھر کانٹیلوں سے اُس کا جو حشر کرایا اُس نے مرتے دم تک یاد رکھا ہوگا۔ میں نے اُس کے خلاف زبردستی آبروریزی، دوسرے گھریں ناجائز مداخلت اور نو سر بازی کی دفعات لگا کر شہادتیں تیار کیں۔ خواجہ صاحب کو ہتھکڑی لگا کر بازار سے گزارا۔ مسلمانوں کو دکھایا۔

اس مقدمے کا فیصلہ یہ ہوا، آبروریزی سات سال قید باسقت ناجائز

مداخلت پانچ سال اور نو سر بازی پانچ سال مگر مجھے بتایا گیا کہ تھپے کے مسلمان کہتے ہیں کہ اس تھانیدار کا گکھ نہیں رہے گا۔ اس دُنیا میں سزا پائے گا اور کوڑھی ہو کر مرے گا۔

آج میری عمر چار کم اسی سال ہے۔ چار بیٹے ہیں۔ تندرست و توانا اور برس برس روزگار ہیں۔ میں خود بھی تندرست ہوں اور ذاتِ بازی تعالیٰ سے یہی اُمید ہے کہ اپنی آفتیشوں کی آخری کہانی بھی مساکروں کا۔



نظر نہیں آرہی تھی جیسے موت نے اس کی آنکھوں کو فوراً سے محروم کر دیا ہو۔  
 ”میرے گھر سے سونے کا ہارا اور کچھ نقدی چوری ہو گئی ہے۔“ اُس  
 نے کہا۔

”کب؟“

”پانچ چھ روز ہو گئے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”آپ کو آج پتہ چلا ہے کہ چوری ہوئی ہے؟“

”میں آپ کو چوری کا صبح دن اور وقت نہیں بتا سکتا۔“ اُس نے

کہا۔ ”پانچ چھ روز ہوئے پتہ چلا کہ ٹرنک سے سونے کا ہارا اور نقدی  
 تین سو روپے، غائب ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کب، کس وقت اور کس  
 طرح کوئی ہاتھ صاف کر گیا۔“

”میرے پاس آپ اتنی دیر سے کیوں آئے؟“

”میں اپنے طور پر چوری کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔“ اُس

نے جواب دیا۔ ”ہم نے چور کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ عورت ہے سہتی

نہیں۔ ثبوت ایسا ملا ہے جسے کوئی جھٹلا ہی نہیں سکتا۔“

”مجھے ثبوت بتائیں۔“

”اُس کے نام پر لوٹا گھوم گیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہم نے

اپنے مولوی صاحب کو بلا یا تھا۔ وہ لوٹے کا عمل کرتے ہیں۔ اس عورت کی

پرچی لوٹے میں پڑی تو لوٹا گھوم گیا۔ سب نے دیکھا۔“

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاں لوٹے کے ذریعے چوری

## فرار کے راستے

نو لکھا ہار کی چوری کی کہانی آپ نے بہت پڑانی کتابوں میں پڑھی ہوگی  
 میری جوانی کے دور میں اس کی فلم بھی بنی تھی۔ یہ بادشاہوں اور راجوں ہمارا جوں  
 کی دنیا کی خیالی کہانی تھی۔ میں آپ کو ایک حقیقی ہار کی چوری کی واردات سنا  
 ہوں۔ یہ راجوں، ہمارا جوں اور نوابوں کی نہیں بلکہ ان گھرانوں کی کہانی ہے  
 جہاں باپ اپنی بیٹیوں کے لیے سونے کا ہلکا سا ہارساری عم کی محنت اور  
 مشقت سے اور پیسہ پیسہ کر کے جمع کی ہوئی پونجی سے بنایا کرتے ہیں اور  
 جہاں کوئی بیٹی اُس وقت تک بیاہی نہیں جاتی جب تک اُس کا باپ اپنا  
 خون، اپنا سکون اور اپنی نیندیں سونے کے ایک ہار کی صورت میں اپنی بیٹی  
 کے گلے میں نہیں ڈالتا۔ اگر سونے کا یہ ہار جس کی چمک میں ایک غریب باپ  
 کے خون کی لالی ہو چوری ہو جائے تو وہ باپ خودکشی نہ کر لے تو باؤ لا ضرور ہوا  
 جائے گا۔

ایسا ہی ایک باپ میرے تھانے میں آیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا  
 بڑھاپے کے اثرات تو تھے ہی، اُس کی آنکھوں میں مجھے ذرا سی بھی چمک

کا سراغ لگانے کا طریقہ عام اختیار کیا جاتا ہے۔ دیہات میں اس کا رواج زیادہ ہے۔ چوری کا سراغ لگانے کے اس قسم کے طریقے بڑے صغیر پاک و ہند کے بعد افریقہ کے حبشی قبائل میں رائج ہیں۔ لوٹے کا عمل اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک عامل کو بلایا جاتا ہے۔ وہ مٹی کا ٹٹا لے کر آتا ہے۔ لوٹا زین پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اسے ایک روکا دونوں ہاتھوں سے متھام کر رکھتا ہے۔ جن افراد پر چوری کا شک ہو انہیں ارد گرد بٹھالیا جاتا ہے۔ عامل کچھ بڑھتا ہے۔ پھر ایک مشتبہ فرد کے نام کی پرچی لوٹے میں ڈالتا ہے۔ اگر لوٹے میں کوئی حرکت نہ ہو تو یہ فرد شک سے بری سمجھا جاتا ہے۔ لوٹے سے اُس کی پرچی نکالی جاتی ہے۔ دوسرے فرد کے نام کی پرچی ڈالی جاتی ہے۔ اگر چور مشتبہ افراد میں موجود ہے تو جو نہی اُس کے نام کی پرچی لوٹے میں پڑتی ہے لوٹا سٹوٹا سا گھوم جاتا ہے۔

میں ایسی کوئی رائے نہیں دوں گا کہ لوٹا چور کی پرچی پر واقعی گھومتا ہے یا نہیں۔ میں نے لوٹا گھومتے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تھا نیدار تھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ چوری کی یا کسی اور واردات کی رپورٹ آتی تھی تو میرا سر لوٹے کی طرح گھومنے لگتا تھا لیکن یہ پتہ چلانا محال ہوتا تھا کہ اسے کون سے مجرم کی پرچی گھما رہی ہے۔ یہ آدمی چوری کی رپورٹ دینے آیا تو مجھے یہ سن کر ذرہ بھرا اطمینان نہ ہو کہ لوٹے نے چور کا سراغ لگایا ہے۔ میرے لیے لوٹا کوئی شہادت نہیں تھی۔ قانون لوٹے کو تسلیم نہیں کرتا۔

”میں ثبوت پوچھ رہا ہوں“ میں نے کہا۔ ”میں لوٹے کی گواہی پر

اس عورت کو گرفتار نہیں کر سکتا۔“

”مختصر! سات عورتوں کے سامنے لوٹا گھوما تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”مولوی صاحب گواہ ہیں۔ وہ ہماری مسجد کے امام ہیں۔ امام تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ آپ اُن سے پوچھ لیں۔ میں نے اور مولوی صاحب نے اس عورت سے کئی بار کہا ہے کہ وہ ہار اور نقدی دے دے اور ہم خاموش رہیں گے، پولیس کو رپورٹ نہیں کریں گے مگر وہ لوٹنے پر آجاتی ہے۔ مولوی صاحب کا بھی کہا نہیں مانتی۔ اس کے خاوند کو بھی ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا ہے۔ آپ ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ہمارا مال برآمد ہو جائے گا۔ آپ اس عورت اور اس کے خاوند کو تھانے بلا کر ذرا رعب سے کہیں تو وہ مال دے دیں گے۔“

## مولوی کا شک عورت پر

”مال کہاں تھا؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح بتائیں۔“

”ایک ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے زلیزرات کے ڈبے پڑے تھے۔“ اُس نے کہا۔ ”یہ میں نے اپنی بڑی بیٹی کے لیے اپنا پیٹ باندھ کر بنائے ہیں۔ ان میں ہر سب سے زیادہ قیمتی تھا۔ اسی ڈبے کے نیچے دس دس روپے کے نوٹوں کی صورت میں تین سو روپیہ رکھا تھا۔“

”صرف ہار اور نوٹ چور ہی ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں!— اُس نے جواب دیا— ”باقی ڈبے بالکل محفوظ پرٹے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ کپڑوں کو دیکھو جو تہہ کیسے ہوئے ان ڈبوں پر پڑے تھے اُسی طرح پڑے دیکھے جیسے انہیں کسی نے چھیڑا ہی نہیں۔“

”ٹرنک کو تالا لگا ہوا تھا؟“

”جی ہاں!— اُس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا— ”تالا لگا ہوا تھا۔ توڑا نہیں گیا۔ کسی دوسری چابی سے کھولا گیا ہوگا۔“

”یہ ٹرنک کسی ایسی جگہ پر تھا جہاں باہر کا کوئی آدمی یا کوئی عورت اسے آسانی سے کھول سکتی تھی؟“

”ایسی بات بھی نہیں۔“ اُس نے کہا— ”یہ ٹرنک اندر دنی کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک ٹرنک، اس پر ایک سوٹ کیس اور اس پر ایک اور سوٹ کیس رکھا تھا۔“

”یہ نیچے پڑے ہوئے تھے؟“

”نہ جی!— اُس نے جواب دیا— ”زیور والے ٹرنک کے اوپر

ہی پڑے رہے۔ چور نے پورے اطمینان سے واردات کی ہے۔ اوپر سے ٹرنک اور سوٹ کیس اتارے۔ زیورات والا ٹرنک اپنی چابی سے کھول کر ہار والا ڈبہ اور نوٹ نکالے۔ تالا بند کیا۔ اتارے ہوئے ٹرنک اور سوٹ کیس اوپر رکھے اور گیا۔“

”آپ کو چوری کا پتہ کس طرح چلا؟“

”میری بیوی نے کچھ اور پیسے اس ٹرنک میں رکھنے کے لیے

ٹرنک کھولا تو چوری کا پتہ چلا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اس سے چند دن پہلے آپ اپنے گھر کے تمام افراد سمیت کہیں باہر گئے تھے؟— میں نے پوچھا— ”مکان کو ایک دو روز یا اس سے زیادہ دن تالا لگا رہا؟“

”میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک رشتہ دار کی شادی پر گیا تھا۔“

اُس نے جواب دیا— ”لیکن گھر کو تالا نہیں لگایا کیونکہ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں یہیں تھیں۔“

”ان کی عمر کیا ہیں؟“

”بڑے بیٹے کی عمر پچیس سال کے قریب ہے۔“ اُس نے جواب دیا— ”اس سے چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی عمر اکیس سال ہو چکی ہے۔ اس سے چھوٹی ایک اور بیٹی ہے۔ عمر سترہ سال اور اس سے چھوٹا ایک اور بیٹا ہے جس کی عمر چودہ سال ہے۔“

”گھر میں پردہ ہے؟“

”سخت پردہ۔“ اُس نے جواب دیا— ”اتنا سخت کہ میں اپنی بیٹیوں کو باہر نہیں جانے دیتا۔“

”اور بیٹے؟“ میں نے پوچھا— ”ان پر آپ نے کسی قسم کی سخت پابندی عائد کر رکھی ہے؟“

”آپ میرے بیٹوں پر شک نہ کریں۔“ اُس نے جواب دیا—

”وہ گھر میں کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔“

”آپ میرے پاس رپورٹ لے کر آئے ہیں“ میں نے کہا۔  
 ”مجھے اس سے نہ روکیں کہ میں کس پر شک کرتا ہوں اور کیا شک کرتا ہوں  
 میں آپ کے شکوک کی پابندی نہیں کروں گا۔ آپ جو ان بیٹوں کے متعلق  
 مجھے نہ بتائیں کہ ان پر میں شک کروں یا نہ کروں۔“

”کسی اور پر شک کی ضرورت اس لیے نہیں کہ میں چور کی نشاندہی  
 کر رہا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ اُسے پکڑیں۔“

”کیا اس عورت کے آپ کے گھر والوں کے ساتھ تعلقات اتنے  
 گہرے ہیں کہ اُسے یہ بھی علم ہو کہ آپ نے زیورات کہاں رکھے ہوئے ہیں؟“  
 میں نے پوچھا۔ ”وہ آپ کے گھر صبح و شام آتی رہتی ہے؟“

”اتنی زیادہ تو نہیں آتی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اور میرا خیال ہے  
 کہ اُسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہم نے کیا کہاں رکھا ہوا ہے۔“

”آپ نے اسے کس شک کی بنا پر لوٹے کے عمل کے لیے بلایا تھا؟“  
 وہ ذرا سٹپٹایا اور بولا۔ ”میں نے نہیں مولوی صاحب نے اُسے  
 بلایا تھا۔“

یہ پیش نظر رکھیے کہ لوٹے کے عمل کے لیے اُن مردوں اور عورتوں  
 کو بلایا جاتا ہے جن پر شک ہو۔ انہیں کسی بہانے سے بلایا جاتا ہے بعض  
 لوگ صاف بتا دیتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہمارے گھر آؤ جیسے بلاؤ  
 وہ دل میں کتنی ہی شدید ناراضگی کیوں نہ رکھے وہ اُن سے انکار نہیں کرتا۔  
 اس آدمی کو اس عورت پر شک نہیں تھا جس کا وہ بار بار نام لے رہا تھا اس

کے بیان کے مطابق مولوی صاحب آئے تو انہوں نے اپنے اوپر مراقبے  
 کی کیفیت طاری کر کے کہا کہ چور ان میں نہیں ہے۔ انہوں نے اس عورت کے  
 گھر کی سمت اور ایک دو نشانیاں بتا کر کہا کہ چور وہاں ہے اور وہ عورت  
 ہے۔ چنانچہ اس عورت کو بلایا گیا اور لوٹا اسی کی پرچی پر گھوما۔

## وہ میرا اشارہ نہ سمجھا

میں اس آدمی کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ میں جو سوچ رہا تھا وہ یہ تھا  
 کہ اتنے زیورات میں سے صرف ہار گیا اور نقد ہی۔ ٹرنک کے اوپر ٹرنک  
 اور سوٹ کیس جن طرح رکھے تھے اسی طرح رکھے رہے۔ تالا توڑا نہیں گیا۔  
 نقب نہیں لگی۔ گھر خالی بھی نہیں تھا۔ میرے مزید کیرید نے پر اس آدمی نے  
 بتایا کہ گھر میں نوکر یا نوکرانی بھی نہیں ہے۔ گھر میں محلے کی جو عورتیں آتی ہیں وہ  
 ٹرنکوں والے کمرے تک نہیں جاسکتیں۔ اس سے میرے دل میں یہ شک  
 پیدا ہوا کہ چور گھر میں ہے۔ اسی شک کی بنا پر میں نے اس کی اولاد کی عمریں  
 پوچھی تھیں۔

چوری کی یہ واردات اس آدمی کے لیے نعمی اور حیرت انگیز تھی،  
 میرے لیے اور کسی بھی تھا نیدار کے لیے یہ کوئی عجب نہ نہیں تھا۔ وہ جنتنا  
 پریشان تھا میں اتنا ہی مطمئن تھا۔ اُسے شاید معلوم نہیں تھا کہ پولیس والے  
 صبح معنوں میں حیران مَن وارداتوں کو بھی حیران مَن نہیں سمجھا کرتے۔

”آپ میری رپورٹ لکھ لیں۔“ اُس نے کہا۔ ”اور کارروائی کریں۔“  
 ”میں کارروائی شروع کر دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں آپ کو شہر  
 دیتا ہوں کہ رپورٹ نہ لکھو آئیں۔“

”آپ مجھے ٹال رہے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ کو یہ احساس نہیں  
 کہ میں نے کس طرح بیٹی کے لیے یہ زیورات بنوائے ہیں۔ میں غریب  
 آدمی ہوں۔“

آپ شاید حیران ہو رہے ہوں کہ ایک معمولی سا شہری ایک تھانیدار  
 کو رعب سے کہہ رہا تھا کہ اُس کی رپورٹ لکھی جائے۔ اُس دور میں جب  
 ہم آزاد نہیں تھے، ہر شہری اپنا حق سمجھتا تھا کہ تھانیدار اُس کی بات سُنے  
 اور قانون کے مطابق کارروائی کرے۔ بعد میں کیس میں گڑبڑ ہو جانا اور  
 بات تھی، کوئی تھانیدار کسی شہری کو اُس کے حق سے محروم کرنے کی جرأت  
 نہیں کرتا تھا۔ پولیس والے دوسری پارٹی سے چاٹے پانی ”وصول کر کے  
 ہیرا پھیری کرنا چاہتے تو بعد میں کہ لبا کرتے تھے۔ پولیس کسی بھی دور میں ہیرا پھیری  
 اور چاٹے پانی سے پاک نہیں رہی لیکن یہ حال کبھی نہیں ہوا تھا جو آج اپنے  
 ملک میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اکثر تھانیداروں کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے  
 کہ رپورٹ رجسٹرڈ کی جائے اور رپورٹ درج کرانے والے کو کسی نہ کسی طرح  
 بھگا دیا جائے۔

تھانیداروں کی اس بے رحمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ جرائم اتنے بڑھ  
 گئے ہیں کہ شہروں کے ہر تھانے کے علاقے میں ہر گھنٹے بعد ایک واردات

ہوتی ہے۔ تھانیدار کتنی وارداتیں منبجال سکتے ہیں! ہمارے وقتوں میں  
 جرائم کی یہ بھرمار نہیں تھی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت سیاسی  
 پارٹیوں کے پالے ہوئے غنڈوں کی فوج نہیں ہوا کرتی تھی۔

یہ آدمی جس کے گھر سے ہارچوری ہو گیا تھا اصرار کر رہا تھا کہ میں اس  
 کی رپورٹ درج کروں لیکن میں ٹال رہا تھا۔ میں کارروائی سے گریز نہیں  
 کر رہا تھا۔ ٹالنے کا جو جواز تھا وہ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”آپ میرے مسلمان بھائی ہیں۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”میں آپ  
 کو چور کیپٹروں کا لیکن اس واردات کو تھانے کے ریکارڈ میں نہ آنے دینا۔  
 وہ میرے اشارے سمجھ نہیں رہا تھا۔ گھوم پھر کر پولوی کے ٹوٹے پر آ  
 جانا اور کہتا کہ میں اس عورت کو ڈرا دھمکا کہ اُس سے مال دلا دوں اور اگر وہ  
 نہ دے تو اُسے گرفتار کر لوں مگر چوری کی نوعیت ایسی تھی کہ میرا مانع گھوم پھر کر  
 اُس کے گھر پہنچ جانا اور کہتا کہ ملک بچو راسی گھر میں ہے۔ میں غلط بھی ہو سکتا  
 تھا۔ اُس کا یا اپنا وہم دُور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اُس کے گھر  
 جاؤں۔ اُس کے اصرار پر میں نے رپورٹ درج کر لی اور اس کے ساتھ اُس  
 کے گھر کو روانہ ہو گیا۔

میں نے ابھی تک آپ کو یہ نہیں بتایا کہ یہ آدمی کون تھا۔ قصہ یہ  
 ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ یہ آدمی اس ہسپتال میں ڈسپنسر تھا۔ اس لیے اس  
 نے گھر میں اپنا دوائی خانہ کھول رکھا تھا جہاں وہ معمولی امراض اور زخموں وغیر  
 کا علاج کیا کرتا تھا۔ اس کا بڑا بڑا ہٹیا تحصیل کے دفتر میں کلرک تھا۔ یہ قصہ

سیرٹھیاں بند اور نیچے دروازہ تھا جو مجھے بتایا گیا کہ بند رہتا تھا۔ کوئی اوپر  
جائے تو کھولا جاتا تھا۔

میرے بوائے نے مجھے یقین دلادیا کہ چور باہر سے نہیں آیا۔ باہر  
سے کوئی تجربہ کار چور آسکتا تھا اور اگر وہ تجربہ کار ہوتا تو سارے زیورات لے جاتا۔  
وہ ٹرنگ کے اوپر کے سوٹ کیس وغیرہ نیچے ہی پڑے رہتے دیتا۔ یہ بھی قابل غور  
تھا کہ ایسی واردات جس میں چور اسی جگہ ہاتھ ڈالتا ہے جہاں مال ہوتا ہے،  
ایک گھر بھیدی کا وجود لازمی ہوتا ہے۔ گھر بھیدی عموماً لکھر کے نوکر ہوتے ہیں۔  
اس گھر میں نوکر بھی نہیں تھا نوکرانی بھی نہیں تھی۔

## عورت جن یابد روح تھی

میں جب مکان کا جائزہ لے کر بیٹھا تو ڈپنسر کے دونوں بیٹے موجود تھے۔  
میں نے ان کے چہروں کو بڑھی غور سے دیکھا۔ میں ان چہروں پر آوارہ اور  
ناخلف بیٹوں کے تاثرات ڈھونڈ رہا تھا جو مجھے نظر نہ آئے۔ میں نے ایک  
بات بڑے بیٹے سے کی لیکن جواب باپ نے دیا۔ میں نے دانستہ بڑے  
بیٹے سے ایک اور سوال پوچھا۔ اس کا بھی جواب باپ نے دیا۔ میں نے  
اسے کہا کہ جواب اسی کو دینے دیں۔

”باپ کی موجودگی میں بیٹے کا بولنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے کانوں  
کے لہجے میں کہا اور اس لہجے میں تعارت کا رنگ پیدا کر کے دونوں بیٹوں

تحصیل ہڈی کو اڑھٹ تھا۔ یہ بٹیا جس کی عمر پچیس سال تھی میٹرک پاس تھا۔ اس  
آدمی کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔ دونوں ان پڑھ تھیں۔ اُس دور میں مسلمان  
کے ہاں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا۔ پردہ بڑا ہی سخت تھا۔  
اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے دیواروں اور کواڑوں کو  
غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پہلے ڈپوڑھی آئی جس کا ایک دروازہ باہر اور  
ایک اندر تھا۔ اگے صحن لگیا۔ دائیں طرف برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک  
بڑا کمرہ۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے گیا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ بڑے  
اور چھوٹے کمرے کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ اور کوئی ایسا دروازہ یا کھڑکی  
نہیں تھی جو اس کمرے کا رشتہ کسی اور کمرے یا برآمدے سے قائم کرتی۔ یہ کمرہ  
دراصل کوٹھڑی تھی جو تین اطراف سے بند تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا جو  
اسے بڑے کمرے سے ملاتا تھا۔ ٹرنگ اس چھوٹے کمرے یعنی کوٹھڑی میں  
رکھے ہوئے تھے۔

مکان کے اور سبھی کمرے تھے لیکن ان کا میری تفتیش کے ساتھ کوئی  
تعلق نہیں تھا۔

صحن میں سیرٹھیاں تھیں جو چھت پر جاتی تھیں۔ میں اوپر گیا۔ اس  
مکان کی چھت دائیں بائیں اور عقب کے مکانوں سے ملی ہوئی تھی۔ فیصلہ بھی  
تھی اور بیت انشاء چھت پر تھا۔ اوپر سے چور آسکتا تھا، لیکن ان دونوں  
کمرے میں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اکتوبر نومبر کا مہینہ تھا۔ گھروالے صحن اور  
برآمدے میں سوتے تھے۔ اس کے علاوہ چور کے لیے یہ مشکل بھی تھی کہ

سے کہا۔ ”جاؤ دونوں۔ بھاگو یہاں سے۔“

وہ دونوں جانے لگے تو میں نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ چھوٹا بچہ تو یوں نظر آتا تھا بڑے بیٹے کے چہرے پر غصے کے نمایاں آثار پیدا ہو گئے تھے۔ میں جان گیا کہ یہ فرعون ضم کا باپ ہے۔ اپنی رائے کی تصدیق کے لیے میں نے اسے کہا کہ وہ جو ان بیٹیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا کرے۔ ”اگر اولاد کو اپنے پاؤں کے نیچے نہ رکھو تو خراب ہو جاتی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے بیٹیوں اور بیٹیوں کو اپنے سامنے کبھی نہیں بولا دیا۔“

”آپ انہیں مارتے پیٹتے بھی ہیں؟“

”کیوں نہیں؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں تو اب بھی بڑے بیٹے کی ٹھوکائی کر دیا کرتا ہوں۔“

اس موضوع کو میں نے ہمیں رہنے دیا، البتہ میرے دل میں ایک شک پیدا ہو گیا جسے میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ یہ شک بھی ہو سکتا ہے اور میرے شک کی شہادت بھی۔

”پیشتر اس کے کہ میں اس عورت کو تفتیش میں شامل کروں جس کے نام کی پرچی پر لٹا گھوما تھا، میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس عورت نے چوری نہیں کی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے اس طرح قائل کرائیں کہ چوری اسی نے کی ہے کہ وہ کس طرح اس گھر میں آئی ہوگی، ٹرنکوں والے کمرے تک کس طرح گئی ہوگی، اسے اتنا زیادہ وقت کس طرح ملا ہوگا کہ اُس نے زور دیا

ٹرنک کے اوپر سے ایک سوٹ کیس اُتارا، اس کے نیچے سے دوسرا سوٹ کیس اُتارا، اس کے نیچے سے یہ وزنی ٹرنک اُتاری جو میں نے دیکھا ہے اور اس کے نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا، صرف ہار اور نقد ہی نکالی، ٹرنک بند کیا اور پھر اتنا وزنی ٹرنک اور سوٹ کیس اس کے اوپر رکھے اور وہ گھر سے نکل گئی کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔“

”یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ اس نے چوری کس طرح کی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں آپ کو سولہ آنے یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں، کہ چوری اسی نے کی ہے۔ میں جھوٹ بول سکتا ہوں، آپ جھوٹ بول سکتے ہیں، مولوی صاحب کا لٹا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انہوں نے قرآن کا کلام پڑھ کر لٹا گھمایا تھا۔ آپ مسلمان ہیں۔ آپ کلام پاک کو تو برحق مانتے ہیں۔“

”میں قرآن کو برحق مانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ عورت انسان کی سچی نہیں۔ یہ چرٹیل ہے یا جن۔ ہے یا بدروح ہے۔ آپ مولوی صاحب سے پوچھ لیں۔ اگر وہ عامل ہیں تو انہیں اس عورت کی اصلیت کا بھی علم ہوگا۔ کوئی انسان اس طرح چوری نہیں کر سکتا۔ حیرت اور شاید دہشت سے بھی، اُس کا منہ کھل گیا اور وہ احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔“

”جب تک مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں ملے گا میں اس عورت کو گرفتار کرنا تو دور کی بات ہے اُسے تفتیش میں شامل ہی نہیں کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے یا آپ کے



گھروالوں نے جن افراد پر شک کیا تھا ان میں یہ عورت شامل تھی؟  
”نہیں“

”کیوں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔ میں نے کہا۔  
”اس لیے کہ آپ کے پاس اُس کے علاوہ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔  
اُسے اس گھر میں اتنی بے تکلفی اور اتنی آزادی حاصل نہیں تھی کہ کھلبندوں  
اس گھر میں پھرتی رہتی اور نظر بچا کر آپ کے زیورات اٹھا کر لے جاتی۔“  
”مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اس عورت کو بھی بلاؤ۔“ اُس نے  
کہا۔ میں نے دیکھا کہ اب اُس کی آواز میں پہلے والی خود اعتمادی نہیں تھی کہنے  
لگا۔ ”مولوی صاحب کو غیب سے اشارہ ملا تھا“

## غیب کے اشارے

میرے دل میں ایک اور شک پیدا ہوا۔ مولوی نے اس عورت پر  
کیوں شک کیا تھا؟ یہ عورت آئی تو مولوی کا لوٹنا اسی کے نام پر گھوما میں غیب  
کے اشاروں کا قائل نہیں تھا۔ اگر اس مولوی کو واقعی غیب سے اشارے  
ملتے تھے تو وہ میرے کام کا آدمی تھا۔ مجھے مجرموں کا سراغ لگاتے جس اذیت  
سے گزرنا پڑتا تھا اس کا اندازہ آپ نے میری کہانیوں سے کیا ہو گا۔ یہ مولوی  
غیب کے اشاروں سے مجھے گفتیش کے جھنجھٹ سے بچا سکتا تھا میں نے  
ڈسپنسر سے کہا کہ وہ اپنے کسی بیٹے کو بھیجے اور مولوی کو یہاں بلا لائے۔

وہ ایک لڑکے کو بھیج کر میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا کہ میں اُس  
کے گھر کی مستورات سے بھی کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

”وہ تو پردے میں ہیں“ اُس نے کہا۔ ”آپ مجھ سے پوچھ لیں۔“  
”آپ دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ آپ کی بیوی  
اور بیٹیاں بنا سکتی ہیں کہ یہ عورت کس انداز سے اس گھر میں آتی تھی۔ مجھے  
اور بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔“  
”آپ مسلمان ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”جو ان لڑکیوں کا تھانیدار کے  
سامنے آنا ٹھیک تو نہیں۔“

”میں مسلمان بھی ہوں تھانیدار بھی ہوں، بردہ فروش نہیں ہوں۔“  
میں نے کہا۔ ”اگر آپ مجھے اپنے بیٹوں کے ساتھ بھی بات کرنے کی اجازت  
نہیں دیتے، بیٹیوں کو بھی سامنے نہیں لاتے تو اپنی رپورٹ واپس لے لیں، میں  
اپنی گفتیش روک دیتا ہوں۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو اُس وقت کمرے سے ہٹا  
دیا جب میں اُن سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کام میں کسی کی ایسی  
مداخلت کبھی برداشت نہیں کی تھی۔ مشتبہ عورت کے متعلق مجھے گھر کی عورتوں  
سے ہی کچھ پتہ چل سکتا ہے۔“

وہ اپنی بیٹیوں کو مجھ سے چھپا نہیں رہا تھا، پردے کی پابندی کر رہا  
تھا۔ وہ اُن مسلمانوں میں سے تھا جن میں مذہب کی اندھی عقیدت ہوتی ہے۔  
اپنی عقل سے ذرہ بھر کام نہیں لیتے اور مذہب کے پردے میں مذہب کے  
منافی حرکات بھی کر گزرتے ہیں۔ ان کی نیت میں کوئی خرابی نہیں ہوتی میں اُسے

سمجھتا رہا کہ وہ اپنا ہار اور نقدی واپس لینا چاہتا ہے تو اُسے میرے کہنے پر عمل کرنا ہو گا مگر وہ پتھر طبیعت کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

مولوی صاحب آگئے۔ میں نے ڈپنر کو کمرے سے نکال دیا اور مولوی کو سامنے بٹھا کر غور سے دیکھا۔ میں نے اس مولوی سے زیادہ مندرست آڈیٹو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرہ جوانی کے جوش سے دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں صحت کا خمار تھا۔ جسم بھرا بھرا اور داڑھی چھوٹی چھوٹی تھی۔

”مولانا“ میں نے احترام سے کہا۔ میں مسلمان ہوں۔ دل و جان سے آپ کی قدر کرتا ہوں، لیکن میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ کبھی مجھے ناخوشگوار باتیں بھی کرنی پڑتی ہیں۔ میں آپ سے پیشگی معافی مانگ لیتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ میں جو پوچھوں وہ سوچ کر اور بالکل سچ بتائیں، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ قانون کا معاملہ ہے۔ آپ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ آپ کا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

اُس نے آنکھیں بند کر کے محذور لہجے میں کہا۔ ”پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ تم دنیا کے قانون کی بات کرتے ہو، ہم خدا کے قانون کے غلام ہیں۔“

”سنا ہے آپ کے لوٹے نے ایک چور پکڑا ہے۔“

”ہاں!“ اُس نے خمار کے لہجے میں کہا۔ ”وہ ایک عورت ہے۔“

”کیا یہ عورت انسان ہے؟“

”تو کیا تم اُسے گدھی سمجھتے ہو؟“ اُس نے جواب دیا۔

”نہیں حضور!“ میں نے غلاموں کے لہجے میں کہا۔ ”گدھی تو نہیں سمجھتا، یہ عورت مجھے جنن یا بدروح معلوم ہوتی ہے یا اس پر جنن یا بدروح کا قبضہ ہے۔ آپ خدا کے برگزیدہ انسان ہیں۔ غیب سے آپ کو اشارے ملتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عورت عورت ہی ہے یا کوئی بشر شرار ہے۔“

”تمہیں یہ شک کیوں ہوا ہے؟“

”اس لیے حضور انور! میں نے جواب دیا۔ ”کہ یہ تو عورت ذات ہے کوئی پیشہ در اور استاد چور بھی اس طرح چوری نہیں کر سکتا جس طرح اس عورت نے کی ہے۔ وہ اس طرح آئی کہ کسی کو نظر نہیں آئی۔ اس نے زیورات والے ٹرنک کے اوپر سے نہ ٹرنک اتارا نہ سوٹ کیس اتارے نہ ٹرنک کا تالا کھولا اور سونے کا ہار لے گئی۔ اسے شاید صرف ہار پند تھا۔ یہ کسی عورت کی بدروح معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سنا ہے کبھی کبھار کوئی چڑیل یا بدروح یا جنن کسی آدمی پر عاشق ہو جاتا ہے اور عورت کے روپ میں آکر اُس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ یہ عورت ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔“

”تم اسے بلا کر گرفتاری کی دھمکی دو۔“ اُس نے پہلے کی طرح خمار کا لود آواز میں کہا۔ ”پھر میں اسے اپنے گھر بلا کر دیکھوں گا کہ اصل میں کیا ہے۔“

”مولانا عالی مقام!“ میں نے جاہل مریدوں کی طرح پوچھا۔ ”اس

میں نے آگے جھک کر اُسے دھیمی آواز میں کہا — ”ہوش میں آؤ مولوی صاحب ابیں مسلمان ہوں۔ آپ کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ مجھے گستاخی کا موقع نہیں“۔

”میں لوٹے کے عمل کی بات کر رہا ہوں۔“

”جہاں ہتھکڑیوں کی مسمریزم چلتی ہے وہاں لوٹے کا جادو نہیں چل سکتا۔“ میں نے تھانیداروں کی طرح کہا — ”مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا تھا کہ یہ عورت بھی مشتہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لوٹے کے عمل کے لیے انہیں بلا لیا جاتا ہے جن پر شک ہوتا ہے شک کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ آپ سارے مجھے کہ تو لوٹے کے گرد جمع نہیں کر سکتے اس عورت پر آپ نے شک کیا تھا۔ شک کی کیا وجہ تھی؟“

”مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔“ اُس نے جواب دیا — ”اس میں مجھے کچھ راز معلوم ہو جاتے ہیں۔“

”میرے پاس چوری چکاری کے چار پانچ کیس ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لڑموں کا پتہ نہیں چل رہا۔ آپ جیسی بھی خدمت کہیں گے کروں گا لڑموں کی نشاندہی کر دیں۔ آپ کو غیب کے اشارے ملتے ہیں اور آپ پر کیفیت بھی طاری ہوتی ہے جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔“

## خمار اتر گیا

وہ اب خمار والی کیفیت سے بیدار ہو چکا تھا۔ اُس کے چہرے

گھروالوں کو اس عورت پر شک نہیں تھا۔ آپ اپنا لوٹا لے کر آئے اور کہا کہ اس عورت کو بھی بلاؤ۔ اگر حضور کے مزاج مقدس پر گراں نہ گزرے تو اس ناچیز بندے کو بتا سکتے ہیں کہ جناب کو اس عورت پر کیوں شک ہوا تھا؟ اگر یہ ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ ہمیں اس گناہگار پر کس طرح اور کیوں شک ہوا تھا تو ہم میں اور تم جیسے عام بندوں میں فرق کیا رہ جائے؟ غیب کے اشارے ہر کسی کو نہیں ملا کرتے۔“ وہ اب اس طرح بول رہا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

”حضور والا۔“ میں نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے اس عورت کو بھی غیب سے اشارہ ملا تھا کہ فلاں طرح لیتے سے چوری کر دو۔“

”یہ گناہگار عورت ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”گناہگاروں کو اشارے نہیں ملا کرتے۔“

”پھر عالی جاہ!۔“ میں نے کہا۔ ”اس عورت نے چوری بھی نہیں کی۔“

”میرا لوٹا جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ اُس نے آواز میں رعب پیدا کر کے کہا۔ ”خدا کے کاموں میں دخل نہ دو۔“

”قابلِ صدا احترام مولانا!۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا لوٹا جھوٹ نہیں بول سکتا، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“

اُس نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے کسی نے اُسے نیچے سے سوئی چھو دی ہو۔ اُس کے گندمی گالوں پر مرنجی آگئی۔

کارنگ بدل گیا تھا۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ لوٹے کو ایک لڑکا دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھتا ہے۔ بعض عامل لوٹے کو خود تھام کر رکھتے ہیں۔ اس مولوی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اُس نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے ایک لڑکے کو لوٹے پر ہاتھ رکھنے اور پرچی ڈالنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ میں نے ڈسپنسر کو اندر بلا کر کہا کہ وہ اس لڑکے کو بلا لائے۔ مولوی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

”لوٹا جب گھوما تھا تو آپ نے اس عورت سے کچھ کہا تھا؟“ میں نے مولوی سے پوچھا۔ ”مجھے تفصیل سے بتائیں کہ اس کے ساتھ آپ نے یا ڈسپنسر نے کیا سلوک کیا تھا“

”میرا خیال ہے کہ آپ لوٹے کے عمل کو نہیں مانتے۔“ مولوی نے کہا۔ اس کے لہجے میں اب بناوٹ نہیں تھی۔ کہنے لگا۔ ”میں نے اپنی طرف سے تو اس پر چوری کا الزام نہیں لگایا میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں کوئی دشمنی نہیں“

اس قسم کی باتیں کر کے وہ مجھے اپنے خلاف شک میں ڈال رہا تھا۔ میں پوچھ کچھ اور رہا تھا۔

”میں نے جو بات پوچھی ہے وہ بتائیں۔“ میں نے اُسے کہا۔

”میں نے سب کو کہ دیا کہ چوری اسی عورت نے کی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”ڈسپنسر نے اُسے سب کے سامنے کہا کہ وہ مال دے دے۔ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ وہ غصے میں آگئی۔ قسمیں کھانے لگی۔“

”مولوی صاحب! میں نے کہا۔“ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ زبان

سے بات نکالنے سے پہلے کئی بار سوچ لیں۔ آپ کے الفاظ آپ کے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ آپ نے اس عورت کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے گواہ بھی موجود ہیں۔“

میں نے اُسے یہ بات کچھ سوچ کر کہی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ایک خاص قسم کا رد عمل صاف نظر آیا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ مولوی اور ڈسپنسر نے اس عورت کے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے اور اس کا کوئی گواہ بھی ہے یا نہیں۔ مولوی کے چہرے کے تاثر کی تبدیلی نے میرا شک پختہ کر دیا۔

”مولوی صاحب! میں نے اُس کی پوری بات سُنے بغیر کہا۔“

”آپ ان لوگوں کے امام ہیں۔ میں بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں کسی وقت آپ کو تھانے بلاؤں گا اور آپ کا بیان لوں گا۔ گہرانے کی منوروت نہیں آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس عورت نے چوری نہیں کی؟“ اُس نے پوچھا۔ ”آپ اسے تھانے نہیں بلائیں گے؟“

”میں ابھی بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر آپ لوگ خود ہی کوئی تصفیہ کر لیں تو بہتر ہوگا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کسی مسلمان کی سب سے خرابی نہ ہو۔“

میرا مقصد دراصل کچھ اور تھا۔ اتنے میں وہ لڑکا آگیا جسے لوٹے کے عمل میں استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے مولوی سے پوچھا کہ یہی لڑکا تھا؟ وہ معلوم

نہیں کیا کہنا چاہتا تھا مگر زبان ہلکا گئی۔

میں اس واردات پر غور کرنے کے لیے تھانے جانے کے لیے اٹھا۔  
 رٹکے سے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھانے چلے۔ رٹکے کا رنگ پلٹا پڑ گیا۔ وہ بار  
 بار مولوی کی حرمت دیکھتا تھا۔

میں باہر نکلا تو رٹکے کا باپ میرے کانٹیل کے پاس کھڑا تھا۔ اُس  
 نے مجھے جھک کر سلام کیا اور بولا ”صنور! یہ میرا بچہ ہے۔ اسے صنور نے  
 کیوں بلایا ہے؟“

رٹکے کو دیکھا۔ غرت نے اُس کا چہرہ سفید کر دیا تھا اور اُس کی آنکھوں  
 میں آنسو تھے۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُس کے باپ سے کہا کہ  
 وہ بھی اپنے بچے کے ساتھ تھانے چلا چلے۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

## قصہ رٹکے اور لوٹے کا

پولیس اور تھانے کی دہشت سے جو نوگ واقعت ہیں اس کے اثرات کو  
 وہی بیان کر سکتے ہیں۔ میں نے مولوی کو وقتی طور پر فارغ کر دیا۔ ڈسپنس کو بھی  
 ساتھ نہ لیا۔ رٹکے اور اس کے باپ کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔ باپ کی  
 حالت بہت بُری ہو گئی تھی۔ میری تسلیوں اور حوصلہ افزائی کا اُس پر کچھ اثر نہیں  
 ہو رہا تھا۔ میں نے خیزوں کو بلانے کا انتظام کیا، پھر رٹکے اور اس کے باپ کو  
 اپنے دفتر میں بلا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

”بیٹا!۔ میں نے رٹکے سے کہا۔“ میں جو پوچھوں بالکل صحیح بتانا  
 ورنہ اس تھانے سے نکل کر نہیں جاسکو گے۔“  
 ”بالکل صحیح بتانا اوٹے!“ باپ نے بیٹے سے کہا۔ ”خان صاحب  
 کے آگے جھوٹ نہ بولنا۔“

”لوٹنا اپنے آپ گھوما تھا؟“ میں نے رٹکے سے پوچھا۔  
 رٹکے نے ادھر ادھر دیکھا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ باپ  
 کی حوصلہ افزائی سے اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”نہیں جی۔ لوٹنا اپنے  
 آپ نہیں گھوما تھا.... میں نے گھمایا تھا۔“  
 ”کیوں؟“

”مولوی صاحب نے کہا تھا۔“ رٹکے نے جواب دیا اور اُس کے  
 آنسو بہنے لگے۔ میں نے اُسے تسلی دلا سہ دیا۔ پانی منگو کر اُسے پلایا۔  
 ”ڈرو نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تمہیں کچھ نہیں  
 کہا جائے گا۔“

بڑی مشکل سے اُس سے پوری بات سنی۔ کچھ جرح کی اور یہ ڈراما سننے  
 آیا کہ یہ رٹکا مولوی سے مسجد میں قرآن پڑھنے جاتا تھا۔ ایک روز مولوی نے  
 اسے کہا کہ وہ ایک گھر میں لوٹے کے عمل کے لیے جا رہا ہے۔ اس میں وہ اس  
 رٹکے کو استعمال کرے گا۔ رٹکے کی ڈیوٹی یہ بتائی کہ وہ لوٹے کو دائیں بائیں  
 سے دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھے گا۔ مولوی اُسے ایک ایک پرچی دے  
 گا جو وہ لوٹے میں ڈالے گا۔ پھر رٹکا لوٹا اٹھا کر کے پرچی باہر پھینک دے گا۔

مولوی اُسے اگلی پرچی دے گا اور لڑکا وہی عمل دہرائے گا۔ مولوی نے اسے بتایا کہ ہر پرچی لوٹے میں ڈالنے کے لیے مولوی کے ہاتھ سے لیتے وقت وہ مولوی کی طرف دیکھئے گا۔ کوئی ایک پرچی لڑکے کو دے کر مولوی اپنی آنکھیں بند کر کے کھولے گا۔ یہ پرچی لوٹے میں ڈال کر لڑکا لوٹے کو اتنا گھا دے گا کہ ہر کسی کو لوٹے کی حرکت نظر آ جائے۔

مولوی نے لڑکے کو اس کام کے چار آنے دیئے۔ لوٹا گھمانے کی رہبر سل کرائی اور ایک روز اُسے ڈپینسر کے گھر لے گیا۔ وہاں پانچ چھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مولوی نے جاتے ہی کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور اوٹ پٹانگ سے جوتیاں کر کے کہا کہ ایک انسان کم ہے۔ اُس نے عجیب طریقے سے ایک گھر کی سمت اور نشانیاں بتا کر کہا کہ اس عورت کو بلایا جائے۔

وہ عورت آگئی۔ مولوی نے لوٹا فرش پر رکھ کر لڑکے کو بتایا کہ لوٹے کو کس طرح پکڑنے۔ لڑکے نے لوٹے کے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ لیے۔ مولوی نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر ہر ایک عورت سے نام پوچھ کر پرجوں پر لکھ لیے۔ پھر ایک ایک پرچی لڑکے کے ہاتھ میں دینے اور اُسے لوٹے میں ڈالنے کے لیے کہنے لگا۔

لڑکا ہر پرچی لیتے وقت مولوی کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تھا۔ آخر ایک پرچی لڑکے کے ہاتھ میں دے کر مولوی نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ لڑکے نے پرچی لوٹے میں ڈالی اور دونوں ہاتھ لوٹے کے پہلوؤں پر رکھ کر لوٹے کو گھما دیا۔ سب نے لوٹے کی یہ حرکت دیکھی۔ مولوی نے لوٹے سے پرچی نکال کر نام

پڑھا۔ یہ اُس عورت کا نام تھا جسے مولوی نے بلایا تھا۔ یہ عورت شوہر جانے لگی کہ میں نے کسی کی چوری نہیں کی۔ یہ جھوٹا الزام ہے۔

مولوی نے اُسے کہا کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس نے اُس کا جرم ثابت کیا ہے۔ ڈپینسر نے اُسے کہا کہ وہ مار اور روپے واپس کر دے۔ عورت رونے لگی۔ مولوی نے اسے کہا کہ نہادھو کر مسجد میں آجانا اور وہاں بتانا کہ تم نے چوری نہیں کی۔ عورت نے کہا کہ میں نہیں آؤں گی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی کہ میں دیکھتی ہوں کہ کون مجھے چور کہتا ہے۔

لڑکے کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اُسے اور اُس کے باپ سے کہا کہ وہ گھر چلے جائیں اور کسی سے ذکر نہ کریں کہ انہوں نے مجھے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ لڑکے سے کہا کہ مولوی اس سے ضرور پوچھے گا۔ اُسے یہ بتانا کہ تم نے مجھے اصل بات نہیں بتائی۔ باپ کو کچھ اور ہدایات دے کر دونوں کو گھر بھیج دیا۔

مجھے یہی شک تھا جس کی تصدیق اس لڑکے نے کر دی۔ مولوی بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی محتا نیدار کی آنکھوں میں وصول نہیں جھونک سکتا۔ میں نے ایسے کئی مولوی، عامل، پیر، جوگی، پنڈت، سنیا سی اور سادھو دیکھے تھے۔ پولیس والے ان کی اصلیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس مولوی نے پہلا محتا نیدار دیکھا تھا۔ یہاں میں اتنی سی بات کہوں گا کہ عوام الناس کو اس مقصد کے لیے گنوار اور اُن پڑھ رکھا جاتا ہے کہ اُنہیں اُتو بنا کر اپنا اُتو سیدھا کیا جائے۔ مذہبی راہنما بھی یہی کہتے ہیں اور سیاسی راہنما بھی یہی کہتے ہیں۔

لہذا یہ مولوی میر سے لیے کوئی عجیب و غریب چیز نہیں تھی۔

مجھے اب یہ دیکھنا تھا کہ مولوی کی نیت کیا تھی۔ کیا وہ اس عورت کو بیکار کرنا چاہتا تھا؟ کیا ڈسپنسر بھی بلیک میلنگ میں شامل ہے؟ اور کیا بار اور نقدی چوری ہوئی بھی ہے یا نہیں؟ یہ واضح ہو کر میر سے سامنے آنے لگا کہ چوری نہیں ہوئی۔ اگر چوری ہوئی ہوتی تو تمام زیورات جاتے۔ قرآن میں بتا رہے تھے کہ مولوی اور ڈسپنسر نے اس عورت کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس جرم کے پورے پورے وغیرہ کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ طریقہ صحیح نہیں تھا کہ میں ان دونوں سے پوچھ گچھ کرتا بلکہ انہیں یہ تاثر دینا تھا کہ مجھے ان پر کوئی ایسا ویسا شک نہیں اور میری توجہ صرف چوری پر ہے۔

مجھے عقل مند قسم کے مجبوروں کی ضرورت تھی۔ میں نے مگر بلا رکھے تھے۔

## حسن اور غربت

شام کو بسول ہسپتال کا ڈاکٹر آگیا۔ ڈسپنسر اسی ہسپتال میں ملازم تھا۔ اُس نے ڈسپنسر کے کیس کی سفارش کی اور کہا کہ ڈسپنسر نے شکایت کی ہے کہ میں چوری کا مال برآمد کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا۔ ڈاکٹر میر سے ساتھ باتیں کر رہی رہا تھا کہ تحصیلدار آگیا۔ ڈسپنسر کا بیٹا تحصیل کے دفتر میں ملازم تھا۔ اس نے تحصیلدار سے کہا تھا کہ میں تفتیش میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ وہ بھی سفارش

لے کر آیا تھا۔ دونوں کے میر سے ساتھ تعلقات اچھے تھے۔

میں نے انہیں بتایا کہ آج کی تفتیش میں میر سے سامنے کیا آیا ہے مولوی اور اُس کے لوٹے کے متعلق انہیں بتاتے مجھے بہت شرم محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ دونوں ہندو تھے۔ ہندو خود تو ہم پرستی کی ماری ہوئی قوم ہے لیکن مسلمانوں کی کمزوریوں اور مضحکہ خیز توہمات کا ہندو مذاق اڑاتے ہیں۔ اس ہندو ڈاکٹر اور تحصیلدار نے بھی مولوی کا مذاق اڑایا جو دراصل اسلام پر طنز تھی۔ بہر حال وہ میر سے ہمنوا ہو گئے۔

”یہ ڈسپنسر عادات اور اخلاق کا کیسا ہے؟“ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”کھڑے مسلمان ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”بدمزاج اور خبطی ہے۔ اگر مجھے اُس کی دوجوان بیٹیوں کا خیال نہ ہوتا تو میں اسے نوکری سے نکلوا دیتا۔“

میں نے ڈسپنسر کے بیٹے کے متعلق تحصیلدار سے پوچھا۔ تحصیلدار کوئی رائے نہ دے سکا کیونکہ یہ آدمی اُس کے دفتر میں معمولی سا کلرک تھا۔ تحصیلدار اُسے اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر گپ شپ لگا کر یہ دونوں چلے گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد میر سے بلاٹے ہوئے مگر آنے لگے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔

پہلے سُنائی ہوئی کہانیوں میں آپ کو میں نے مگر عورتوں کے متعلق تفتیش سے بتایا ہے کہ یہ کون ہوتی ہیں، کہاں سے آتی ہیں اور کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ اتفاق سے میری یہ مگر عورت ڈسپنسر کے محلے کی رہنے والی تھی اور مسلمان تھی۔ میں نے ان مگرؤں کو اس واردات میں ملوث افراد کے کردار وغیرہ کے متعلق

زیادہ سے زیادہ معلومات لانے کو کہا۔ مجھ چلے گئے تو میں نے مجھ عورت سے کہا کہ وہ اُس عورت کے متعلق معلوم کرے جس کے نام پر مولوی نے لڑکھایا تھا۔ اس کے علاوہ ڈسپنسر کی دونوں بینٹیوں کے کردار اور عادات سے مجھے واقفیت حاصل کرنی تھی۔ یہ لڑکیاں بڑے سخت پردے میں تھیں لیکن میں نے پردے پردے میں کچھ ڈرامے دیکھے تھے۔ یہاں مجھ سے مجھے ایسا ہی شک تھا۔ مشتبہ عورت کے متعلق تو مجھ عورت نے اُسی دن بتا دیا کہ شریف عورت ہے۔ البتہ اُس کی دو کمزوریاں ہیں۔ ایک یہ کہ ٹولہ ہے اور دوسری یہ کہ غریب ہے۔

میں نہانے اور کچھ کھانے پینے کے لیے اپنے کو ارٹریٹر چلا گیا۔

رات کے غالباً دس بج رہے تھے کہ ایک کانٹیل نے آکر بتایا ایک آدمی آیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ بتا نہیں رہا تھا کہ کام کیسے ہے۔ میں نے اُسے اپنے کو ارٹریٹر میں ہی بلا لیا۔ وہ غریب سا آدمی تھا بیمار تھا۔ میرے سامنے آکر فرشی سلام کرنے لگا۔ میں نے اُسے بٹھایا۔

اُس نے بتایا کہ وہ اُس عورت کا خاوند ہے جس کے نام پر لڑنا لگا تھا۔ بات شروع کرتے ہی وہ رو پڑا۔ میں نے اُس کے ساتھ مشفقانہ سلوک کیا، جو صلہ افزائی کی اور جہدِ رومی سے اُس کی بات سنی جو مختصر ایوں تھی کہ چند دن ہوئے ڈسپنسر اُس کے گھر گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کا ہار اور تین سو روپے چوری ہو گیا ہے اور مولوی صاحب نے لڑنا گھمایا ہے۔ لڑنا اس آدمی کی بیوی

کے نام پر گھوما ہے۔ ڈسپنسر نے اُسے کہا کہ وہ مال واپس کر دے۔ یہ آدمی بہت گھبرا یا۔ اُسے اپنی بیوی سے اس قسم کے جرم کی توقع نہیں تھی۔ بیوی نے اُسے بتایا ہی نہیں تھا کہ اُس پر شک کیا گیا ہے۔ ڈسپنسر کو نصحت کر کے اُس نے بیوی سے پوچھا۔ بیوی نے بتا دیا اور قسمیں کھائیں کہ اُس نے چوری نہیں کی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی ڈسپنسر کے گھر کبھی کبھار جاتی ہے لیکن تعلقات گہرے نہیں۔ محض دنیا دارنی کامیل جول ہے۔ اُسی شام مولوی نے اس آدمی کو اپنے ہاں بلا کر وہی بات کہی جو ڈسپنسر نے کہی تھی۔ مولوی نے یہ بھی کہا۔ ”اپنی بیوی کو میرے پاس بھیج دو، میں سب ٹھیک کر لوں گا“

مولوی کا چونکہ تقدس اس آدمی پر بھی طاری تھا، اس لیے وہ مان گیا کہ اُس کی بیوی نے چوری کی ہے۔ اس شخص کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہار اور نقدی رکھے کہاں تھے اور کیا یہ چوری ممکن بھی تھی یا نہیں۔ اس کی عقل اور اعصاب پر ڈسپنسر کی دھمکیاں، مولوی کا تقدس اور اُس کا لوٹنا سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے گھر جا کر بیوی کو پٹیا اور اُسے کہا کہ وہ مولوی کے پاس جائے۔ بیوی نے انکار کر دیا۔ اس سے خافد مذکے دل میں شک پختہ ہو گیا کہ اُس کی بیوی چور ہے۔ اُس نے بیوی پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ مولوی کے پاس جائے۔ تب بیوی نے اُسے بتایا کہ وہ کس نیت سے اُسے بلارہا ہے۔ کوئی ایک ماہ پہلے کا ذکر ہے (اسے بیوی نے بتایا کہ) بیوی ایک جمعرات مولوی کو روٹی دینے گئی۔ اس سے پہلے بھی یہ عورت مسجد میں روٹی بٹھیکا کرتی تھی۔



## قانون غریبوں کے لیے

اس سے آگے جو کچھ ہوا وہ میں آپ کو مناجا چکا ہوں۔ عورت کے خاوند کو اتنا صدمہ ہوا کہ اس کی صحت پہلے ہی ٹھکرائی ہوئی تھی، اُسے بخمار آنے لگا۔ ڈسپنسر اُسے کہہ رہا تھا کہ اپنی بیوی سے کہو کہ چرنی کا مال واپس کر دے۔ خاوند بیمار ہو تو ہول ہسپتال گیا۔ ڈاکٹر نے جو نسخہ لکھا وہ اسی ڈسپنسر نے بنایا۔ ڈسپنسر اس پر کچھ مہربان ہو گیا۔ دوائی بھر دی سے دی اور دو ستانہ لےجے ہیں کہا کہ وہ بار اور نقدی واپس کر دے۔ یہ آدمی اُس کی منت سماجت کرتا رہا۔ آخر یہ دن آیا کہ ڈسپنسر نے تنہا نے رپورٹ دی اور میں اُس کے گھر گیا کسی کے گھر پولیس کا جانا بہت بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ اس آدمی کو بھی پتہ چل گیا کہ ڈسپنسر کے گھر پولیس آتی ہوئی ہے۔

اُس نے مجھے بتایا کہ میرے وہاں سے آنے کے بعد ڈسپنسر اُس کے گھر گیا اور اُسے کہا — ”میں نے تمہاری بیوی کا نام لکھوا دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے، مال دے دو، ورنہ کل تمہاری بیوی حوالات میں بند ہوگی۔“ مولوی نے بھی ایسی ہی دھمکی دی۔

”جناب عالی! — اس آدمی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔“ خدا کے سوا میرا کوئی نہیں۔ اگر آپ میری بیوی کو حوالات میں بند کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی جگہ مجھے گرفتار کر لیں۔ میں جانتا ہوں آپ مولوی صاحب کے

کسی کے ہاتھ بھیج دیتی تھی۔ خاوند بھی لے جاتا تھا لیکن اُس روز خاوند گھر نہیں تھا۔ کوئی دوسرا بھی نہ ملا۔ وہ خود چلی گئی۔ مولوی نے اُسے اپنے حجرے میں بٹھا کر آڑا رکھ کر ”دم درو درو کیا۔ عورت متاثر ہوئی۔ مولوی نے پھر بلایا۔ وہ دو تین بار گئی۔

ایک روز مولوی نے ایسی حرکتیں کیں جس نے عورت کے دل میں ولولہ کے تقدس اور احترام کو مجروح کر دیا۔ یہ اُن عورتوں میں سے تھی جو اپنے خاوندوں کو خدا سمجھتی اور عصمت پر جان قربان کر دیتی ہیں۔ اُس نے ولولہ کے پاس جانا چھوڑ دیا مگر مولوی نے اُس کے گھر آنا شروع کر دیا۔ مولوی کو گھر میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ شیخص عام قسم کا ملا نہیں، عامل اور غیب کے اشارے پانے والا بزرگ زیدہ مولانا تھا۔ بیوی اُس کے جمال میں نہ لگا اُس نے اپنے خاوند کو صرف اس لیے نہ بتایا کہ وہ پریشان ہوگا۔ ایک روز اس عورت نے تقدس اور احترام کو الگ پھینک دیا اور مولوی کی بے عزتی کر دی۔

اس سے دو تین روز بعد مولوی خاوند کی غیر حاضری میں عورت کے گھر گیا اور اُسے کہا کہ آج آخری روز ہے۔ کل جو کچھ ہوگا اس کا جگہ مجھ سے نہ کرنا۔ عورت یہ اشارہ نہ سمجھ سکی۔ اُس نے مولوی کو ایک بار پھر دھتکار دیا دوسرے دن اُسے ڈسپنسر کے گھر بلایا گیا۔ وہ چلی گئی۔ آگے مولوی اور سات آٹھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ درمیان میں لوٹا رکھا تھا جو کہ ایک لڑکے نے کپا رکھا تھا۔

خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ قانون ہم جیسے غریبوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگر آپ کے دل میں رحم آجائے تو میری بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ لیں۔“ مولوی کے خلاف مجھے شہادت مل چکی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مولوی کے ساتھ میری ملاقات ہوئی اور میں اُس کا مرید بن کر اُس کے ساتھ بائیں کر رہا تھا تو اُس نے مجھے کہا تھا۔ تم اسے دھکی دو، پھر میں اُس کے ساتھ بات کروں گا۔“ وہ اس عورت کو پھانسنے کے لیے اور اُس سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

مجھے چونکہ مولوی کے خلاف رٹ کے سے شہادت مل چکی تھی اس لیے میں نے اس عورت کے خاوند کے بیان کو فوراً سچ مان لیا۔ اُس نے جس طرح رورو کر مجھے یہ واقعہ سنایا کوئی پتھر دل ہوتا تو اُس کے بھی آنسو نکل آتے۔ اُس نے بعض باتیں جذباتی انداز سے کہیں۔

میں کچھ دیر کے لیے بھول گیا کہ میں تھانیدار ہوں۔ مجھے ذرا محتاط ہونا چاہیے تھا مگر میں بھی حیدر باقی ہو گیا اور اُسے بتا دیا کہ اُس کی بیوی کے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت نہیں مولوی کے متعلق میں نے اسے بتایا کہ وہ مولوی ہرگز نہیں، کیونکہ نو سر باز ہے جس نے مسجد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ میں مولوی کو گرفتار کروں گا۔ میرے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ مجھے شک ہے کہ ڈسپنسر کے گھر چوری ہوئی ہی نہیں۔

مجھے یہ خیال آ گیا کہ اس آدمی کے بیان کی تصدیق کے لیے اس کی بیوی سے ملنا ضروری ہے۔ میں اپنے پرائیویٹ کپڑوں میں اُس کے ساتھ اُس کے

گھر چلا گیا۔ اُس کی بیوی کو تھانے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے جب لالٹین کی روشنی میں اُسے اُس کے گھر میں دیکھا تو اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ اگر خاوند نے تسلی نہ دے دیتا کہ میں اُسے گرفتار نہیں کروں گا تو وہ بے ہوش ہو جاتی۔ وہ واقعی خوبصورت عورت تھی اور جوان بھی تھی۔ اُس کا خاوند چھوٹی سی دکان کرتا تھا۔ گھر میں اگر غربت نہیں تو فارغ البالی بھی نہیں تھی۔

میں نے خاوند کو الگ کر کے اس عورت کی بات سنی، اور اپنے تنکوں کو رفع کرنے کے لیے کچھ باتیں پوچھیں۔ ان سے اُس کے خاوند کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ اس دوران اُس کے آنسو بہتے رہے۔

بہت اچھے کردار کی عورت تھی۔ ڈسپنسر اُسے مسلسل دھمکیاں دے رہا تھا اور مولوی اپنا جال پھینک رہا تھا۔ پیمانہ اور بے علم انسان کی عقیدت بڑی سخت ہوتی ہے۔ یہ عورت اپنا دامن تو بچا رہی تھی لیکن ڈرتی بھی تھی کہ مولوی مذہبی پیشوا ہے جس کی بے ادبی گناہ ہے۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ اُس پر پولیس اور گرفتاری کا خوف تھا۔ میں نے اُس کے دل سے دونوں خوف نکالنے کی جہد روانہ کر دی۔ یہ میاں بیوی تنکوں کے سہارے تلاش کر رہے تھے۔ میرے حیدر باقی سہارے نے انہیں سنبھالا دیا۔

میں مولوی اور ڈسپنسر کو نمونہ نہیں چاہتا تھا لیکن میرے سامنے واردات کچھ اور تھی۔ یہ سونے کے ایک ہار اور نقدی کی چوری کی رپورٹ تھی۔ مجھے اس کی تفتیش کرنی تھی اور مجرموں کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا تھا۔ مولوی جس طرح

اس عورت کو بیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی میرے پاس کوئی باقاعدہ رپورٹ نہیں تھی۔ تاہم اس شخص کو میں قانون کے شکنجے میں لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس عورت اور اس کے خاوند کو کچھ باتیں بتائیں اور کہا کہ وہ ابھی زبانیں بند رکھیں۔ اور میں تجھانے چلا گیا۔

## اگر دو گھنٹے زندہ رہ سکا

میں اب اس لائن پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ کوئی چوری نہیں ہوئی اور یہ ڈھونگ اس عورت کو خراب کرنے کے لیے بچایا گیا ہے۔ میں یہ بھی سوچنے لگا کہ اگر چوری کی رپورٹ جھوٹی ہوئی تو میں کیا کروں گا۔

میں نے میاں بیوی کی مظلومیت، غربت اور بے بسی سے متاثر ہو کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھا اور انہیں اپنی حمایت کا یقین منوریت سے زیادہ دلا آیا۔ میں نے یہ نہ سوچا کہ یہ دونوں مظلوم ہیں اور بلیک میننگ کا شکار تو ہو رہے ہیں لیکن یہ دونوں ذہنی طور پر ان باتوں کو دل میں دبا کر رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے جو میں انہیں بتا آیا ہوں۔

اس کا نتیجہ دوسرے دن سامنے آ گیا۔ دن کے دس گیارہ بجے ہوں گے کہ یہ عورت دوڑتی تجھانے میں آئی۔ اُس کے ساتھ اُس کے پڑوس کا ایک آدمی تھا۔ عورت نے بتایا کہ اُس کا خاوند بیمار ہے اور کئی دنوں سے سرکاری ہسپتال سے دوائی لے رہا ہے۔ دوائی ہی ڈسپنسر بتاتا ہے۔

اُس نے بتایا کہ آج صبح اُس کا خاوند دوائی لے کر آیا تو اُس نے بیوی کو بتایا کہ آج ڈسپنسر کے ساتھ شدید جھڑپ ہو گئی ہے۔ خاوند نے بتایا کہ میں دوائی لینے اُس کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا تو ڈسپنسر نے کہا کہ ادھے، تم چوری کا مال سیدھے طریقے سے واپس کرو گے یا نہیں تم جانتے ہو کہ میں تجھانے میں رپورٹ کر چکا ہوں۔ اگر آج مجھے مال نہ ملا تو گرفتار کر دوں گا.... میں نے اُسے کہا کہ تجھانیدار مجھے نہیں تمہیں اور تمہارے مولوی کو گرفتار کرے گا۔ تجھانیدار رات ہمارے گھر آیا تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے اُسے بتا دیا ہے کہ تم اور مولوی کیوں میری بیوی پر شک کرتے ہو۔

مختصر یہ کہ اس آدمی نے ڈسپنسر کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو میں نے اُسے کہی تھیں۔ اُس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ خاوند نے اُسے یہ بات سنا کر دوائی کی پہلی خوراک پی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے الگائیاں آنے لگیں اور اس کے بعد اُسے قے آئی۔ پھر قے میں خون آنے لگا۔

اُس کی بیوی کو شک ہو کہ ڈسپنسر نے اُسے دانستہ زہریلی دوائی دے دی ہے۔ وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی۔ مجھے بھی یہی شک ہو کہ ڈسپنسر نے انتقامی کارروائی کی ہے۔ ہسپتال تجھانے سے دُور نہیں تھا میں نے اپنے اسے۔ ایس۔ آئی کو اس پیغام کے ساتھ ہسپتال کو دوڑایا کہ ڈاکٹر فوراً غلاں مجھے میں آجائے۔ ہو سکتا ہے ایک آدمی کا زہریلی بیان لینا پڑے۔ میں خود اس عورت کے ساتھ اُس کے گھر چلا گیا۔

اس محلے کا ایک آدمی تو عورت کے ساتھ تھا، میں نے وہاں سے

ایک اور آدمی کو گواہ کے طور پر ساتھ لے لیا۔ اس عورت کے خاوند کو دیکھا۔ وہ ایک بالٹی میں قے کر رہا تھا جس میں خون کی آمیزش تھی۔ دوائی کی شیشی پاس پڑی تھی جو میں نے قبضے میں لے لی۔ اس آدمی پر نیم بے ہوشی کی حالت طاری تھی میں نے اُس سے چند باتیں پوچھیں۔ وہ اچھی طرح بول نہیں سکتا تھا۔ ایک بات اُس نے یہ کہی۔ ”اُس ڈسپنسر نے مجھے کہا تھا تم چلتے پھرتے کسی کو نظر نہیں آؤ گے“

مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ شخص زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر آگیا۔ اُس نے مرین کا معائنہ کیا اور کہا کہ اسے فوراً ہسپتال لے چلو۔ اُس کی دوائی کی شیشی دیکھی۔ اسے ہلایا اور غور سے دیکھا۔ مجھے کہنے لگا کہ اس دوائی کا معائنہ ضروری ہے، ڈسپنسر کو آپ فوراً گرفتار کر لیں۔ مرین کو چارپائی پر ڈال کر چار آدمی ہسپتال لے گئے۔ میں نے ڈسپنسر کو اپنے ساتھ لے لیا اور اُسے کہا کہ وہ میری حراست میں ہے۔ ڈاکٹر مرین کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر باہر آیا اُس نے مجھے بتایا کہ مرین اگر دو گھنٹے زندہ رہا تو موت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ اُس نے ڈسپنسر سے پوچھا کہ یہ دوائی اسی نے مرین کو دی تھی؟ ڈسپنسر نے جواب دیا کہ اسی نے دی تھی۔

”اس میں کیا ڈالا تھا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ڈسپنسر خاموش رہا۔

”تم جانتے ہو کہ یہ دوائی کہاں بھیجی جائے گی“ ڈاکٹر نے کہا۔

”اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہاں تمہارا جرم صاف نظر آجائے گا۔“  
”میں نے کوئی جرم نہیں کیا“ ڈسپنسر نے کہا۔

ڈاکٹر نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے ڈسپنسر کو اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ تھانے جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اسے سوالات میں بند کر دو۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے اور ڈاکٹر نے شیشی کا اور مرین کی قے کے کچھ حصے کو ایک شیشی میں بند کر کے ایک پیکٹ بنایا۔ ڈاکٹر نے چھٹی لکھی۔ ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ پیکٹ اور چھٹی اُسے دے کر کہا کہ ایگز امینر کے پاس جائے اور رپورٹ لے کر آئے۔ اسے بذریعہ ریل گاڑی آئی میل ڈور جانا تھا۔

ڈاکٹر نے اپنی رائے یہ دی کہ ڈسپنسر نے دوائی میں ایک دوائی زیادہ مقدار میں ڈال دی ہے۔ مجھے اس دوائی کا نام یاد نہیں رہا۔ اس کے ایک یاد دہنے والے جاتے تھے۔ زیادہ مقدار کا یہی اثر تھا جو اس مرین پر ظاہر ہوا۔ نسخے میں ڈاکٹر نے یہ دوائی لکھی ہی نہیں تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ تیار کی۔ اس کی تصدیق یا تردید ایگز امینر کو کرنی تھی۔

## فرار کے راستے

میں تھانے گیا۔ ڈسپنسر سوالات میں بند تھا۔

”اقبالی بیان دو گے یا مقدمہ لڑو گے“ میں نے اُس سے پوچھا۔

”میری نصیحت پر عمل کرو گے تو شاید کچھ چھوٹ مل جائے۔ تم جرم کو چھپا نہیں

سکو گے۔

”اس آدمی نے مجھ پر جرابی حملہ کیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ پہلے ہی بیمار تھا۔ اُس کی تکلیف بڑھ گئی تو مجھ پر الزام عائد کر دیا کہ میں نے اُسے دوائی میں کچھ دے دیا ہے۔“

”تم دو چار دن اندر بیٹھے رہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ اچھی طرح سوچنے کے قابل ہو جاؤ گے۔“

مجھے دوائی کی رپورٹ کا بے تابی سے انتظار تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مولوی کو بھی اس واردات میں پھانسنوں۔ سوچ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ مولوی کو اعانت جرم میں پکڑا جا سکتا ہے۔ اُس کے خلاف شہادت موجود تھی۔ اُس نے ٹوٹا گھمانے میں دھوکہ دہی کا ارتکاب کیا تھا۔ اس شخص کے خلاف غصے سے میں اس قدر بھرا ہوا تھا کہ میں نے اُسے تھانے بلالیا اور اُس کمرے میں بند کر دیا جس میں ملازموں سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ وہ مذہب اور مسجد کی توہین کا مرتکب ہو رہا تھا اور وہ قرآن کی آیات پڑھ کر لوگوں کو دھوکہ دے رہا تھا۔ وہ بعد میں بری ہی ہو جاتا لیکن میں اسے رگڑا دینا چاہتا تھا۔

مجزر پوڑ میں لے کر آئے گئے گاؤں میں اور شہر کے کسی بھی محلے میں کسی کے گھر کی کوئی بات چھی نہیں رہتی۔ ہم لوگوں کی یہ عادت ہے کہ اپنی کرتوت سے دوسروں کی توجیہ پھانے کے لیے دوسروں کے متعلق ذرا سی بات کا تبت گد بناتے اور اسے مشہور کرتے ہیں۔ ہم سب میں دوسروں کے گھروں کی باتیں جاننے کا تجسس ہوتا ہے۔ کسی کا پردہ نہیں رہتا۔ دلوں میں چھپے ہوئے مجید بھی

باہر آجاتے ہیں۔ ان حالات میں مجزوں کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ مجزوں کی اپنی نظر بھی بہت دور تک اور تنوں کے پیچھے تک دیکھ سکتی ہے۔

ڈسپنسر کے متعلق مجزوں نے بتایا کہ بد مزاج اور غصیللا ہے۔ غصت میں اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ تو مجھے ڈاکٹر بھی بتا چکا تھا کہ یہ شخص بد مزاج ہے۔ مجزوں کی رپورٹ کے مطابق گھر میں وہ ظالم ڈکٹیٹر بنا رہتا ہے۔ جوان اولاد کی پٹائی کر دیتا ہے۔ بیوی کو مارتا پٹیتا ہے۔ مذہب اور پردے کا اتنا پابند کہ اُس کا بس چلے تو باہر کی ہوا کو بھی اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے۔ اُس کے گھر سے اُس کے سوا کسی اور فرد کی آواز کبھی نہیں سنائی دی۔ اس کے بڑے بیٹے کے متعلق بتایا گیا کہ اُس کا میل جول بدتمیز لوگوں سے ہے۔ گھروالوں سے چوری سگریٹ پیتا ہے۔ اُسے جو اُکھیلے بھی دیکھا گیا ہے۔ ایک مجز نے یہ بھی بتایا کہ وہ دفتر میں بھی جو اُچلا لیتا ہے۔ وہ تحصیل کے دفتر کا ملازم ہے جہاں کچھ بالائی آدنی بھی ہوتی تھی۔

اس پچیس سالہ جوان اور غیر شادی شدہ بیٹے کے متعلق یہ رپورٹ سن کر میں بالکل حیران نہیں ہوا۔ اب اس ٹرنک تو مجھے بہت تجربہ حاصل ہو چکا ہے، اُس وقت جب میں جوان تھا مجھے کتابوں نے کچھ بتایا تھا۔ ان کی روشنی میں یہ حیران کن نہیں تھا کہ جس باپ نے گھر میں ڈکٹیٹروں جیسا ڈسپنر قائم کر رکھا تھا اُس کا بیٹا جو سب سے باز ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن بچوں میں مجرمانہ رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں، وہ ایسے ہی ڈکٹیٹروں کے بچے ہوتے ہیں۔ اتنا تشدد اور اتنی کڑی پابندیاں جیسی اس باپ نے گھر میں روا رکھی ہوئی تھیں،

انسانی فطرت قبول نہیں کیا کرتی۔ حکم کے ساتھ پیار بھی ہو تو تربیت میں وہ انداز پیدا ہو جاتا ہے جو بچے کو متوازن شخصیت عطا کرتا ہے۔ اذیت اور اذیت کا ماحول سے انسانی فطرت فرار حاصل کرتی ہے۔ ڈسپنسر کا بڑا بیٹا اسی فرار کا مادہ ہو گیا تھا۔

اس سے چھوٹے بھائی کا ردِ عمل مختلف تھا۔ اُس کے متعلق بتایا گیا ہے اُس کا تو من ہی مارا گیا ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے بندروں کی طرح گونڈ پھلانگتے رہتے ہیں مگر یہ لڑکا چُپ چاپ رہتا تھا، معمولیوں کو کھیلتے دیکھتا تھا ان کے ساتھ کھیلتا نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر ہر وقت کوئی نواز طاری رہتا ہے۔ یہ دراصل دوسری قسم کا ردِ عمل تھا۔ بڑا بیٹا چوری چُپے آرا ہو گیا تھا اور اُس نے فرار کا مجرمانہ راستہ اختیار کر لیا تھا۔ چھوٹے بیٹے نے اپنی ذات کے اندر پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ یہ دونوں صورتیں خطرناک ہوتی ہیں۔ میں والدین کو یہ مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے بچوں کے دل و کلب کبھی نہ بنیں۔ انہیں کسی غلط حرکت سے روکیں تو گالیاں دینے یا مارنے پیٹنے کی بجائے انہیں بتائیں کہ یہ حرکت کیوں غلط ہے۔ انہیں خود بھی سچلا بڑا سوچنے کا موقع دیں اور انہیں سوچنے میں مدد دیں۔ تشدد آویز اور آمرانہ سلوک کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ آپ کسی تھانیدار سے پوچھیں میں آپ کو جو واردات سنا رہا ہوں اسے صرف تفریحِ طبع کے لیے نہ پڑھیں، اس سے کوئی سبق حاصل کریں۔

## ماں اور بیٹیاں

میری جو مخبر عورت تھی اُس نے ڈسپنسر کی بڑی بیٹی کے متعلق ایسی رپورٹ دی جو آپ کو چونکا دے گی۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ اتنی سخت پابندیوں اور پردے کی وجہ سے اُسے باہر کی ہوا بھی نہیں لگتی ہوگی مگر وہ کونٹوں کی عشق بازی کرتی تھی۔ آپ انسان کو قید کر سکتے ہیں اُس کے تصوروں کو زنجیریں نہیں ڈال سکتے۔

یہاں میں پھر وہی بات کہوں گا کہ انسانی فطرت آزادی پسند ہے۔ اسے قید میں جتنا ڈالو اس کی آزادی پسندی اتنی ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ پردہ دار لڑکیاں جنہیں ماں باپ برقعے میں بھی باہر نہیں نکلنے دیتے کونٹے پر چلی جاتی اور آزاد دنیا کو دیکھ لیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان سب کی نیت خراب ہوتی ہو۔ البتہ جن لڑکیوں کے باپ ڈسپنسر جیسے ہوتے ہیں وہ لڑکوں کی طرح کھچے ہوئے اعصاب اور گھٹن سے ذرا نجات حاصل کرنے کے لیے قید میں رہتے ہوئے بھی آزاد ہو جاتی ہیں۔ کونٹوں کی نظر بازی اور دُور دُور کی محبت اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ شہروں کے گنجان محلوں کے لوگ محبت کی اس نوعیت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ مخبر عورت نے بتایا کہ ڈسپنسر کے گھر کا بیت الخلاء کونٹے پر ہے۔ ڈسپنسر کی بڑی بیٹی دن میں دو تین بار اوپر جاتی ہے۔ چار پانچ گھنٹوں کے

ایک کوٹھے پر ایک نوجوان اُس کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے۔ دونوں فیسیوں کی اوٹ سے اشاروں میں جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس عورت نے دُشوق سے بتایا کہ کوشٹوں کے اوپر اوپر سے ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اُس نے ان ملاقاتوں کی تصدیق کرائی تھی۔ مجھے اس عورت پر اعتماد تھا۔ آسمان سے تارے توڑ لانے والی عورت تھی۔ اُس نے ڈسپنسر کی چھوڑ بیٹی کے متعلق صاف رپورٹ دی۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کی طرح دلی طور پر مڑوہ ہو گئی تھی۔

مجھے ایسی ہی رپورٹوں کی توقع تھی۔ معاملہ صاف تھا۔ بڑا بیٹا جوئے کا عادی ہو گیا تھا۔ بار اور نقدی کی چوری اُس کے کھاتے میں جاتی تھی۔ اگر آپ نفسیات کا مطالعہ کریں تو بڑے بیٹے کا نفسیاتی تجربہ آسان ہو جائے گا۔ اس قسم کے ماحول اور حالات کے پروردہ بچے پیسوں کے لالچ سے گھر میں چوری نہیں کیا کرتے بلکہ یہ اُن کی لاشعوری کارروائی ہوتی ہے جس میں ظاہر کے خلاف انتقام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ گھر سے چوری کر کے مال غنیمت کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ضبط ہوتا ہے جسے نفسیات کی زبان میں KLEPTOMANIA کہتے ہیں۔

میں اس شک میں حق بجانب تھا کہ بار اور نقدی کا چوری لڑکا ہے بڑی لڑکی پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ اگر واقعی ایک نوجوان اُس سے ملتا تو امکان تھا کہ لڑکی نے بار اور نقدی نکال کر لڑکے کو دے دی ہو لیکن میرا ذہن بڑے بیٹے سے ہٹتا نہیں تھا۔

ڈسپنسر حالات میں بند تھا۔ میں اُس کے گھر جا کر ہر کسی سے آسانی سے مل سکتا تھا۔ مجھے روک تو کوئی بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر ڈسپنسر آزاد ہوتا تو ہنگامہ بنا کر دیتا۔ میں نے ایک کانٹیل کو اُس کے بڑے بیٹے کی طرف اس پیغام کے ساتھ پہنچ دیا کہ وہ فوراً گھر پہنچے۔ مجھے معلوم تھا اور ہر تھانہ دار کو اپنے علاقے میں معلوم ہوتا ہے کہ عادی جوئے باز کون کون ہیں۔ میں نے اسے ایسے۔ ائی۔ سے کہا کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ چند دن پہلے ڈسپنسر کے بیٹے نے کوئی بڑی بازی لگائی تھی؟

میں ڈسپنسر کے گھر پہنچا۔ اُس کی بیوی میرے سامنے نہیں آ رہی تھی بڑی شکل سے سامنے آئی مگر اکیلے نہیں، اُس کی دونوں بیٹیاں بھی سامنے آ گئیں۔ وہ شاید ماں کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

میں نے اُن سے کہا کہ ڈسپنسر باہر رہتا ہے، بڑا بیٹا بھی دفتر چلا جاتا ہے، پچھلے عورتیں رہ جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دن کے دوران کوئی اگر چوری کر جائے؟ میں نے دیکھا کہ میرے سوال کے جواب میں اُن کے ذہن بالکل خالی تھے۔ میں نے رات کا ذکر کیا اور کہا تم سب براہِ اندسے میں سوتے ہو۔ اس حالت میں بھی چوری ممکن نہیں۔ پھر اُس عورت کے متعلق پوچھا جس کے نام پر مولوی نے لوٹا گھمایا تھا۔ میرے کئی ایک سوالوں کے بعد ڈسپنسر کی بیوی نے صاف کہا کہ دیا کہ اُسے عورت پر شک نہیں۔

مجھے ماں اور بیٹیوں سے کوئی ایسی بات نہ ملی جو مجھے سراسر آسانی میں مدد دیتی۔ میں نے دونوں بیٹیوں کو غور سے دیکھا۔ بڑی بیٹی ماں اور چھوٹی بیٹی

کی نسبت زیادہ باتیں کرتی تھی۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے اُس کے ساتھ چند ایک باتیں کیں کہ اُس میں کتنی کچھ دلیری ہے۔ اُس میں حجاب تھا۔ شرم بھی تھی لیکن میں نے اُس کی باتوں میں خاص قسم کی سنجنگی دیکھی جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان تینوں نے میرے پوچھنے پر صاف بتایا کہ ڈسپنسر گھر میں قیامت پانچ بجے رکھتا ہے اور ہر کسی کو مارتا پٹیتا ہے۔ چند دن پہلے اُس نے بڑی بیٹی کو بہت مارا تھا۔

”آپ کا ہار اور رقم اس گھر سے نکل گئی ہے“ میں نے انہیں کہا۔  
 ”لیکن میں آپ کو یقین سے کہتا ہوں کہ چورا بھی تک اس گھر سے نہیں نکلا“ میں یہ بات کہتے ہوئے بڑی بیٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پورا اس گھر میں ہے۔ میں نے بڑی بیٹی کے چہرے کا رنگ صاف طور پر بدلتے دیکھا اور وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح پیچھے ہٹی جیسے میں اسے پکڑ لوں گا۔

## وہ کوٹھے پر پکڑے گئے

چہرے کے تاثر کی یہ تبدیلی شاید ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تجربہ دکھا دیتا ہے۔ مجھے مجرموں اور گواہوں کے چہروں اور اُن کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھنے کا تجربہ تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کی تبدیلی کو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اتنے میں اُس کا بڑا سبھاٹی آگیا۔ میں نے اُس کی ماں اور بہنوں کو وہاں سے اٹھا دیا اور اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ہے میرا

مزم۔

میں نے اُس پر فوراً حملہ نہیں کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہا ”سنا ہے آپ کے والد صاحب گھر میں تشدد کرتے ہیں اور کسی کو بچتے نہیں۔“  
 ”تشدد نہیں ظلم کہیں“ اُس نے کہا اور مجھے تفصیل سے بتایا کہ باپ نے گھر میں کیا فضا بنا رکھی تھی۔ اُس نے کہا ”گھر ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ اُس وقت گھراؤں جب باپ گہری نیند سو گیا ہوا ہو۔“

”تم دفتر کے علاوہ کہاں وقت گزارتے ہو؟“  
 ”دوستوں کے ساتھ“ اُس نے جواب دیا۔ ”گپ شپ ہیں۔“  
 ”بازی کہاں لگتی ہے؟“ میں نے اُس کو پوچھا۔ ”اُستادوں کے ساتھ یا دوستوں کے ساتھ؟“

وہ کچھ گھبرا یا اور بولا ”میں پیشہ ور جواری تو نہیں، شغل کے لیے تاش کھیلتے ہیں اور دو چار روپے بازی بھی لگاتے ہیں۔“

میں نے بہت کر دیر گھا پھرا کر سوال کیے مگر جوابات میں تلاش کر رہا تھا وہ نہ ملی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ پیشہ ور جواری میرے جانے پہچانے ہیں، میں اُن سب سے پوچھوں گا اس لیے وہ سچ بتادے۔ اُس نے غوراً اعتمادی سے کہا کہ پوچھ لیں۔

”اگر میں تمہیں کہوں کہ ہار اور نقدی کے چور تم ہو تو کیا جواب دو گے؟“  
 ”آپ مجھے چور کہہ سکتے ہیں کیونکہ آپ تھانیدار ہیں۔“ اُس نے



کہا "میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"سنا ہے چند دن ہوئے تمہاری بہن کو تمہارے باپ نے بڑی طر  
پٹایا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا وجہ تھی؟ کوئی برتن ٹوٹ گیا تھا یا کوئی اور  
بات ہوئی تھی؟"

"اگر میں آپ کو اصل وجہ بتا دوں تو آپ میری کچھ مدد کریں گے؟"  
اُس نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گیا۔ اُس نے جب سر اٹھایا تو میں نے اُس  
کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اُس نے کہا۔ "ہم بہن بھائی اور ہماری ماں مظلوم  
ہیں۔ ہم گھر میں کچھ کچھ نہیں سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بے روز ہو گیا ہوں۔  
ہمارے نسلے میں مجھ سے دو تین سال چھوٹا ایک نوجوان ہے وہ اپنے کوٹے  
سے میری بہن کو اشارے کرتا رہتا ہے۔ ایک رات بہن اور پر بیت انٹلاہیں  
گئی۔ ہم سوئے ہوئے تھے۔ میرے باپ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اوپر چلا گیا  
اور اُس نے میری بہن کو بہت پٹایا۔ پیٹتے پیٹتے نیچے لے آیا۔ ہم میں سے  
کسی میں جرات نہیں تھی کہ اسے چھڑاتا۔۔۔ معلوم ہوا کہ وہ نوجوان ہمارے  
کوٹے پر آ گیا تھا اور میرے باپ نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ وہ نوجوان بھاگ  
گیا اور بہن کی مصیبت آگئی۔۔۔ وہ نوجوان دلیر اور بد معاش ہے۔ امیر  
گھرانے کا ہے۔ ہم اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ اگر اُسے ڈرا دھکا  
دیں تو ہماری عزت محفوظ رہ سکتی ہے۔"

میں نے رعبہ کیا کہ میں اس نوجوان کو تمہانے بلاؤں گا۔

ڈپنسر کے اس بیٹے سے میں نے بہت پوچھ گچھ کی۔ وہ نہ مانا۔ مجھے

جواریوں کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ اُن سے ہمارے متعلق پتہ چل سکتا تھا۔ ہمار  
نہیں تو یہی پتہ چل سکتا تھا کہ اس آدمی نے بہت زیادہ رقم کی بازی کائی تھی۔  
یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ وہ پیشہ ور جواریوں کے ساتھ کھیلتا ہے یا اُس کے اپنے  
بیان کے مطابق وہ شغل کے طور پر دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ میں نے اُس  
کے ساتھ چوری کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ میں اُٹھا اور تھانے چلا گیا۔ مولوی  
کو جا کے دیکھا۔ اُس کے بل نکل گئے تھے۔

"وہ عورت چور ہے مولانا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر ہنس نہ سکا۔ میں نے اور کچھ بھی نہ  
کہا۔ کمرے سے باہر آ گیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ شام کو ہسپتال گیا۔  
اس عورت کا خاوند بچ نکلا تھا مگر لاش بن گیا تھا۔ اُس سے اچھی طرح بولا  
نہیں جاتا تھا۔ ابھی بیان دینے کے قابل نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹھیک  
ہو جائے گا۔ اسے دیکھ کر میں کچھ ایسا مذباتی ہو گیا کہ یہ عہد کر لیا کہ اس نو سرباز کو  
جو مولوی اور غیب دان بنا ہوا تھا اس آدمی کی طرح لاش بنا کر چھوڑوں گا میں نے  
یہ دیکھ لیا کہ وہ اقبالی بیان دینے کے موڈ میں آ گیا تھا لیکن میں ابھی اسے زہنی اذیت  
میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

## بہن غائب ہو گئی

میں نے ڈپنسر کے گھر کے افراد سے باتیں کر کے بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔

یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ چور اس گھر میں موجود ہے۔ یہ بڑا بیٹا ہو سکتا تھا اور بڑی بیٹی بھی۔ بیٹی کے متعلق یہ ہو سکتا تھا کہ اُس نے چوری کر کے مال اس نوجوان کو دے دیا ہو جسے وہ چاہتی ہے۔ مجھے توقع نہیں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ یہ ممکن تھا یعنی ایسا ہونے کا امکان تھا۔ یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ یہ نوجوان اس لڑکی سے ملتا تھا اور وہ لوفرننگا بھی تھا۔ لڑکی کے دل میں باپ کے خلاف انتقام کا جذبہ بھی تھا۔ بہر حال مشتبہ افراد کی فہرست میں یہ لڑکی اور اُس کا چاہنے والا بھی شامل تھا۔ اس گھر میں ایک چھوٹا لڑکا (تیرہ چودہ سال کا) بھی تھا۔ میں نے اُسے بھی نظر انداز نہیں کیا۔

رات کو مجھے رپورٹ ملی کہ ڈسپنسر کا بڑا بیٹا پیشہ ور جواریوں کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ وہ اُسے جانتے ہی نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مولیٰ کا قسم کا جوئے باز تھا۔ مجھے اُس کے دوستوں سے ملنا تھا جن کے ساتھ وہ جو کھیلتا تھا۔ یہ فہرست یہ آدمی مجھے خود ہی دے سکتا تھا۔ میں نے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا۔

اگلے روز کانسیٹیل دوائی کی تجزیاتی رپورٹ لے کر آ گیا۔ اس میں ایک زہر ملی آمیزش تھی۔ قے کی کچھ مقدار بھی تجزیے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یہی آمیزش اس میں بھی پائی گئی۔ ڈسپنسر کے خلاف شہادت مکمل تھی میں اس کو شش میں تھا کہ مولوی کے خلاف اعانت جرم ثابت ہو جائے۔ ایسا مواد تو مل گیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ایسے حالات اس شخص نے پیدا کیے ہیں جن سے متاثر ہو کر ڈسپنسر نے ایک آدمی کو زہر دے کر قتل کرنے کی

کوشش کی ہے۔ اُس کی فریب کاری کی شہادت بھی بل گئی تھی۔

میں نے رپورٹ ڈاکٹر کو دکھائی۔ ڈاکٹر موقعہ کا گواہ تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی تھا، لہذا مستند گواہ تھا۔ ڈاکٹر نے میری کچھ اور رہنمائی کی اور ہم نے زبانی بیان کیس تیار کر لیا۔ میں نے حسب معمول آدھی رات کے بعد ڈسپنسر سے اقبال بیان لینے یا اسے بیان دینے کے لیے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولوی کو بھی اسی وقت لپیٹ میں لینا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے ایک کانسیٹیل اُس نوجوان کو بلانے کو بھیجا جس کے ساتھ ڈسپنسر کی بیٹی کے درپردہ تعلقات تھے۔

کانسیٹیل بہت دیر بعد واپس آیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ گھر نہیں ملا۔ اُس کے گھر والوں سے کانسیٹیل کہ آیا تھا کہ وہ جوہنی آئے اُسے تھانے بھیج دیں میں نے ڈسپنسر کے بڑے بیٹے کو بلانے کے لیے کانسیٹیل بھیجا۔ اُس سے پوچھنا تھا کہ اُس کے جوئے باز دوست کون کون سے ہیں۔ بلانے کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔ بعض تھانیداروں کا یہ طریقہ کار ہوتا ہے کہ وہ کسی مشتبہ کو تھانے میں ہی پابند رکھنے کی بجائے اُسے بار بار تھانے بلاتے ہیں۔ ایک باوردی کانسیٹیل بار بار اُس کے گھر جاتا ہے۔ کبھی آدھی رات کو جا دوازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اُسے تھانے بلا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ بڑے پیار سے اُس پر دہشت طاری کر کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح اُس پر تشدد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُس کا اعصابی نظام ٹوٹ چھوٹ جاتا ہے اور بعد شکر یہ سینے کے راز تھانیدار کے حوالے کر دیتا ہے۔ میں نے ڈسپنسر کے بیٹے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے کی ٹھکان لی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے پوچھنے پر وہ ایک ہی

بار اپنے تمام جوئے باز دوستوں کے نام بتا دے گا۔

وہ اگیا۔ میں اُس پر بڑا اچھا تاثر چھوڑا آیا تھا۔ اس کے دل میں تھانڈا لڑکا جو ڈرتھا وہ میں نے نکال دیا تھا، لیکن میں نے اُس کے چہرے پر جتنا اثر دیکھے وہ خوف کے بھی تھے پریشانی کے بھی۔ مجھے آج تک اُس کا چہرہ یاد ہے۔ اُسے بٹھایا۔ خیر خیر بیت پوچھی۔ اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں سمجھا کہ جرم اسے ملامت کر رہا ہے اور یہ میرے آگے اپنے منیر سے بوجھ اُتار پھینکے گا مگر جرم کے بوجھ کی بجائے اس نے مجھ پر ایک بم پھینک دیا۔ میں کچھ دیر اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

”مصیبت اکیل نہیں آتی“۔ اُس نے کہا۔ ”اتنا قیمتی ہار جوری ہو گیا۔ تین سو روپے نکل گئے۔ ابا جان اتنے سنگین جرم میں اندر ہو گئے۔ رات میری بہن غائب ہو گئی ہے۔“

”بڑی یا چھوٹی؟“

”بڑی“۔ اُس نے جواب دیا۔ صبح وہ بستر پر نہیں تھی۔ اوپر دیکھا۔ وہاں بھی نہیں تھی۔ دو ہی تو جگہاں تھیں۔ اوپر یا نیچے۔ ایک دو گھر دن سے پتہ کرایا۔ بیکار تھا۔ اتنی سویرے اُسے کسی کے گھر کیوں جانا تھا بہت سوچا کیا کریں۔ میں اس لڑکے کے گھر گیا جس کے ساتھ اسے میرے باپ نے کوٹھے پر رکھا تھا۔ وہ نہ ملا۔ ارب تک تین بار اُس کے گھر جا چکا ہوں۔ وہ نہیں مل رہا۔“

”وہ کوئی پیسے اور زیورات بھی لے گئی ہے؟“

”نہیں۔“

”تم میرے پاس کیوں نہیں آئے؟“ میں نے پوچھا۔ ”رپورٹ نہیں کرنی تھی؟“

”کچھ سمجھ نہیں آتی“۔ اُس نے کہا۔ ”بے عزتی کے سوا کیا حاصل ہوگا؟ اگر یہ لڑکا بھی گھر سے غائب ہے تو میری بہن اسی کے ساتھ گئی ہے۔“

## وہ نوجوان بھی لاپتہ ہو گیا

ڈسپنسر کی ظالمانہ ڈکٹیٹر شپ نے اپنے پچیس سالہ بیٹے میں اتنی سی بھی مردانگی پیدا نہیں ہونے دی تھی کہ وہ اس صورت حال کے متعلق کچھ سوچ بھی سکتا۔ وہ رو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ابا جان کو بتا دوں؟ میں نے اُسے کہا کہ وہ حالات میں بندھے۔ اپنا خون پینے کے سوا کیا کرے گا۔ اُسے ابھی نہ بتاؤ... میں اس بیٹے کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نام سے اس کی بہن کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی اور اسے ان الفاظ میں تسلی دی۔ ”مجھے اپنا باپ سمجھو اور گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔“

اُس کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے کہا۔ ”اپنے اوپر اتنا زیادہ بوجھ نہ لو۔ اگر گھر سے ہار اور نقدی تم نے نکالی ہے

تو مجھے بتا دو۔ میں یہ کیس گول کر دوں گا۔ اب توجہ اپنی بہن کی برآمدگی پر اور اپنے باپ کا مقدمہ لڑنے پر مرکوز کر لو۔“

اُس نے جس انداز سے قسمیں کھائیں، میں مان گیا کہ اس نے چوری نہیں کی۔ اس سے بہت زیادہ باتیں ہوئیں۔ اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا جیسے میری پناہ میں چھپ جانا چاہتا ہو۔ میری ہمدردی سے وہ چھوٹا سا بچہ بن گیا۔ اُس نے اپنے باپ کے متعلق پوچھا کہ اُس کا کیا بنے گا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ اس کے باپ کی قیمت میں چار پانچ سال کی مزا اٹے قید بکھری گئی ہے۔

مجھے اس شخص کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔“ اُس نے کہا۔

میں نے اسے گھر بھیج دیا۔ مجھے اب لڑکی ڈھونڈنی تھی۔ وہ گزشتہ رات نکلی تھی۔ اب اگلی رات شروع ہو چکی تھی۔ میں نے یہ رپورٹ خود ہی اپنے سر ڈال لی تھی۔ اس میں میرا جنون بھی شامل تھا اور ہمدردی بھی۔ میں نے یہ یقین کرنے کے لیے کہ لڑکی اسی نوجوان کے ساتھ گئی ہے ایک کانسیٹیل کو اُس کے گھر یہ کہہ بھیجا کہ وہ نہ ملے تو اس کے باپ کو بلا لائے۔ میں نے اتنی دیر میں غسل کر لیا اور کچھ کھانی لیا۔ اُس کا باپ میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس کے بیٹے کے متعلق پوچھا تو اُس نے پتے تو لا علمی ظاہر کی پھر جھوٹ بولا۔ میں نے جب پولیس والوں کا لہجہ استعمال کیا تو اس نے بتایا کہ وہ رات کو کہیں نکل گیا تھا، واپس نہیں آیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اس سے

پہلے وہ بغیر بتائے کبھی اتنی دیر تک غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔

”ڈسپنسر نے کبھی تم سے شکایت کی تھی کہ تمہارا بیٹا اُس کی بیٹی کو اپنے کوٹھے سے اشارے کیا کرتا ہے؟“

”تین بار اُس نے شکایت کی تھی“۔ اُس نے جواب دیا۔

”تم نے اپنے بیٹے کو ان ہیودہ حرکتوں سے منع کیا تھا؟“

”میرا بیٹا!۔“ اُس نے گالی دے کر جواب دیا۔ ”سُرکش اور دلیر ہے۔ اسے کچھ کہو تو مرنے مارنے پر آمہاتا ہے۔“

مختصر یہ کہ صبح کانسیٹیل اُس کے بیٹے کو بلانے گیا تھا تو اس شخص نے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر نہیں ہے۔ وہ دراصل ڈسپنسر کی بیٹی کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یہ نظر آنے لگا تھا کہ ہارا اور نفرتی لڑکی اور لڑکا لے گئے ہیں، لیکن ہر ایک ہفتہ پہلے چوری ہوا تھا، تو کیا چور کوئی اور ہے؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ لڑکی کو بھی بہر حال تلاش کرنا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دونوں دارداتیں الگ الگ ہیں یا ان کا آپس میں تعلق ہے۔

## سزا جو خدا نے دی

رات گزر رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد مجھے ڈسپنسر سے دو ہاتھ کرنے تھے۔ ابھی وقت تھا۔ آدھی رات کے بعد اس سٹیشن پر دو منٹ رگ کہ ایک مسافر گاڑی گزرتی تھی۔ بھاگنے والے اسی گاڑی سے گئے

ہوں گے۔ میں ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ بنگلہ کلرک کو کوارٹر سے سٹیشن ماسٹر کے دفتر میں بلایا۔ اُس سے پوچھا کہ گزشتہ رات یہاں سے کسی نے دو ٹکٹ خریدے ہوں گے۔

اُس نے کاغذات دیکھ کر بتایا۔ مجھے تعداد یاد نہیں رہی۔ دوست زیادہ ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ کلرک کو کسی ایک کا بھی چہرہ یاد نہیں تھا۔ اُس نے کوئی عورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس دور میں ریش کا یہ عالم نہیں ہوتا تھا جو آج کل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے سے قصبے کے سٹیشن پر رات کے پچھلے پہر کی گاڑی سے کون آتا جاتا تھا۔

میں نے ٹکٹ کلکٹر کو بھی بلالیا۔ اس آدمی کو بھی بلالیا جو گاڑی کے ڈرائیور کو گولہ (ٹوکن) دیتا ہے۔ دو اور آدمی بل گئے جو پلٹ فارم پر پہنچے تھے۔ ان میں سے دو نے بتایا کہ انہوں نے ایک نوجوان کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے وہ اس نوجوان کو پہچان نہیں سکے تھے۔ بنگلہ کلرک نے یاد کرنے کی اور زیادہ کوشش کی۔ اُسے کچھ یاد آگیا۔ اُس نے بتایا کہ یہ نوجوان اُسے یاد آ رہا ہے۔ اُس نے دو ٹکٹ خریدے تھے۔

میں نے اس کا ریکارڈ دیکھا۔ دو ٹکٹ ایک ہی سٹیشن کے تھے اور باقی الگ الگ سٹیشنوں کے دو ٹکٹ تیس میل دور کے ایک شہر کے تھے جو کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔

مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہاں اس نوجوان کا کوئی دوست ہے یا وہ

اللہ کے بھروسے لڑکی کو ساتھ لے گیا ہے۔ میں تھانے واپس جاتے ہوئے اُس کے گھر چلا گیا۔ اُس کے باپ اور بڑے بھائی سے پوچھا کہ اس شہر میں اس کا کوئی دوست ہے؟

اس کے بھائی نے بتایا کہ اس قصبے کا ایک نوجوان وہاں ملازم ہے اور وہ دو تین مہینے ہوئے شادی کر کے اپنی بیوی کو ساتھ لے گیا ہے۔ دوستی گہری بتائی گئی تھی۔

میں آپ کو ایسی ایک دو کہانیاں سنا چکا ہوں جس میں ایک آدمی لڑکی کو بھگالے گیا اور اسے اپنے دوست کے گھر رکھا۔ اس واردات میں بھی ایسے ہی ہوا ہو گا۔ میں نے اس دوست کا گھر پوچھ لیا۔

میں تھانے چلا گیا۔ ارادہ یہ کیا کہ صبح اس نوجوان کے دوست کا ایڈریس اُس کے گھر والوں سے پوچھوں گا۔ میں نے ڈسپنسر کو حوالات سے نکلوا دیا اور اُسے اپنے دفتر میں بٹھالیا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہو چکی ہوگی۔

”مجھے تمہارے اقبالی بیان کی کوئی ضرورت نہیں“ میں نے اُسے کہا۔

”تمہارا مجرم ثابت ہو چکا ہے۔“

”وہ مرنے نہیں گیا؟“ اُس نے پوچھا۔

”مُ نے کسے تو نہیں رہنے دی تھی“ میں نے کہا۔ ”اللہ نے اسے بچالیا ہے لیکن اُسے مرا ہوا ہی سمجھو۔ غریب آدمی ایک سال تک کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔“ میں نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”جس غریب

کے تم جنونی ہو وہ مذہب تمہیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی انسان کی جان لے لو؛ میں تمہیں اگر رہا بھی کر دوں تو تم خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”خدا کی بے آواز لاشی چل چکی ہے۔ تم جس بیٹی کو پردوں میں چھپا کر رکھتے تھے وہ ایک آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔“

اُسے ایسا دھچکہ لگا جو میں نے بھی محسوس کیا۔ اُس کا گندمی پہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ اُس کی زبان جیسے اڑ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں ٹھٹھ گئیں اور مجھ پر جمی رہیں۔

”اب جھوٹ بول کر خدا کے قہر میں اضافہ نہ کرو۔“ میں نے کہا۔

”اپنے گناہ کا اعتراف کرو شاید خدا تمہیں بخش دے۔“ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ میں نے اُس کے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ لیا ہے اور خود ہی اس کی بیٹی کی گمشدگی کی پورٹ لکھ کر کارروائی شروع کر دی ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میں بہت جلد اُس کی بیٹی کو برآمد کروں گا اور وہ جس کے ساتھ گئی ہے اُس کے خلاف اغوا کا کیس بناؤں گا۔

اُس کے اقبالی بیان کی ضرورت نہیں تھی۔ ثبوت اور شہادت مستند اور قابل اعتبار تھی۔ میں دراصل اس مولوی کے خلاف اس سے بہت کچھ کہلوانا چاہتا تھا۔ مجھے زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ اُس نے بیان دے دیا۔ میں وہی کچھ تھا جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ میں نے جرح کے

ذریعے اور اسے لقمے دے دے کر مولوی کے خلاف ضرورت کی باتیں کہلا لیں۔ مثلاً یہ کہ ڈسپنسر کو کئی باخیاں آیا کہ جس عورت کے نام پر لوٹا گھوما ہے، وہ چوری کس طرح کر سکتی تھی۔ اسے ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے مولوی سے بات کی تو مولوی نے قرآن کا رُعب دے کر اور چرب زبانی سے ڈسپنسر کو قائل کر لیا کہ چوری اسی عورت نے کی ہے۔

بیان میں یہ بھی کہلوا لیا کہ اس عورت پر شک کا اظہار ڈسپنسر نے نہیں مولوی نے کیا تھا۔ میں نے ڈسپنسر سے یہ بھی منوا کر کہلوا لیا کہ مولوی نے اسے اسلام کے حوالے سے اس عورت اور اس کے خاندان کے خلاف بھڑکایا تھا۔

ڈسپنسر سے میں فارغ ہوا تو مرخ اذانیں دے رہے تھے۔ میرا سر جکرا رہا تھا۔ اب مولوی کی باری تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مولوی کو اس وقت پٹیٹ میں لے لیتا۔ میں سونے کے لیے چلا گیا اور ایسا سوایا کہ صبح نو ساٹھے نو بجے آنکھ کھلی۔ کسی نے جگا یا نہیں۔ تھانا سے۔ ایس۔ آئی نے سنبھالے رکھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر اپنے دفتر میں گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ضلع سے ایک انگریز پولیس انسپکٹر آ گیا۔ یہ اُس کا اچانک دورہ تھا جسے چھا یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ میری غوش قسمتی کہ میں کچھ دیر پہلے جاگ کر دفتر میں آ گیا تھا ورنہ محکمانہ کارروائی ہو جاتی۔ انسپکٹر نے معائنہ شروع کر دیا اور اُس نے ذرائع کر دی کہ وہ دیسی کھانا کھائے گا۔ میں نے انتظام کیا، اُسے دوپہر کا کھانا کھلایا اور وہ پچھلے پر روانہ ہوا۔ میرے کاموں میں تاخیر ہو گئی۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ ڈپنسر کو مجسٹریٹ کے پاس  
اقتاباں بیان قلمبند کرانے کے لیے لے جائے اور اُسے جو ڈیشیل حوالا تاجیل  
میں چھوڑ آئے۔ روانگی کے وقت میں نے ڈپنسر سے وعدہ کیا کہ کم سے کم  
سزا دلاؤں گا اور اُس کی بیٹی کو برآمدہ کروں گا اور اُس کے گھر کا بھی خیال  
رکھوں گا۔

”خدا کے سوا میرے بیوی بچوں کا کوئی نہیں“ اُس نے روتے ہوئے  
کہا۔ ”آپ پولیس انپکٹر ہیں۔ میں آپ سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ آپ  
میرے گھر کا خیال رکھیں گے۔“

”اُسی طرح خیال رکھوں گا جس طرح تم رکھتے تھے“ میں نے اُسے  
خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں  
اس کفرستان میں میرا فرض ہے کہ ایک مصیبت زدہ مسلمان گھرانے کا خیال  
رکھوں۔“

اُس کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی میرے جذباتی سہارے نے  
بہت کام کیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اس نے جو بیان مجھے دیا ہے وہی مجسٹریٹ  
کو دے ورنہ اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اُس نے پُر زور الفاظ میں وعدہ  
کیا کہ وہ میری نصیحت پر عمل کرے گا۔

## برقعے کے انسو

مجھے اُس دوست کا ایڈریس معلوم کرنا تھا جس سے متعلق شک

تھا کہ لڑکی کو وہاں کھا گیا ہوگا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ بنگلوٹے نوجوان کے  
گھر سے اُس کے گھر کا پتہ پوچھے اور وہاں کا مطلوبہ ایڈریس لے آئے۔ مجھے اُس  
شہر کا ایڈریس درکار تھا جہاں وہ ملازم تھا۔

ایڈریس آتے آتے شام ہو گئی۔ مجھے اس ایڈریس پر چھاپہ مارنا یا مورا  
تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو مزوری علی کے

ساتھ تیار کیا۔ مجھے رات غیب دان مولوی سے بیان لینا اور اسے ایسے  
شکفے میں جکڑنا تھا جس سے وہ نکل نہ سکے۔ عین اُس وقت ایک گاؤں سے  
دو پارٹیوں کی لڑائی کی رپورٹ آگئی۔ اکٹھی پانچ چار پارٹیاں تھانے میں اُتریں۔

چارشہید زخمی تھے اور ایک مرجھا تھا۔ فوراً بعد دوسری پارٹی کے زخمی آگئے۔  
پرفٹیش والا کیس نہیں تھا۔ کھل لڑائی ہوئی تھی۔ تاہم کام بہت ہو گیا۔ فوری  
کارروائی کرنی تھی۔ مجھے رات بھر اس کیس کے لیے جاگنا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی  
بھی مصروف ہو گیا۔ زخمیوں کے بیان لیے جانے لگے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے  
بھجوائی۔ معلوم نہیں سورج کب غروب ہوا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ شام  
کے بعد کوئی لاری تھبے سے نہیں جاتی تھی۔

اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ آدھی رات کے بعد کسی گاڑی سے  
اُس شہر چلا جائے جہاں توقع تھی کہ لڑکی گئی ہوگی۔

آدھی رات سے آدھ پون گھنٹہ پہلے میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔  
ریسیور اٹھایا۔ اُسی شہر کا ایک سب انپکٹر بول رہا تھا۔ وہ سیکھ تھا۔ سیکھ زینو دل  
ہوتے ہیں اور اپنی مخصوص زبان میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ میرے ساتھ اس

کی بے تکلفی بھی تھی۔ اس نے مجھے پنجابی میں جو کچھ کہا اس کا اردو ترجمہ لوں ہے۔ اوئے ملکا! تم اپنے علاقے کے دانے سنبھال کر کیوں نہیں کتے تمہارا ایک پکا ہوا دانہ میرے پاس آ گیا ہے۔“

میں نہ سمجھ سکا۔ ہم سنہی مذاق کیا کرتے تھے۔ سکھ کے جواب میں میں نے بھی مذاق شروع کر دیا۔ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ سکھ مجھے کتنی قیمتی رپورٹ دے رہا ہے۔ وہ فنگلی زبان بول رہا تھا۔ آخر اُس نے سبب سے جو اطلاع دی وہ یہ تھی کہ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یعنی آدھی رات سے پہلے اُس کا ایک کانٹیل ریلوے سٹیشن پر ڈیوٹی پر گھوم رہا تھا۔ اس کے کسی دوست نے جو اتفاق سے اس تھانے کا تجربہ بھی تھا اس کانٹیل کو بتایا کہ ایک جوان آدمی ایک لڑکی کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ لڑکی برقعے میں ہے اور وہ رورہی ہے۔ مخبر شام سے ہی ان کا پتہ چھا کر رہا تھا۔ ان دونوں کو اُس نے ایسی حالت میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے دیکھا جیسے ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کہاں جائیں لڑکی کے ساتھی کی پریشانی صاف ظاہر تھی۔ مخبر نے برقعے کا نقاب گرا ہوا ہونے کے باوجود محسوس کر لیا تھا کہ لڑکی رو رہی ہے۔

پولیس کے کسی آدمی کے لیے اور تجربہ کار اور استاد مخبروں کے لیے مشکوک افراد کو بھانپ لینا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ لڑکا لڑکی سٹیشن کے سامنے لڑائی میں چلے گئے۔ مخبر نے وہاں بھی ان پر نظر رکھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ اُس نے اپنے کانٹیل دوست کو دیکھ لیا اور اُس کے ساتھ

ذکر کیا۔ اُس وقت لڑکا لڑکی مسافر خانے کے ایک کونے میں بیٹھے تھے لڑکی ان کی طرف چل پڑا۔

لڑکے نے کانٹیل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس نے لڑکی کو اٹھایا اور تیز تیز قدم اٹھاتے دونوں باہر کو چل پڑے۔ کانٹیل اور مخبر بھی تیز چلے۔ لڑکا لڑکی اور تیز ہو گئے۔ کانٹیل نے انہیں پکارا تو وہ اور تیز ہو گئے کانٹیل دوڑ پڑا۔ لڑکا بھی دوڑ پڑا مگر لڑکی سے نہ دوڑا گیا۔ لڑکے نے اُسے دیکھا تو وہ واپس آ گیا۔ ہمارے لوگ تماشہ دیکھنے فوراً جمع ہو جاتے ہیں۔ لڑکے نے وجود اصل بائیس سال کا جوان تھا، کانٹیل کو رشوت پیش کی۔ اس کے ساتھ مخبر بھی تھا جو چھوٹی چھوٹی چوریوں کا عادی مجرم بھی تھا۔ کانٹیل اور مخبر رشوت سے انکار نہ کرتے بلکہ منہ مانگی رشوت لیتے مگر وہاں لوگ تماشہ دیکھنے آگئے ہو گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی۔

مسلمانوں نے برقعہ دیکھا تو اس کے احترام میں بھرپک اٹھے۔ کانٹیل ہندو تھا۔ معاملہ فرقہ وارانہ صورت اختیار کر گیا۔ لہذا ضروری ہو گیا کہ اس نوجوان اور لڑکی کو تھانے لے جایا جائے۔ مسلمان بھی جوش ایمان سے ساتھ چل پڑے اور ہندو بھی۔ کانٹیل اور مخبر کی رشوت ماری گئی۔ سکھ تھانیدار نے اس چھوٹے سے سٹک کیس کی تلاشی لی جو نوجوان اٹھائے پھرتا تھا۔ اس میں سونے کا ایک ہار اور رقم برآمد ہوئی جو تین اور چار سو کے درمیان تھی۔ یہ کوئی مجرم نہیں تھا۔ ان کی ذاتی ملکیت کی اشیاء تھیں۔ تھانیدار نے ان سے ان کے ٹھکانے کے متعلق پوچھا اور اپنے انداز سے پوچھ گچھ کی تو راز



کھلا کہ دونوں گھروں سے بھاگے ہوئے ہیں۔ دونوں نے میرے قبضے کا نام لیا اور اپنے نام صحیح بتا دیئے۔

ان پر وہاں زیادہ سے زیادہ آوارہ گردی کا الزام عائد ہو سکتا تھا۔ سکھ تھانڈا رنے باہر نکل کر مسلمانوں کو بتایا کہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے اور اسے واپس گھر بھیجا جا رہا ہے تاکہ اس کے ماں باپ کی عورت محفوظ رہے اور یہ کہ انہیں حوالات میں بند نہیں کیا جائے گا اور عورت سے رکھا جائے گا۔ مسلمان مطمئن ہو گئے۔ سکھ نے بذریعہ فون مجھے اطلاع دی۔ میں نے اُسے بتایا کہ دونوں میرے ملزم ہیں۔ ہمارا اور رقم کی چوری کی رپورٹ میرے پاس درج ہے اور لڑکی کی گمشدگی کی بھی رپورٹ ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میرا سے۔ ایس۔ آئی آر ہا ہے، دونوں کو اس کے حوالے کر دے۔

## رشوت، رقم بھی، عورت بھی

میں نے خدا کا شکر ادا کیا، یہ اس کی ذات باری کی خاص کرم نوازی تھی کہ میرا کام گھر بیٹھے ہو گیا تھا۔ میں لڑائی والے کیس کی کارروائی میں لُجھ گیا۔ رات کا ایک بج گیا۔ اسے۔ ایس۔ آئی دو تین کانسیبلوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ مجھے بہت زیادہ تکس ہونی چاہیے تھی لیکن ڈپنسر کی بیٹی، ہمارا اور رقم کی برآمدگی نے تروتازہ کر دیا۔ ویسے بھی وہ جوانی کا دور تھا۔ جسم حیران کن حد تک کام کر سکتا تھا۔ میں تفتیش کے کمرے میں چلا گیا جہاں جناب مولانا بند تھے۔ یہ شخص مسلمانوں

کے گھروں کے چکے ہوئے مرغن کھانوں، حلو سے اور کھیر کا عادی تھا۔ اس کی قابل رشک صحت کا راز بھی یہی تھا۔ میرے پاس اُس نے جتنے وقت روٹی کھائی میں نے اُسے ایک بھی وقت گوشت نہیں دیا، تنور سے ترط کے بغیر ڈالنگوا راسے کھلا تا رہا۔ میں نے یہ اہتمام خاص طور پر کیا تھا تاکہ وہ اپنی اصلی جگہ آجائے۔

اس جگہ وہ آگیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہار ہی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرے ساتھ آپ کیا سلوک کریں گے؟“

”دہی جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔“ میں نے ہمارا جب پورس کے وہ الفاظ دہرائے جو اُس نے سکندر اعظم سے کہے تھے۔

”تم اب میرے چکر سے نکل نہیں سکتے۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”بیان دو یا نہ دو۔ میرے پاس شہادت آگئی ہے کہ لڑکے کو تم نے اس کام کے چار آنے دیئے تھے کہ وہ اس عورت کی پرچی پر لٹا گھا دے۔ میرے پاس اس کی بھی شہادت آگئی ہے کہ تم اس عورت کو چھانسا چاہتے تھے اور اسے ڈپنسر نے نہیں تم نے لوٹے کے عمل کے لیے بلایا تھا۔ کہو تو تمہارے جرم کی پوری کہانی بمع ثبوت اور شہادت سنا دوں۔ اگر تم نے خود یہ کہانی سنا دی تو میں تمہارا کچھ خیال کروں گا۔ اگر مجھے چکر دینے کی کوشش کرو گے تو اس عورت کے خاوند کو قتل کرنے کی کوشش میں تمہیں کم از کم دس سال کے لیے جیل بھجواؤں گا۔“

”وہ مرنے نہیں گیا؟“ اُس نے پوچھا۔

تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔

## خدا کے گھر میں

اُس کا دماغ بالکل اسی جگہ اُگیا جہاں میں لانا چاہتا تھا۔ اُس نے پانی مانگا۔ میں نے اُسے پانی پلایا اور کہا کہ اپنی اصلیت بتائے اور اپنے گناہوں کی پوری روئید ادا سنائے۔

اُس کا بیان بہت طویل تھا۔ آپ کی دل چسپی کی باتیں یہ ہیں کہ وہ انبالہ میں اپنے جیسے ایک مولوی کا شاگرد تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ وہ سوتیلی ماں کے بڑے سلوک سے جان نذر سے بھاگا تھا۔ انبالہ کی اس مسجد میں اُس نے پناہ لی تھی۔ امام کو اُس نے بتایا کہ وہ کیوں بھاگا ہے اور اب وہ واپس نہیں جانا چاہتا۔ امام نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس سے خدمت کرتا رہا اور اسے یہی علم دہنر "سکھاتا رہا جس کا کمال اُس نے بار اور لفظی کی چوری کے سلسلے میں دکھایا تھا۔ امام نے اُسے یہ بھی سکھایا کہ لوگوں پر جذبہ بابت اور اپنا تقدس کس طرح طاری کیا جاتا ہے۔ قرآن کی چند ایک آیات بھی اُسے یاد کرا دیں اور ایسے وعظ سکھادیتے جن کا کوئی مومنوع نہیں ہوتا لیکن سامعین پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ شخص بغیر علم کے عالم اور مذہب سے بیگانہ رہ کر مذہبی پیشوا بن گیا۔ اُس تادنے اسے کتاب سے فال نکالنے، غیب کا حال بتانے، ٹوٹا گھمانے اور خواتین کو جذبہ بابت کے مجال میں پھانس کر عیش و عشرت کرنے

"تم اپنی رام کہانی سناؤ۔ میں نے کہا۔" "ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔" اُس نے رشوت پیش کی۔ میرے پاؤں پکڑے۔ رشوت کا بھاؤ چٹپٹا میں خاموشی سے اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"مجھے میرے گھر لے چلیں۔" اُس نے کہا۔ "وہاں جتنی رقم ہے لے لیں۔ رقم تھوڑی نہیں۔" میں خاموش رہا۔

اُس نے رازداری سے کہا۔ "میرے محلے کی کسی عورت کا نام لیں۔ آپ کے پاس لے آؤں گا۔"

میں خاموش رہا لیکن میرے اندر ایک بگولہ اُٹھ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "ڈپنسر کی بڑی بیٹی لادوں؟ خدا کی قسم ایسی لڑکی کبھی آپ نے خواب میں نہیں دیکھی ہوگی۔"

میرے ارادے اور کوشش کے بغیر میرا دایاں بازو لاشعنی کی طرح اٹھا اور میرا ہاتھ اس قدر زور سے اُس کے منہ پر پڑا کہ وہ گھوما، چکرایا اور مجھ سے تین چار قدم دور گرا۔ وہ اٹھا تو میں نے اُس کے پہلو میں گھولنسہ مارا۔ وہ اس پہلو پر جھکا اور گر پڑا۔ خدا نے مجھے بازو لمبے عطا کیے ہیں اور اُس دور میں میرے ہاتھ میں محمد علی باکس جیسی طاقت تھی۔ وہ اٹھ نہ سکا۔ میں نے اُس کی ایک کلائی پکڑ کر بازو موڑا اور اُسے اٹھایا۔ وہ ادھ مٹا ہو گیا تھا۔

یہ شخص پہلے روز میرے سامنے آیا تھا تو اس نے مجھ پر اپنی غیبی قوت کا رعب جمانے کی کوشش کی تھی مگر گنہگار کی ایک ٹنگ زیادہ دیر

کے طریقے بتا دیئے۔  
 ”مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کوئی شکل نہیں“۔ اُس نے کہا ”مسلمان مذہب کے نام پر مٹنا ہے۔ اگر ہماری قوم مذہب سے واقف ہو جائے تو ہمارے ہاتھ کی صفائی اور زبان کا جاود ختم ہو جائے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مریدوں کے دلوں میں مذہب نہیں بلکہ مذہب کا تقدس قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مولوی لوگ تعلیم یافتہ لوگوں کے خلاف باتیں کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو تعلیم نے گمراہ کر دیا ہے۔ ہماری کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی مریض کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جائے، ہمارے پاس آئے، پیسے دے، دعا کرائے اور تعویذ لے۔“  
 اُس نے امامت کے ایسے ایسے راز فاش کیے جو میں بیان کر دوں تو مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ یہ شخص جب جوان ہو گیا اور آزادی سے کاروبار چلانے کے قابل ہو گیا تو اپنے استاد کے ٹرنک سے پانچ چھ سو روپیہ چوری کر کے غائب ہو گیا۔ تین چار جگہوں پر رہا۔ آخر میرے قصبے کی اس مسجد میں آ گیا۔ اسے شاید پتہ چل گیا تھا کہ اس مسجد کا امام مر گیا ہے۔ اسے مسجد دے دی گئی۔ مسلمان برصغیر کے کسی بھی گوشے کا ہوا اُس میں اپنی قوم کی ہر ایک خامی اور کمزوری ہوتی ہے۔ اس قصبے میں اسے ویسے ہی مسلمان ملے جیسے انبالہ میں تھے۔ اس نے مذہب کو پوری کامیابی سے کاروبار بنایا اور وہ عالم بھی کہلانے لگا عالم بھی۔ اس کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ عامل تھا نہ عالم۔ اس کی کامیابی کی وجہ وہی تھی جو اسے استاد نے بتائی تھی۔ یعنی لوگوں کی جذباتیت

اور اندھی عقیدت مندی۔ اس نے بتایا کہ عورت میں یہ کمزوری زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی قباحت کی بدولت عورتیں اس کے جال میں اُلجھی رہتی تھیں۔

اس کے اقبال جرم کے مطابق ڈپنسر کی بڑی بیٹی بھی اُس کے ظلم سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ ڈپنسر اس کا اندھا مرید تھا۔ صرف یہ ایک عورت ہی نہیں پراس نے چوری کا الزام لگایا تھا، جو اس کی اصلیت بھانپ گئی تھی۔ اس شخص نے اس عورت کے متعلق وہی بیان دیا جو اس عورت اور اس کے خاوند کی زبانی آپ کو سنا چکا ہوں۔

ایک روز ڈپنسر نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی نے ٹرنک کھولا تو اسے پتہ چلا کہ سونے کا ایک ہار اور تین سو روپے غائب ہیں۔  
 مولوی نے فوراً کہا ”لوٹا چور کو کپڑے لگا“۔ اُس نے کوئی اداکاری کی اور ڈپنسر کو لوٹا گھمانے کا دن اور وقت بتایا۔

اُس نے بیان میں کہا کہ اُس نے اس عورت کو بھانسنے کی ترکیب سوچ لی۔ اُسے بھانسنے دیئے، دھکیاں بھی دیں۔ آخر اسے مشتبہ افراد میں شامل کر لیا۔ لوٹا تھا منے والے لڑکے کو اُس نے چار روپے دے کر مشن کرائی کہ وہ کس طرح لوٹا گھمائے گا۔ آج چار روپے کچھ بھی نہیں سمجھ جاتے، اُس زمانے میں چار روپے میں ایک گینے کی ہانڈی پک جاسکتی تھی۔ لڑکے نے اس کا یہ فریب کامیاب کر دیا۔ عورت کا رتو عمل وہی تھا جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس شخص نے عورت سے کئی بار کہا کہ وہ اس کے پاس آ جائے الزام صاف کر دیا جائے گا مگر عورت کردار کی بہت پختی ثابت ہوئی۔ مولوی نے اس کے خاوند کو بھی

پھانسنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

اس دوران وہ ڈپنسر کو بھڑکاتا رہا۔ دو تین بار ڈپنسر نے اسے کہا کہ لے ٹشک لوٹا اسی عورت کے نام پر گھوما ہے لیکن غور کیا جائے تو ممکن نظر نہیں آتا کہ اس عورت نے چوری کی ہوگی۔ اُس نے مولوی کو بتایا کہ زیورات والے ٹشک کہاں پڑے تھے مگر اس شخص نے اقبالی بیان میں کہا کہ اس نے ڈپنسر سے کہا کہ لوٹا میں نے نہیں قرآن کی آیات نے گھمایا ہے۔ قرآن کے احکام پر ٹشک کرنا گناہ ہے اور یہ عورت اور اس کا خاوند چوری کے گناہ کے علاوہ قرآنی آیات کی نافرمانی کا گناہ بھی کر رہے ہیں۔

اس نے ڈپنسر کو قرآن اور اسلام کے نام پر ایسا بھڑکایا کہ اُسے اپنے اُوپر قابو نہ رہا۔ اس شخص نے یہ بھی کہا کہ اس عورت کو اور اس کے خاوند کو اگر چوری کی سزا مل سکے تو انہیں قرآنی آیات کی نافرمانی کی سزا ضرور ملنی چاہیے جو کوئی قرآنی آیات کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے اسے سزا دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ڈپنسر چونکہ جنوبی مذہب پرست تھا اس لیے اُس نے اپنا فرض ادا کر کے ثواب دارین حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس عورت کے خاوند کو دوائی دی تو اس میں زہریلی دوائی کی آمیزش کر دی۔

پروردہ نشین لڑکی نے پردے چپاک کیے

اُس نے میری مرضی کے مطابق بیان دے دیا۔ میں نے اُسے دودھ

پلایا، پھر چار پائی اور لبتہ منگو اکرا اُسے اسی کمرے میں ملادیا۔ اس سے پہلے وہ فرش پر سوتا تھا۔ سحر کا وقت تھا۔ میں بھی ذرا آرام کے لیے چلا گیا۔

آٹھ نو بجے میں اپنے دفتر میں آیا اور اس کے لیے نہایت اچھا ناشتہ منگوایا۔ اسے اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اسے حوالات میں بند نہ کیا۔ اپنے دفتر میں لے آیا۔ اُس کی اُسی طرح عزت کی جس کا وہ عادی تھا۔ اسے بذریعہ لاری (بس) دوسرے شہر میں مجسٹریٹ کے پاس بیان قلمبند کرانے کے لیے لے جانا تھا۔ میں اسے ہتھکڑی لگانے لگا تو اس کا رنگ پللا پڑ گیا۔ اسے انہی لوگوں میں سے گزار کر لاری اڑے تک لے جانا تھا جو اسے جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ہتھکڑی نہ لگاؤں۔ میری ضرورت یہ تھی کہ وہ مجسٹریٹ کو میری مرضی کے مطابق بیان دے دے۔ میں نے اسے کہا کہ ہتھکڑی نہ لگانا جرم ہے لیکن میں اس کے احترام کو قائم رکھنے کے لیے یہ جرم کر گزروں گا اور اگر اُس نے مجسٹریٹ کو بیان دیتے کوئی گڑبگڑ کی تو میں اسے اس عورت کے خاوند کے قتل کے جرم میں سزائے موت دلا دوں گا۔

”کیا وہ مر گیا ہے؟“ — اُس نے پوچھا۔

”ہاں! — میں نے جواب دیا۔“ وہ مر گیا ہے۔“

اُسے مجسٹریٹ کے پاس لے گیا۔ اس نے بھی ڈپنسر کی طرح میری مرضی کے مطابق بیان قلمبند کرا دیا۔ اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ میں واپس آیا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اسے۔ ایس۔ آئی ڈپنسر کی بیٹی

کو اور اُس نوجوان کو لے آیا تھا۔ میں نے آپ کو پہلے یہ نہیں بتایا کہ ان کی شناخت کے لیے نوجوان کے باپ اور لڑکی کے بڑے بھائی کو اسے۔ اس نے آئی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ دونوں ہتھانے میں بیٹھے تھے۔ لڑکی رو رہی تھی۔ بخدا مجھے بھی رونا آگیا۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ میرے دفتر میں پنج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے بھگالے جانے والا اُس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ شاید اپنے آپ کو چالاک اور ہوشیار سمجھتا تھا۔ میرا ہاتھ لڑکی کے سر پر تھا۔ وہ اٹھا اور بڑی پختہ آواز میں بولا۔ ”دیکھو صاحب! میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں نے اسے اغوا نہیں کیا تھا، یہ خود میرے ساتھ گئی تھی۔“

میں نے پوری طاقت سے ویسا ہی تھپڑ اُس کے منہ پر مارا جیسا مولوی کو مارا تھا۔ مولوی تو جسم جتنے والا تھا، مجھ سے تین چار قدم دُور گرا تھا، یہ نوجوان چھ سات قدم دُور دیوار سے جا لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل اندر آگیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اسے پھیلے کرے میں جا کر بند کر دو۔ ہیڈ کانسٹیبل اُسے لے گیا تو میں نے لڑکی کے بھائی کو اندر بلا کر کہا کہ اپنی بہن سے کہو کہ مجھے تمنا نیدار نہ سمجھے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارا باپ بن کر دکھاؤں گا۔

بھائی۔ نے بہن کو سمجھا دیا۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر ہار نکالا۔ بھائی نے ہار پہچان لیا۔ میں نے اُسے باہر بھیج دیا۔ لڑکی کو اپنے قریب بٹھا کر اُس کے دل سے پولیس اور اس کے جرم کی دہشت نکالنے کی کوشش کی۔ اس کیفیت میں مجرم تنکوں کے سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ یہ تو پردہ نشین لڑکی تھی۔ اس نے میری شفقت قبول کر لی۔ اس نے میرے کہنے پر برقعے کا نقاب

اٹھا دیا۔

”میں جو پوچھوں مجھے بالکل صحیح بتا دینا تاکہ میں تمہیں سچا سکوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں گرفتار نہیں کرنا چاہتا، تمہیں گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔۔۔ ہار اور روپے تم نے ٹنک سے نکالے تھے؟“

”جی!۔ اُس نے کچھ سر ہلایا کچھ سر گوشی کی۔ یہ چوری اسی نے کی تھی۔“

مجھے پہلے روز ہی شک ہو گیا تھا کہ چور اسی گھر میں موجود ہے۔ مجھے شک اس لڑکی کے بڑے بھائی پر تھا۔ آگے چل کر لڑکی پر بھی شک ہوا تھا لیکن میری توجہ بڑے بھائی پر تھی۔ میں نے اسی شک کی بنا پر ڈپنسرس سے کہا تھا کہ میں چور پکڑ دوں گا لیکن رپورٹ درج نہیں کروں گا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ ایک مسلمان گھرانہ بدنام نہ ہو۔ اندر ہی اندر معاملہ دب جائے۔ اس بد بخت نو سرباز مولوی نے ایسے حالات پیدا کر رکھے تھے کہ ڈپنسرس میری بات سمجھ نہ سکا۔ اب اس گھر کی ایک لڑکی چوری کا اعتراف کر رہی تھی۔ میں اسے سچانا چاہتا تھا۔

میری حوصلہ افزائی اور مشفقانہ سلوک کے زیر اثر اس نے اپنا سینہ میرے آگے کھول دیا۔ میں ہمدردی کا اظہار کرتا گیا اور وہ بولتی گئی۔ مختصر یہ کہ وہ باپ کے سلوک اور اتنی کڑی پابندیوں سے تنگ آگئی تھی۔ ان کے گھر میں کبھی کوئی ہنسنا اور مسکرایا نہیں تھا۔ باپ صرف ڈانٹتا ہی نہیں تھا بلکہ دونوں بیٹیوں پر شک کرتا رہتا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز میں طنز ہوتی تھی۔ کوٹھے پر بیت الخلاء میں دیر لگ جائے تو باپ پوچھتا تھا کیوں دیر لگی۔ یہ الفاظ اس کی زبان پر رہتے تھے۔ ”اوپر جا کر کسے دیکھتی رہی ہو۔“

نماز اس انداز سے پڑھنے کو کہتا تھا کہ بہن بھائیوں کے دل میں سے نماز کی پسندیدگی ختم ہو گئی تھی۔ وہ نماز خدا کے حکم سے نہیں باپ کے حکم سے پڑھتے تھے۔

اس لڑکی نے بتایا کہ اس کے لیے اور اس کے بہن بھائیوں کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک وقت وہ ہوتا تھا جب ان کا باپ ان کی مال کو مارتا پٹیتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ماں کو مارنے لگتا تھا۔ مختصر یہ کہ گھر جہنم بنا ہوا تھا۔ لڑکے تو باہر گھوم پھر لیتے تھے، مصیبت لڑکیوں کے لیے تھی جو دروازے میں ذرا سا پردہ اٹھا کر ایک آڈیٹ منٹ کے لیے کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لڑکی نے بتایا کہ اس کی چھوٹی بہن تو پتھر بن گئی ہے جیسے وہ جوان ہوئی ہی نہیں اندر ہی اندر مگر یہ بڑی لڑکی اپنے من کو نہ مار سکی۔ ایک طرف تو باپ انہیں باہر کی ہوا سے بھی بچائے پھرتا تھا دوسری طرف یہ عالم کہ اس مولوی جیبا مجرم انسان کھلے بندوں ان کے گھر آتا تھا۔ دو بار بڑی لڑکی مولوی کے ہاں گئی۔ مولوی نے اسے اپنے مجال میں پھانسا لیا۔

## پتھی پنجرہ تو لڑ گیا

”اس شخص نے محبت کا اظہار کیا تو مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور یہ کتنی پر لطف ہے۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”اگر یہ محبت مجھے اپنے باپ سے مل جاتی تو میں خراب نہ ہوتی۔“

محبت کے اس پہلے ذائقے نے لڑکی کے اندر یہ احساس بیدار کر دیا کہ وہ پنجرے میں بند ہے۔ اس احساس نے اسے کوٹھے پر تانک جھانک کا عادی بنایا اور چند دنوں بعد اس کی نظریں اس نوجوان پر ٹھہر گئیں۔ آپ لڑکی کو آوارہ اور بد معاش کہیں گے۔ انسانی نفسیات کی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی رائے کچھ اور ہے اور یہی رائے صحیح ہے۔ ان دونوں کے درمیان پہلے اشارے ہوتے رہے پھر اس نوجوان نے یہ دلیری کی کہ ایک رات کو کٹھوں کے اوپر اُپر سے لڑکی کے کوٹھے پر آگیا۔ اس سے پہلے یعنی دن کے وقت لڑکی کو لڑکے کا پیغام ملا تھا۔

پیغام لانے والی کون تھی؟ — میری وہی مخبر عورت جس نے مجھے رپورٹ دی تھی کہ ڈسپنسر کی بڑی بیٹی ایک نوجوان سے چوری چھپے ملتی ہے۔ میں نے آپ کو اس قسم کی عورتوں کے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ یہ پیغام رسائی بھی کرتی ہیں، مخبری بھی کرتی ہیں۔ اس عورت نے بھی دونوں کام کیے۔ وہ اس فن کی ماہر تھی۔ لڑکی کی اس نوجوان کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تو اُس نے اسے محبت بھی دی اور جذباتی سہارا بھی دیا۔ اس کے بعد اس کی حوصلہ افزائی یہ مخبر عورت کرتی رہی۔ کوٹھے پر رات کے وقت بہت ہی مختصر تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار باپ نے پکڑ لیا اور اسے مارا مار کر بے ہوش کر دیا۔

لڑکی کو باہر کا سہارا مل گیا تھا۔ اُس نے اس عورت کی وساطت سے نوجوان کو اوپر بلا لیا۔ اُس روز ڈسپنسر اپنی بیوی کے ساتھ کسی رشتہ دار کی نادری پر چلا گیا تھا۔ دن کو لڑکی کے دونوں بھائی گھر سے چلے گئے۔ اس کی

چھوٹی بہن کو آزادی ملی تو بڑھی بہن نے اُسے پڑوسیوں کے گھر بھیج دیا۔ اُس نے باہر کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ ٹرکوں والے مکر سے میں جا کر زیورات والے ٹرنک کے اوپر سے دونوں سوٹ کیس اور ایک ٹرنک اتارا۔ نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا اور ہار اور رقم نکال کر چھپا دی۔ اس نے صرف ہار اس لیے نکالا تھا کہ یہ زیادہ قیمتی تھا۔ اسے بیچنے کا ارادہ تھا۔ اس نے ٹرنک اسی طرح رکھ دیئے جس طرح رکھے رہتے تھے۔

رات کو ٹھے پر وہ نوجوان آگیا۔ لڑکی نے اُسے ہار اور رقم دے کر کہا کہ وہ اُس کے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہے اور یہ ہار اور رقم اسی مقصد کے لیے ہے۔ وہ ہار اور رقم لے گیا۔ لڑکی کو لڑکے کے پیغام کا انتظار آٹھ دس روز کرنا پڑا۔ ایک روز چوری کا انکشاف ہو گیا۔ اور جب ڈپنہ گرفتار ہو گیا تو نوجوان کا پیغام ملا۔ لڑکی رات کو نکل گئی۔ لڑکا باہر انتظار میں تھا۔ وہ رات کی گاڑی سے نکل گئے۔ لڑکا اسے اپنے دوست کے گھر لے گیا تھا مگر دوسری رات یہاں (دھبے) سے اس دوست کے گھر کا پکا آدمی وہاں پہنچا اور اسے بتایا کہ پولیس نے اُس کا ایڈریس پوچھا ہے، اگر تمہارا دوست تمہارے گھر ہے تو اُسے فوراً گھر سے نکال دو۔ دوست نے ان دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ دوست کی بیوی پہلے ہی انہیں گھر پہنچنے پر آمادہ نہیں تھی۔

دونوں کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کچھ رقم لڑکا بھی گھر سے لے گیا تھا۔ وہ بیکار گھومتے پھرتے رہے۔ رات کی گاڑی

انہوں نے دتی جانے کا فیصلہ کیا لیکن وہ جذبات کے زیر اثر گھروں سے بھاگے تھے۔ اس نوجوان نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ گھبراہٹ میں لڑکی کو ساتھ لیے آوارہ پھرتا رہا اور دونوں پکڑے گئے۔

نوجوان کا تفتیش کے خصوصی کمرے میں بیان لیا۔ اُس نے لڑکی کے بیان کی تصدیق کی۔ میں لڑکی کو مزید ذلت سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر مجھے لڑکے کو بھی چھوڑ دینا تھا۔ میں نے لڑکی کے بھائی کو اور لڑکے کے باپ کو اندر بلایا اور ایسی کارروائی شروع کر دی جس کا نتیاداری کے فرائض کے ساتھ دور پار کا بھی تعلق نہیں تھا۔ میں نے لڑکے کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کر دے۔ اگر اس نے ہیرا پھیری کی تو میں اس کے بیٹے کو چوری اور اغوا میں آٹھ دس سال کے لیے اندر کرادوں گا۔

باپ مان گیا۔ لڑکا پہلے ہی رضا مند تھا۔ اُس کے باپ کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ اُسے کم از کم پانچ سال منرا ضرور ملے گی۔ میں اس کو فرستان میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے مسلمانوں کی عزت اور وقار کا بہت خیال رکھتا تھا مگر بعض مسلمانوں کو اپنے وقار کا کوئی خیال نہیں تھا۔

میں نے ہار اور رقم کی چوری کا کیس دبا لیا۔ لڑکی اور لڑکے کو گھر بھیج دیا۔ ڈپنسر اور اُس کے مُرشد نو سر باز کے کیس کا فیصلہ چار ماہ بعد ہوا۔ میں نے کیس بڑھی محنت سے تیار کیا تھا۔ ڈپنسر کو چھ سال اور مولوی کو دو سال سزائے قید ہوئی۔ ان کی اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔

اس کے فوراً بعد ڈپنسر کی بیٹی کی شادی اس نوجوان کے ساتھ کر دی گئی۔

اس علاقے سے واقف تھا۔ چٹانی اور جنگلاتی علاقہ تھا۔ وہاں استاد  
 رہن اور ڈگریت بھی تھے۔ ڈگریت کی منظم واردائیں بھی ہوتی تھیں۔ اگر تھانیدار  
 اغوا ہی ہوا تھا تو کسی منظم گروہ کی واردات معلوم ہوتی تھی۔

اس تھانیدار کو میں جانتا تھا۔ دلیر اور رنگین مزاج تھا اور کبھی کبھی  
 احمقانہ حرکتیں بھی کیا کرتا تھا۔ کسی کی ماننا اور سنا نہیں تھا۔ اپنی کرتا تھا۔  
 مجھے اس امکان کا بھی شبہ ہوا کہ خود ہی کہیں جا گیا ہو گا اور ہو سکتا ہے  
 کہ بھگوڑا ہو گیا ہو۔ ایسی حرکت بعید از قیاس نہیں تھی۔ وہ آدمی کچھ ایسا ہی  
 تھا۔ اس کی عمر ابھی تیس سال نہیں ہوئی تھی۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا  
 اور ذہنی لحاظ سے نابالغ۔ غور و نظر اور جسم کی ساخت سے باسگر لگتا تھا۔  
 رنگ روپ صاف ستھرا تھا اور وہ خوش طبع بھی تھا۔

میں حکم ملتے ہی روانہ ہو گیا۔ وہ قصبہ بارہ میل دور تھا۔ علاقے کی تجارت  
 کامرکز ہونے کی وجہ سے یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اکثریت ہندوؤں کی  
 تھی۔ اردگرد کے دیہاتی علاقے میں بھی ہندو اکثریت میں تھے۔ دولت  
 اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔

متعلقہ تھانے میں ایک ہندو اسے ایس آئی (اسسٹنٹ سب  
 انسپکٹر) نے میرا استقبال کیا۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر  
 دیا۔ تھانیدار کی گمشدگی کی جو کہانی مجھے سنائی گئی وہ اختصار سے یوں تھی  
 کہ سات آٹھ دن گزرے ایک ہندو ساہوکار دیہاتی علاقے میں اپنے  
 مقروضوں سے وصولیاں کرنے گیا۔ اس کام کے لیے ہر ماہ اس کا منشی یا

## جذبات کے جنگل میں

تھانیدار جو میرے پڑوس کے تھانے کا انچارج تھا، ایک  
 تفتیش کے دوران لاپتہ ہو گیا۔ کہا جاسکتا تھا کہ وہ قتل کی جس واردات  
 کی تفتیش کر رہا تھا اس کے گناہ ملزموں نے اسے اغوا کر کے کہیں قتل  
 کر دیا اور لاش غائب کر دی ہے یا اس سے اپنی شرائط منوانے کے  
 لیے اسے صرف اغوا کیا ہے۔

مجھے اپنے بالائی حکام سے حکم ملا کہ میں اس تھانے میں چلا جاؤں  
 اور گمشدہ تھانیدار کی تلاش کروں اور ملزموں کو گرفتار کر کے ان کو سزا  
 دلاؤں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کام کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر سے کوئی  
 اور سب انسپکٹر بھیجا جاتا لیکن انگریز بادشاہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی خوش تھے  
 جس کی سزا مجھے اس قسم کی فائنڈ لیوٹیوں کی صورت میں بلا کرتی تھی۔

تھانیدار کا اغوا بڑی سنگین واردات تھی۔ سنگین کے علاوہ مجھے اس  
 واردات کا یہ پہلو پریشان کر رہا تھا کہ جن ملزموں نے ایک تھانیدار کو اغوا  
 کر لیا ہے وہ کوئی انارڈی لوگ نہیں پختہ کار جرائم پیشہ ہوں گے۔ میں



ایسی واردات کوئی عجوبہ نہیں تھی۔

واپسی پر، قصبے سے کوئی تین سائڑھے تین میل دُور، ایک آدمی ایک ٹیکری پر کھڑا دیکھا۔ بیٹا اور منشی قریب سے گزرے تو اس آدمی نے کہا: ”کیسا کلجگ ہے۔ گدھ ایک لاش کو کھا رہے ہیں۔ اسے کسی نے قتل کیا ہوگا۔“

ساہوکار کا بیٹا ٹیکری پر گیا تو کچھ دُور اُسے پانچ سات آدمی نظر آئے۔ وہ ایک جگہ اکٹھے کھڑے تھے۔ درختوں پر اور قریب کی چٹان پر بہت سے گدھے بیٹھے تھے۔ یہ آدمی جو ٹیکری پر کھڑا تھا لاش دیکھ آیا تھا بلکہ بھاگ آیا تھا۔ ساہوکار کے بیٹے کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ لاش کسی دیہاتی کی نہیں شہری کی معلوم ہوتی ہے۔ ساہوکار کا بیٹا آگے چلا گیا۔ لاش کے قریب گیا تو اُسے شناخت میں ایک سانس جینی بھی دیر نہ لگی۔ یہ اُس کے باپ کی لاش تھی۔ اتفاق سے چہرہ محفوظ تھا۔ گدھوں نے پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں وغیرہ کھالی تھیں۔ باقی جسم پر کہیں کہیں گوشت رہ گیا تھا۔ پسلیاں ننگی ہو گئی تھیں۔ ساہوکار کے بیٹے نے لاش کے پاس کھڑے آدمیوں کو بتایا کہ یہ اُس کے باپ کی لاش ہے اور وہ تھانے جا رہا ہے، اتنی دیر وہ وہیں کھڑے رہیں۔

بیٹا منشی کو ساتھ لیے قصبے کو گیا اور تھانے میں رپورٹ دی۔ میٹھان تھانیدار جو بعد میں لاہور ہو گیا تھا جائے واردات پر گیا۔ اس نے لاش پوسٹارٹم کے لیے بھجوانے کا انتظام کیا اور مقتول ساہوکار کے بیٹے کے

بیٹا جابا کرتا تھا۔ اگر کوئی مقروض پریشان کرے تو وہ خود جاتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندو ساہوکار سُود پر قرضے دیتے ہیں۔ سُود اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والا سُود ہی ادا کرتا رہتا ہے اور اصل رقم جوں کی توں سر پر موجود رہتی ہے۔

یہ ہندو ٹیٹو پر سوار ہو کر صبح سویرے ایک گاؤں کو روانہ ہوا جو قصبے سے سات آٹھ میل دُور تھا۔ علاقہ چٹانی تھا اور جنگل کی طرح دخت بہت تھے۔ رہزنی کے لیے علاقہ موزوں تھا۔ شام تک ساہوکار واپس نہ آیا تو گھر والوں نے سمجھا کہ دوسرے مقروضوں کے ہاں بھی چلا گیا ہوگا۔ رات آدھی ہونے کو آئی۔ ساہوکار نہ آیا تو کھد پید ا ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی مقروض نے اُسے یا اُس کے بیٹوں کو رات کے لیے اپنے ہاں مہمان ٹھہرا لیا ہو۔ ساہوکار کے سُسرال دیہاتی علاقے میں تھے۔ شاید وہاں چلا گیا ہو گا لیکن وہ اپنی بیوی کو بتا کر نہیں گیا تھا کہ وہ اُس گاؤں بھی جائے گا۔

دوسرے دن دس گیارہ بجے تک ساہوکار نہ آیا تو اس کے بڑے بیٹے نے اپنے منشی کو ساتھ لیا۔ دونوں ٹیٹوؤں پر سوار ہو کر اُس گاؤں گئے جہاں ساہوکار گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ دوپہر کے وقت واپس چلا گیا تھا بیٹا اپنے باپ کے سُسرال کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ ساہوکار وہاں گیا ہی نہیں۔ بیٹا واپس چل پڑا۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی کہ ساہوکار قتل یا اغوا ہو گیا ہے۔

بیان پر اُس گاؤں گیا جہاں ساہوکار وھولی کے لیے گیا تھا۔ اُسے تنگ تھا کہ قتل میں اس مقروض کا ہاتھ ہوگا۔

گاؤں کے کئی لوگوں نے بتایا کہ ساہوکار گاؤں سے چلا گیا تھا اور اُس کا یہ مقروض گاؤں سے نہیں نکلا تھا۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ کسی مقروض نے تنگ آکر اپنے ساہوکار کو قتل کر دیا ہے۔ کسی ساہوکار سے قرض لے کر اس سے گلو خلاصی کرانا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان بڑھ مقروض تو زیادہ پریشان رہتے تھے کیونکہ وہ حساب سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور ساہوکار انہیں اپنے ظالمانہ حال میں پھانسنے رکھتے تھے۔ اگر کسی مقروض کی ہویا بیٹی جوان ہو تو اُس پر دست درازمی تک کرتے اور قرض میں یعنی سود میں محفوظی سی چھوٹ دے دیتے تھے۔ غریب لوگ اس بے عزتی کو بھی برداشت کرتے تھے۔

## سوئی ماں، جوان بیٹا

تھانیدار ساہوکار کے اس مقروض کو تھانے لے گیا۔ اُس نے اس علاقے کے دوسرے مقروضوں کو بھی تھانے بلالیا۔ ان کی تعداد تین یا چار تھی۔ ساہوکار کے بیٹے اور منشی سے پوچھا گیا کہ ان میں کس کے حساب میں کتنا قرض تھا اور ان میں سے کون ماہوار ادائیگی میں پس و پیش کرتا تھا۔ تھانیدار کو بتایا گیا کہ کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی اور کسی

نے کبھی دھکی نہیں دی بلکہ ذرا اسی بدسلوکی بھی نہیں کی تھی۔ تھانیدار نے اپنے طریقے سے تفتیش اور پوچھ گچھ کی۔ لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم میں جو اندرونی اعضا مثلاً معدہ، تہی، دل اور جگر وغیرہ دیکھے جاتے ہیں، وہ گدھوں نے کھالیے تھے۔ چہرے اور سر کے سوا جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہ تھا جس سے پتہ چلتا کہ اسے کون سے ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ اگلی صبح تھانیدار مقتول کے گھر گیا۔ گھر میں اُس نے ایک عجیب چیز دیکھی۔ یہ انیس بیس سال کی عمر کی بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی جو مقتول ساہوکار کی بیٹی نہیں، اس کی دوسری بیوی تھی۔ مقتول کی عمر پچاس سال سے کچھ ہی کم تھی۔ عمر کی زیادتی کے علاوہ مقتول کے متعلق بتایا گیا کہ بھڑے اور چھوٹے بھڑے جسم کا ٹھنکنا سا آدمی تھا اور بدصورت بھی ہندو بیٹے قدرتی طور پر مکروہ صورت ہوتے ہیں اور ان کی عادتیں تو بہت ہی مکروہ ہوتی ہیں۔ اس مقتول ساہوکار کے متعلق بتایا گیا کہ اس کی پہلی بیوی مر گئی تھی۔ چھ ہی ماہ بعد اس نے اپنے ایک مقروض کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شادی واردات سے چھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔

اسی گھر میں جہاں اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی تھی وہاں ساہوکار کے دو بیٹے بھی تھے۔ ایک اس لڑکی سے ڈیڑھ دو سال بڑا تھا اور دوسرا ڈیڑھ دو سال چھوٹا۔ جوان سوئی ماں، اس کا جوان سوتیلا بیٹا اور اس بیٹے کا بوڑھا اور بھڑا بابا قتل یا خودکشی یا اغوا کی واردات کا ایک تیر بہدف نسخہ ہوتا

تھانیدار جب تفتیش کے لیے جاتا ہے تو اُس کا سٹاف اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل پوری طرح ساتھ ہوتا ہے۔ اے ایس آئی ساتھ نہیں ہوتا لیکن وہ تھانہ انچارج کا دست راست ہوتا ہے تھانیدار اُسے اپنی کارگزاری بتاتا رہتا ہے مشورے بھی لیتا ہے۔ یہ درستی بات ہے کہ تھانیدار اور اس کا اسٹنٹ وارداتوں کے معلق آپس میں باتیں کرتے ہیں اگر ان میں سے کوئی رشوت لے تو وہ دوسرے سے چھپاتا نہیں۔ حصہ بانٹتے ہیں۔

## لڑکی کی خوبصورتی، عجیب و غریب پراسرار

اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کسی بھی تفتیش سے بے خبر رہ ہی نہیں سکتے۔ وہ مجبوروں کو استعمال کرتے اور ان سے رپوٹیں لیتے ہیں۔ تھانیدار کو بتاتے ہیں، مگر اس واردات میں مجھے یہ عجیب بات سنائی گئی کہ اس گمشدہ تھانیدار نے پہلے دو روز اے۔ ایس۔ آئی (یہ ہندو تھا) کو اور اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو تفتیش سے باخبر رکھا۔ اس کے بعد اُس نے انہیں بے خبر رکھنا شروع کر دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ واردات کے اگلے روز وہ مقتول کے گھر گیا۔ بہت دیر بعد واپس آیا۔ اُس کے ساتھ ایک ایسی خوبصورت لڑکی تھی جس کی خوبصورتی عجیب و غریب تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اے۔ ایس۔ آئی

ہے۔ اگر بوڑھا قتل ہو جائے تو پولیس سب سے پہلے اُس کی جوان بیوی اور جوان بیٹے پر ہاتھ رکھتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بیٹا بے گناہ ہو تو اُس کی سوتیلی ماں بے گناہ نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق کسی اور کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس علاقے کی میں بات کر رہا ہوں وہاں ہندو ساہوکاروں اور آڑھتیوں کے ہاں یہ رواج بھی تھا کہ ان کے منشی مسلمان ہوتے تھے جن میں حساب کتاب رکھنے کی سوجھ بوجھ کے علاوہ غنڈہ گردی کا وصف بھی ہوتا تھا۔ اگر منشی ہندو ہو تو ان کے ہاں ایک دو ملازم مسلمان ہوتے تھے جو گلے پڑ جانے اور بیہودگی پر اتر آنے کی مہارت رکھتے تھے۔ اس قسم کے منشیوں اور ملازموں کا استعمال یہ ہوتا تھا کہ کسی کے پاس رقم پھنس جائے تو وہ نکلوا لاتے تھے۔

میں آپ کو ایک کہانی سنا چکا ہوں جس میں ایک مسلمان منشی ایک ہندو آڑھتی کی جوان بیوی سے منسک تھا اور ایک بھیا نک واردات کا باعث بنا تھا۔ اب جو واردات میرے سامنے آئی اس میں بھی منشی مسلمان تھا۔ مجھے اس منشی کی چھان بین کرنی تھی۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ لاپتہ ہو جانے والے تھانیدار نے اس منشی کو شامل تفتیش کیا تھا یا نہیں میں ابھی معلوم کر رہا تھا کہ تفتیش میں کیا کچھ سامنے آیا ہے۔ واردات کو آٹھ روز گزر گئے تھے اور تفتیش کرنے والا لاپتہ تھا۔ اس کے لاپتہ ہو جانے سے یہ فرق نہیں پڑتا تھا کہ تھانے میں کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کون سی لائن پر تفتیش کر رہا تھا اور اتنے دن وہ کس نتیجے پر پہنچا تھا۔

نے اس لڑکی کی خوبصورتی کو عجیب و غریب کہا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل پاس بیٹھا تھا۔ اُس کی حالت ایسی تھی جیسے اُس پر مقتول کی دوسری بیوی کی خوبصورتی جادو کی طرح سوار ہو گئی ہو۔ دونوں نے جھوم جھوم کر نشتے کی سی حالت میں مجھے بتایا کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ تفتیش کی بات کو آگے بڑھا ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی کیفیت بالکل ایسی ہو گئی تھی جیسے ریکارڈ پر کہیں سوئی اٹک جاتی ہے تو ریکارڈ ڈگانے کے انہی ایک دو لفظوں کو ڈھرتا رہتا ہے جن کی کیر میں سوئی اٹک جاتی ہے۔ میں نے انہیں اس کیفیت سے نکالا اور بات بات سنی۔

وہ اس لڑکی کی خوبصورتی کو عجیب و غریب کہنے میں حق بجانب تھے۔ اس علاقے میں خوبصورتی نایاب چیز تھی۔ شہروں میں کسی کا رنگ ذرا صاف ستھرا نظر آجاتا تھا۔ مسلمانوں کے نقش و نگار قدر سے اچھے تھے۔ ہندوؤں میں خوبصورتی نام کو نہیں تھی۔ دیہاتی علاقے میں تو گہرا سانولا رنگ ملتا تھا۔ کسی کے نقش اچھے ہوں تو اُسے خوبصورت کہ لیا جاتا تھا یا کسی لڑکی کا رنگ گندمی ہو تو اُسے خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ اس لڑکی کے متعلق بتایا گیا کہ رنگ سفیدی مائل گندمی، جلد ملائم اور صاف، آنکھیں سبز اور شہرتی کے بلے جُبلے رنگ کی تھیں۔ بال گہرے بادامی اور قد بہت اچھا۔

اس علاقے میں خوبصورتی کا یہ معیار واقعی عجیب و غریب تھا۔

میں اگر اسے پُر اسرار کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ بعد میں جب میں نے اس لڑکی کے باپ کو اور اس کی ماں کو دیکھا تو میں اور زیادہ حیران ہوا۔ ان دونوں کی بیٹی کو سفیدی مائل گندمی رنگ کا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آنکھوں اور بالوں کا بھی یہ رنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ لڑکی کی ایک بہن بھی اور ایک بھائی۔ دونوں کے رنگ گہرے سانولے اور اپنے ماں باپ کی شکل و صورت کے تھے اور اپنے علاقے کی صحیح تصویر تھے۔

میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں بھی لڑکی کی خوبصورتی میں پھنس گیا ہوں اور بات لمبی کر دی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس لڑکی کو تھانے میں لا کر تھانیدار نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو بتایا کہ اُسے اس لڑکی پر شک ہے کہ اس نے خاوند کو قتل کرایا ہے۔ اُس نے اس شک کا بھی اظہار کیا کہ قتل میں مقتول کے دونوں بیٹوں میں سے بھی ایک کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور منشی بھی مُشتبہ ہے۔ تھانیدار مقتول کے دونوں بیٹوں اور منشی کو بھی تھانے لے آیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی کا خیال تھا کہ مقتول رہزنوں کا شکار ہوا ہے۔ تھانیدار کہتا تھا کہ رہزن ٹوٹا کرتے ہیں قتل نہیں کیا کرتے۔ ان کے ہاتھوں وہ لوگ قتل ہوتے ہیں جو ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس ہندو ساہوکار میں مقابلے کی ہمت کہاں تھی۔

تھانیدار نے رات کو لڑکی کو تفتیش کے کمرے میں رکھا۔ اُس رات اُس نے کسی اور مُشتبہ کو تفتیش کے کمرے میں نہیں بلایا۔ اُس نے رات کے آخری پہر لڑکی کو ایک کانسٹیبل کے ساتھ گھر بھیج دیا اور مقتول کے

گھر جاتا تھا۔ دیہات سے وہ جن افراد کو مشتبہ بنا کر لایا تھا انہیں فارغ کر دیا۔ سات آٹھ دن گزر گئے۔

## تھانیدار لڑکی کے ساتھ لاپتہ

ایک شام اُس نے دو گھوڑے منگوائے اور اپنے سٹاف سے کہا کہ وہ لڑکی کو اُس کے گاؤں لے جا رہا ہے کیونکہ وہ ایک نشاندہی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ تھانیدار نے یہ نہ بتایا کہ یہ کیسی نشاندہی ہے۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ وہ اکیلا جا رہا ہے، سب کو حیران کر دیا۔ وہ کسی کانسیبل تک کو ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔ یہ لڑکی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی جو قصبے سے پانچ چھ میل دُور تھا۔

تھانیدار کو دن کے وقت جانا چاہیے تھا مگر وہ سورج غروب ہونے کے بعد جا رہا تھا۔ اُسے کہا گیا کہ علاقہ خطرناک ہے وہ رات کو نہ جائے۔ اگر رات کو یہی جانا ہے تو تین چار کانسیبل ساتھ لیتا جائے۔ اُس نے کہا کہ لڑکی نے ایک گھر سے راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ وہ لڑکی کے ساتھ اُس کے گاؤں جا رہا ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں جائے گا۔ کانسیبل ساتھ ہوئے تو بھی ظاہر ہو جائے گا کہ پولیس جا رہی ہے۔ اُس کے پاس ریو لور اور اٹھارہ گولیاں تھیں جن میں سے چھ ریو لور میں بھری تھیں۔

دونوں بیٹوں اور نشی کو تھانے میں پابند رکھا۔ اُس نے اے ایس آئی کو بتایا کہ لڑکی سخت ہے اور عقل والی ہے۔ اُس نے ساری رات ہمت نہیں ہاری اور کوئی سراغ نہیں دیا۔ دن کے دوران اُس نے مقتول کے بیٹوں کو سامنے بٹھایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد انہیں گھر بھیج دیا اور نشی کو بلایا۔ اس کے ساتھ اُس نے زیادہ وقت صرف کیا۔ آخر اسے بھی گھر بھیج دیا۔

اس کے بعد اُس نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسیبل کو اپنی جو کار گزار سی بتائی اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ رازداری سے کام لے رہا ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی کے پوچھنے پر بھی اُس نے اس طرح تفصیل سے جواب نہ دیا جس طرح ایک تھانیدار اپنے اسٹنٹ کو دیا کرتا ہے۔

رات کو تھانیدار مقتول کے گھر چلا گیا۔ اپنے ساتھ وہ ایک بھی کانسیبل کو نہیں لے گیا اور وہ وردی میں بھی نہیں گیا۔ رات بہت دیر بعد واپس آیا۔ دوسرے دن اُس نے بتایا کہ لڑکی کے دل میں ایک راز ہے جو وہ تشدد سے نہیں نکال سکتا۔ وہ محبت اور پیار کا حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کے بعد اُس نے اپنی تفتیش پر پردہ ڈال دیا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو اُس نے دوسری وارداتوں کی تفتیش کا مختار رکھ بنا دیا اور اس واردات سے لاطعن کر دیا۔ ہیڈ کانسیبل وغیرہ کو بھی اُس نے ادھر ادھر کی ڈیوٹیاں دے کر ساہوکار کے قتل کی تفتیش سے دُور ہٹا دیا۔ وہ ہر روز مقتول کے

علم نہیں تھا۔ دو گھوڑوں کا رات کو گاؤں میں آنا چُھپ نہیں سکتا تھا۔ اس ہندو اے۔ ایس۔ آئی نے اپنے طور پر یقین کر لیا کہ تھانیدار گاؤں میں نہیں گیا۔ تھانیدار نے یہی بتایا تھا کہ وہ لڑکی کے گاؤں جا رہا ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی اُس گاؤں چلا گیا جہاں مقتول وصولی کے لیے گیا اور واپسی پر قتل ہو گیا تھا۔ تھانیدار وہاں بھی نہیں گیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ایک دن اور ایک رات انتظار کیا۔ اگلے دن ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی کہ تھانیدار لاپتہ ہے۔

اے۔ ایس۔ آئی نے اپنے طور پر جو تفتیش کی تھی اس سے میں نے کچھ اشارے لیے۔ یہ ہندو عقل مند تھا۔ اس سے مجھے کارآمد مشورے ملے لیکن میرا اندازہ اپنا تھا۔ قتل کی اس واردات کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے ذمے تھانیدار کی تلاش تھی اور اسے اغویا قتل کرنے والے ملزموں کی گرفتاری اور مقدمہ تیار کر کے عدالت میں پیش کرنا میرا کام تھا لیکن وہ گرفتاری اور مقدمہ تیار کر کے عدالت میں پیش کرنا میرا کام تھا لیکن وہ قتل کی تفتیش کرتے کرتے لاپتہ چھوڑا تھا اس لیے مجھے قتل کی واردات کی بھی چھان بین کرنی تھی۔ سزاغ اسی سے مل سکتا تھا۔ نظر مجھے بھی ہی آ رہا تھا کہ تھانیدار رات کے وقت لڑکی کے ساتھ گیا اور رہنروں کے ہاتھ آ گیا۔ اُس نے مقابلے کی کوشش کی ہوگی۔ مارا گیا ہوگا۔ شاید اُسے کوئی مجرم جانتا ہو کہ یہ تھانیدار ہے اس لیے اُس کی لاش دفن کر دی گئی اکیس اور غائب کر دی گئی ہوگی مگر کچھ سوال پیدا ہوتے تھے جو ہر شک

سورج غروب ہونے کے بعد لڑکی اکیلی تھانے میں آئی۔ تھانیدار اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے تیار تھے۔ لڑکی نے موٹی جا در اس طرح اوپر لے رکھی تھی کہ اُس کا پورا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی تھانیدار اٹھا۔ باہر جا کر لڑکی کو گھوڑے پر سوار کیا۔ خود دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا اور دونوں گھوڑے چلے گئے۔ تھانیدار وردی میں نہیں گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے ان کا تھانیدار بڑی دلیری سے حماقت کر رہا ہے۔ علاقہ خطرناک تھا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ تھانیدار ایک سا ہو کار کے قتل کی تفتیش کے لیے جا رہا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ ملازم دیکھ رہے ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ واقعی دیکھ رہے تھے تو تھانیدار سیدھا اُن کے پھندے میں جا رہا تھا۔

تیسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی کو ساتھ لے جا رہا تھا۔ کوئی بھی رہزن یا ڈاکو ایسی لڑکی کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اغوا نہ کرے۔ یہ اُن کے لیے بڑی قیمتی لڑکی تھی کسی راجے ماہراجے یا کسی کاروباری آدمی سے وہ اس لڑکی کے منہ مانگے دام وصول کر سکتے تھے۔ تھانیدار چلا گیا پھر واپس نہ آیا۔ لڑکی بھی واپس نہ آئی۔ اے۔ ایس۔ آئی دوسرے دن چند ایک کانسٹیبل ساتھ لے کر لڑکی کے گاؤں گیا۔ لڑکی کے والدین نے بتایا کہ وہاں لڑکی آئی ہے نہ تھانیدار۔ اپنی لڑکی کے متعلق انہوں نے بتایا کہ جب سے شادی ہوئی ہے تین مرتبہ آئی ہے۔ گاؤں کے معزز لوگوں نے بھی تھانیدار کی آمد کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔ چونکہ لڑکی کو بھی

کورا سے میں ہی ختم کر کے کوئی اور شک پیدا کر دیتے تھے۔

## معنے اور گورگھ دھندے

تھانیدار لڑکی کورات کے وقت کیوں لے گیا؟۔ اُس نے اے۔ ایس۔ آئی کو بتایا تھا کہ وہ رازداری سے کام لینا چاہتا تھا لیکن ایسے خطرناک علاقے میں وہ اکیلا کیوں گیا؟۔ اگر وہ اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا تو وہ چارچھ کانسیٹیلوں کو دیہاتیوں کے لباس میں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اپنے آگے بھیج سکتا تھا۔ یہ حفاظت کا خفیہ نظام ہوتا۔ اس سے یہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پولیس جا رہی ہے۔ کیا یہ اُس کی بے پرواہی اور بیوقوفی تھی کہ اُس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا؟ اُس نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی تک سے تعیش کیوں چھپائے رکھی؟

وہ مقتولہ کے گھر وہی کے بغیر جاتا اور اکیلا جاتا تھا کیوں؟۔ کم از کم ایک کانسیٹیل اُس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اگر اُسے اکیلے ہی جانا تھا تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ اپنے اسٹنٹ سے رازداری کیوں؟۔ کیا اُسے یہ شک تھا کہ اس کا اے۔ ایس۔ آئی ہندو ہے اور وہ در پردہ ہندو ملزموں کی مدد کرے گا؟ کیا اُسے یہ غدر نظر آیا تھا کہ ہندو اے۔ ایس۔ آئی مقتول کی دوسری بیوی کو

قتل کے الزام سے بچانا چاہتا تھا اور تھانیدار اپنی تعیش کو راز میں رکھے ہوئے تھا؟

کیا اپنے خاوند کو لڑکی نے قتل کرایا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو کیا اُس کے کسی کے ساتھ در پردہ مراسم تھے یا اُس نے کرائے کے قابل استعمال کیے ہیں؟

کیا تھانیدار اور لڑکی کو غائب کرنے والے وہی پیشہ ور مجرم تو نہیں جنہوں نے ہندو ساہوکار کو قتل کیا ہے؟

لاپتہ تھانیدار نے اپنے اسٹنٹ کو واردات کے اگلے روز بتایا تھا کہ ساہوکار کے قاتل رہزن یا ڈکیت نہیں۔ اُسے اس لڑکی پر شک تھا۔ کیا اُس نے لڑکی پر شک کا اظہار کر دیا تھا؟ اگر کر دیا تھا تو کیا لڑکی نے اُسے اپنے حُسن کے پھندے میں پھانس کر اُسے یہ دھوکہ دیا ہے کہ وہ گاؤں چل کر ملزموں کی نشاندہی کرے گی؟ اُس نے پہلے ہی اپنے کسی آدمی کو اطلاع دے دی اور راستے میں تھانیدار کو اغویا قتل کر دیا اور خود اس آدمی کے ساتھ چلی گئی جسے وہ چاہتی تھی؟ اگر ایسا تھا تو لڑکی کو غیر معمولی طور پر چالاک ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی دیہاتی اتنی زیادہ چالاک ہو سکتی ہے میرا یہ شک اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا کہ جس آدمی کے ساتھ اُس کے مراسم تھے یا محبت تھی وہ بہت چالاک اور دلیر ہو گا۔

کیا مقتول کا قاتل مسلمان منشی ہی تو نہیں تھا؟ یا کیا منشی پیغام لے

بھگوڑا ہونے کی سزا چودہ سال تھی۔ بھگوڑا جس کاؤں کا رہنے والا ہوتا  
 اُس کے تھانے کو حکم دے دیا جاتا تھا کہ اُسے گرفتار کر کے فوج کے حوالے  
 کیا جائے۔ پولیس اُس کے گھر پر چھاپے مار تی رہتی تھی۔ یہاں سے  
 رشوت کا ایک اور ذریعہ پیدا ہو گیا۔ بھگوڑے مزے سے گھروں میں رہتے  
 اور اپنے تھانیدار کو ماہوار طے شدہ رشوت دیتے تھے مگر ہر بھگوڑا رشوت  
 نہیں دے سکتا تھا۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ بعض تھانیدار کسی بھگوڑے کی مجبوری  
 سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رشوت کا بھادو چڑھادیتے تھے۔ مجھے ایک ہندو  
 اسٹنٹ سب انسپکٹریا د ہے جس نے ایک بھگوڑے کی جوان بیوی کو  
 اپنے گھر بلایا تھا۔ یہ بھی رشوت تھی۔ بھگوڑے نے اے۔ ایس۔ آئی کو  
 قتل کیا اور غائب ہو گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ قاتل پکڑا نہیں گیا تھا۔  
 اس قسم کے بھگوڑوں میں سے بعض ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل  
 ہو گئے تھے۔ بھرتی ہونے والوں میں مفرد مجرم بھی شامل تھے اور ہتھیاری  
 سی تعداؤں کی بھی تھی جو قتل کر کے بھاگ گئے اور کہیں دُور جا کر بھرتی ہو  
 گئے۔ کچھ عرصے بعد اُن کا سراغ مل گیا اور وہ فوج سے بھاگ کر کسی جہلم پیشہ  
 گروہ میں جا ملے۔ ان بھگوڑوں نے ڈاکوؤں کے گروہوں میں اہل فوج بھی کیا  
 اور انہیں فوجی ٹریننگ بھی دے دی۔ جنگ نے دوسرا نقصان یہ دیا کہ ان  
 ڈاکوؤں کے پاس جو آبادیوں سے دُور جنگلوں میں رہتے تھے رائفلیں،  
 شین گنیں اور ایمونیشن بھی پہنچنے لگا۔ گریٹیڈ ایک عام چیز بھی جانے لگی۔  
 شین گن جنگِ عظیم کی پیداوار ہے۔

جانے اور لانے کا کام تو نہیں کرتا تھا، لڑکی اسے اُجرت دیتی ہوگی۔  
 مقتول کے بیٹوں پر شک کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اس امکان پر  
 بہت غور کیا۔ میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا تھا کہ مقتول کے کسی بیٹے نے اگر اپنے  
 باپ کی زوجان بیوی کے ساتھ درپردہ دوستانہ گانٹھ لیا ہے تو باپ کو قتل  
 کرانے سے وہ کیا حاصل کر سکتا تھا۔ یہ تو ہر نہیں سکتا تھا کہ باپ کے مر  
 جانے سے وہ باپ کی بیوی کے ساتھ شادی کر لیتا۔

اگر مجرم پیشہ در رہزن اور ڈاکو تھے تو میرا کام اور زیادہ مشکل تھا۔  
 ان لوگوں کو پکڑنا پولیس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کئی بار کسی گروہ کو فوج  
 سے گھیرا گیا پھر بھی مکمل گروہ نہ پکڑا گیا۔ آپ کی دل چسپی کے لیے بتا دوں کہ میں  
 دوسری جنگِ عظیم کے دور کی بات کر رہا ہوں۔ ڈاکوؤں کے گروہوں میں  
 بھگوڑے فوجیوں کا بھی اہل فوج تھا۔ یہ قصہ یوں تھا کہ جنگ میں فوجی  
 مکینوں کی طرح مر رہے تھے۔ جاپان نے حملہ کر کے برما کا فرنٹ بھی کھول با  
 تھا۔ ہندوستان میں فوجی بھرتی کا یہ عالم تھا کہ فوجی معیار کو نظر انداز کر دیا گیا اور  
 ہر کسی کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ ڈاکٹری لحاظ سے ناقص جوانوں کو بھی بھرتی کر لیتے  
 تھے۔ بھرتی کرنے والے بڑے دل کش مستقبل کے لالچ دیتے تھے۔ لوگ  
 دھڑا دھڑ بھرتی ہونے لگے۔ انہیں ٹریننگ سنٹروں میں واجبی سی ٹریننگ  
 دے کر آگے بھیج دیا جاتا تھا۔

بعض جوان ٹریننگ سے گھر کر بھاگ آتے تھے اور بعض فرنٹ  
 سے پہلی چھٹی پر آتے اور واپس نہیں جاتے تھے۔ جنگ میں فوج سے



## جتنی حسین اتنی ہی چالاک

میں نے سب سے پہلے اس تھانے کے اے۔ ایس۔ آئی کے کان کھولے۔ تھانے کے سارے سٹاف میں صرف دو کانٹیل مسلمان تھے۔ باقی سب ہندو تھے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ اُس کے دل میں جو کچھ ہے وہ میرے سامنے رکھ دے۔ وہ مذہب کو انگ رکھ دے۔ اگر مجھے تفتیش کے دوران پتہ چلا کہ تھانیدار کی گمشدگی میں اُس کا ہاتھ ہے یا اُس نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تھی تو میں اُسے معطل نہیں کروں گا بلکہ عام ملزموں کی طرح حوالات میں بند کر کے ایسا مقدمہ بناؤں گا جو اُسے دس سال سے پہلے جیل سے نہیں نکلنے دے گا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اگر اُس نے مقتول ساہوکار کے قاتلوں کو اس لیے پھانے کی کوشش کی اور تھانیدار کو غائب کر لیا ہے کہ قابل ہندو اور تھانیدار مسلمان ہے تو میں اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر ایک مسلمان تھانیدار کے اغوا کا انتقام غیر قانونی طریقے سے لوں گا۔ میں نے اُسے کہا "میں تمہیں تمہارے پورے خاندان سمیت غائب کر دوں گا۔"

وہ شاید میری عادتوں سے واقف تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے جو کچھ بتا چکا ہے وہ سونی صدیچ ہے۔  
"کسی نے تمہاری مُٹھی گرہ م کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میں جس علاقے کی واردات سنار ہا ہوں اس کے دیہاتی علاقے میں منظم رہنروں اور ڈاکوؤں کے دو گروہ تھے جن میں چند ایک تھگوڑے فوجی بھی شامل ہو گئے تھے اور ان کے پاس جنگ کا جدید اسلحہ بھی آگیا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ نامی گرامی ڈاکوؤں کے ساتھ پولیس خاص قسم کے فزوں کی وساطت سے رابطہ قائم کر لیا کرتی تھی۔ کسی مفروضہ کے متعلق بھی ان سے پوچھ لیا جاتا تھا۔ اُدھر سے جو جواب آتا تھا وہ بالکل صحیح ہوا کرتا تھا۔ وہ جو بات نہیں بتانا چاہتے تھے اس کے متعلق صاف جواب دے دیتے تھے کہ نہیں بتائیں گے یا یہ کہ انہیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ جو مخبری ڈاکو اور پولیس کے درمیان بیخانات کا تبادلہ کرتے تھے اُن کی مجال ہمیشہ خطرے میں رہتی تھی۔ جہاں ڈاکو کی نشاندہی ہوگی فز قتل ہو جاتا تھا۔

مجھے جب یہ خیال آیا کہ تھانیدار اور لٹ کی کو ڈاکو لے گئے ہیں تو میں گھبرا یا۔ ان سے کسی کو چھڑانا ایک تھانیدار یا اس کے عملے کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ بھی آئی کہ تھانیدار لٹ کی کو بھگا لے گیا ہے لیکن اس شک پر میرا دماغ زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا۔ اگر اسے لڑا اتنی ہی زیادہ پسند آگئی تھی تو وہ اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر سکتا تھا۔ عورت کے معاملے میں وہ اناٹھی نہیں کھلاڑی تھا۔

جو کچھ بھی تھا، ایک معرہ تھا اور بڑا ہی پُر اسرار معرہ!

”ملک صاحب! اُس نے پُر زور لہجے میں کہا۔“ خانصاحب  
 رگشدرہ تھانیدار نے مجھے اس گفتیش کے قریب نہیں جانے دیا کسی  
 برآمدگی یا نشاندہی کے لیے مجھے بھیجتے تو شاید میری مٹھی گم ہو جاتی۔ اگر  
 آپ مجھے ہندو سمجھ کر بات کر رہے ہیں تو میری ہمدردی مقتول کے ساتھ  
 بہونی چاہیے تھی۔ وہ معزز ہندو تھا۔“

”کسی مخبر سے تمہیں کچھ پتہ چلا ہوگا۔“

”آپ سن کر حیران ہوں گے کہ ننان صاحب نے مخبروں سے پتہ  
 کہ دیا تھا کہ وہ کوئی رپورٹ اُس کے سوا کسی اور کو نہ دیں۔“

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بھی خبردار کیا اور اُسے کہا کہ اُس نے مجھے  
 گمراہ کرنے کی کوشش کی تو ساری عمر اُسے جیل سے نہیں نکلنے دوں گا  
 اور اگر اُس نے میرے ساتھ تعاون میں کوتاہی کی تو اُس کے خلاف حکام  
 کارروائی کی بجائے اعانتِ جرم میں عدالت میں لے جاؤں گا۔

یہ ہیڈ کانسٹیبل بھی بے گناہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے مخبروں کو بلایا۔ ان سے مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا، ہوائے  
 اس کے کہ تھانیدار نے انہیں پہلے روز کہا تھا کہ وہ مقتول کے گھر کے  
 متعلق معلومات حاصل کریں اور اس سلسلے میں انہیں جو کچھ معلوم ہو سکے  
 وہ اُسے بتائیں، مگر دوسرے ہی دن اُس نے مخبروں میں دلچسپی لینا چھوڑ  
 دی تھی اور انہیں کہا تھا کہ وہ اُس کے سوا اتھانے میں کسی اور کو کچھ نہ بتا  
 چنانچہ انہوں نے بھی دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ میں نے ان سے جو بات

پوچھی انہوں نے جواب دیا کہ وہ معلوم کر کے بتائیں گے۔

مقتول کے منشی اور دونوں بیٹوں کو بلایا۔ مجھے یاد ہے رات کے  
 دس گیار بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ میں نے منشی کو انگ بٹھالیا اور  
 اُسے کہا کہ وہ مسلمان ہے اور میں بھی مسلمان ہوں۔ ہندو سا ہو کر کے  
 قتل کے ساتھ مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔ اگر وہ قتل کی واردات میں ملوث  
 ہے تو میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے صرف تھانیدار کی گمشدگی اور  
 تلاش کے ساتھ دل چسپی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ مجھ سے عورت  
 کروانا چاہتا ہے تو جو کچھ اُسے معلوم ہے مجھے بتا دے ورنہ جیل  
 پہنچنے تک وہ میرے ہاتھوں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہوگا۔

اس آدمی کا قد کاٹھا اچھا اور صورت بھی اچھی تھی۔ میں نے اُس کا داغ  
 بھی اچھا پایا۔ اُس نے بتایا کہ وہ مقتول کے گھر جایا کرتا تھا۔ مقتول کی دوسری  
 بیوی خطرناک حد تک خوبصورت تھی۔ میرے چند ایک سوالوں کے بعد اُس  
 نے بلا جھجک کہا۔ ”میں یہ کہنے سے نہیں ڈروں گا کہ میں نے اس  
 لڑکی کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا رویہ بالکل  
 سرد رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ساہوکار (رخاوند) کے ساتھ وہ خوش نہیں تھی۔  
 وہ موٹا اور پمپلا سا ہو کار جو آٹھ آٹھ دن نہاتا نہیں تھا اس لڑکی کو کس طرح  
 خوش رکھ سکتا تھا۔ لڑکی نے اسے اپنے باؤں میں بٹھالیا تھا۔ میں تو یہ بھی  
 کہوں گا کہ وہ اس ساہوکار سے مٹھی چپائی کرتی تھی۔“

”مجھے یہ بتاؤ۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”مگر تم نے اس کے ساتھ

کس طرح بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی اور اس نے تمہیں کس طرح دھتکارا تھا؟

”دھتکارا نہیں تھا“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”میں کوئی ایسا شریف آدمی نہیں ہوں۔ میں اس کے سامنے ساہوکار کو گالیاں دیتا اور اس لڑکی کے حُسن کی تعریفیں کرتا اور ہمدردی بھی کرتا تھا۔ وہ خانہوشی سے سنتی رہتی تھی۔ ایک روز میں نے اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ مجھے پسند کرے تو میں اُسے اس جہنم سے نکال سکتا ہوں اور اُس کے ہر کام آسکتا ہوں۔ اُس نے تحمل سے جواب دیا۔ ”میں پہلے روز ہی تمہاری نیت سمجھ گئی تھی۔ مجھے اگر تمہاری ضرورت ہوتی تو پہلے روز ہی بتا دیتی۔ مجھے اس خاوند سے اتنی نفرت ہے کہ کسی روز میرا دماغ خراب ہو گیا تو یہ شخص کسی کو زندہ نظر نہیں آئے گا۔“ میں نے اُسے کہا کہ مجھے حکم دو۔ یہ تمہیں کل زندہ نظر نہیں آئے گا۔ اُس نے کہا۔ ”لیکن تم جو قیمت مانگو گے وہ میں نہیں دے سکوں گی۔“ میں نے اُسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ کھیلوں گا نہیں۔ یہاں سے نکال لے جاؤں گا اور کہیں دُور لے جا کر شادی کروں گا۔ وہ ہنس پڑی اور بات گول کر گئی۔“

”اگر وہ تمہیں کہتی کہ اُس کے خاوند کو قتل کر دو تو تم قتل کر دیتے؟“

”جناب والا!۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرے اندر تو مضبوط دل اور سبک ہے، وہ اگر کسی مُزد دل کو بھی کہتی کہ اس خاوند سے مجھے رہائی دلاؤ میں تمہاری ہو جاؤں گی تو وہ آدمی ساہوکار کے قتل کے لیے تیار

ہو جاتا۔“

”اگر میں تمہیں کہوں کہ ساہوکار کو تم نے قتل کیا ہے تو میرا شک کس طرح رفع کر دو گے؟“

”اگر قتل میں نے کیا ہوتا تو میں آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں قتل سے پہلے لڑکی کو غائب کرتا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو قتل کے بعد لوگ یہ خبر بھی سننے کہ ساہوکار کا منشی اور بیوی لاپتہ ہیں۔“

”لڑکی چالاک تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”ساہوکار کے قتل کے متعلق تم نے بھی سوچا ہو گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ قتل اسی نے کر لیا ہے؟“

”لڑکی جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی چالاک تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ادھی بات زبان سے اور ادھی آنکھوں سے کرتی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ ہندو بننے اور ساہوکار پیسے پیسے پر جان دیتے ہیں مگر اس لڑکی نے ساہوکار کا بہت پیسہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ رقم میرے ہاتھ سے آتی جاتی تھی۔ لڑکی ان الفاظ میں مجھے اپنے خاوند کے لیے پیغام دیا کرتی تھی۔ اُسے کناڈ ریڈھ سورو پیہ جلدی بھیج دے۔“

”یہ جو پیغام دیتا ساہوکار ڈیڑھ سو روپیہ یا جتنی رقم کا لڑکی مطالبہ کرے، دے دیتا تھا۔“

”اتنی رقم کا وہ کیا کرتی تھی؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”مقتول کے بیٹے کیسے ہیں؟“

”بڑھو۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”بزدل اور کینے“

”ایسا تو نہیں کہ لڑکی نے ان میں سے کسی کے ساتھ مراسم پیدا کر رکھے ہوں؟“

”میں اپنی جان کی شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ لڑکی ان دونوں کو نوکروں سے بھی بدتر سمجھتی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ان دونوں میں اتنی جرات ہی نہیں۔“

”تم نے کبھی سوچا ہے کہ لڑکی نے اپنے گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ دل لگا رکھا ہو؟“

”میں نے تو بہت کچھ سوچا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”لیکن لڑکی کے درپردہ مراسم کا مجھے کچھ علم نہیں۔“

”جس روز ساہوکار کا قتل ہوا اس سے ایک دو روز پہلے لڑکی کہاں تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”اپنے گاؤں تو نہیں گئی تھی؟“

”پندرہ سولہ روز پہلے گئی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اُس کے ساتھ گیا تھا اور اُسے گاؤں پہنچا کر واپس آ گیا تھا۔ قتل سے چھ سات

روز پہلے مجھے ساہوکار نے کہا تھا کہ اُسے جا کر لے آؤں۔ میں کراٹے کا ٹوٹے کر گیا اور اُسے لے آیا تھا۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ ساہوکار نے اُسے پہلے بتا رکھا تھا کہ وہ کسی گاؤں میں وصولی کے لیے جائے گا؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”تھانیدار ہر روز ساہوکار کے گھر جاتا تھا۔ میں نے کہا تم نے کبھی دیکھا تھا۔ وہ وہاں کیا کرتا تھا؟“

”لڑکی کو کمرے میں بلا کر دروازے بند کر لیتا تھا۔“ منشی نے جواب دیا۔ ”تین بار ایسے ہوا کہ مجھے پتہ چلا کہ تھانیدار گھر آیا بیٹھا ہے۔

میں اس خیال سے وہاں چلا گیا کہ ساہوکار کے بیٹے بڑھو اور بزدل ہیں ڈرتے نہ ہوں۔ دو بار تو میں نے تھانیدار کو کمرے میں بند پایا۔ تیسری بار

اُس نے مجھے دیکھ لیا اور کہا کہ تمہاری یہاں کوئی ضرورت نہیں، دکان پر چلے جاؤ۔ میں چلا گیا۔ ساہوکار کے بیٹوں میں سے ایک گھر رہتا تھا۔

ایک روز وہ بیٹا جو گھر تھا وہ جہن رکان پر آ گیا۔ میں نے پوچھا کہ تھانیدار چلا گیا ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ گھر میں ہی ہے اور اُس نے کہا ہے

کہ تم بھی دکان پر چلے جاؤ۔“

”تھانیدار نے تم سے پوچھ کچھ کی تھی؟“

”اُس نے مجھ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ میں کون ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے بتا دیا۔ اس کے بعد اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔“

اپنے تھانیدار بھائی کی بے نیازی اور اُس کا شہادہ پن مجھے صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ لڑکی کے ساتھ عیش و عشرت میں مگن رہا تھا۔

میں ابھی یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کے فریب میں آ گیا تھا اور

لڑکی نے اُسے غائب کر دیا اور خود اپنی مرضی کے آدمی کے ساتھ کبھی چلی گئی۔ میری خواہش یہ تھی کہ مجھے قتل کی نفی میں نہ سرکھپانا پڑے اور کوئی ایسا راستہ مل جائے جو مجھے تھانیدار تک پہنچا دے مگر میری یہ خواہش پوری ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ اس منشی نے لڑکی کے متعلق مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ میں اُسے سیدھی سادی دیا تن سمجھتا رہا تھا۔ منشی ذہین اور کم از کم میرے ساتھ مخلص معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے مخبری بھی کرے گا۔

مقتول سا ہونو کار کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ وہ واقعی بڑھو اور بزدل تھا۔ پہلے کانپا پھر اُس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ اندر باہر سے ہندو تھا اور وہ اُن ہندوؤں میں سے تھا جو قابلِ نفرت ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ابتدا میں اُس نے میرے سوالوں کے جواب ایسے دیئے جیسے وہ بے حد غور و فکر ہو یا چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اُسے پیار سے اور پھر دھمکی سے میدھا کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں گرگئی تو چھ ماہ بعد اس کے باپ نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ لڑکی کے باپ نے ان سے سو دو پونے لے رکھا تھا اور ادائیگی کے لیے پریشان رہنا تھا۔ اُس کے پاس ہر ماہ صرف سو دو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار سا ہونو کار خود اُس کے گاؤں گیا تو اُس کی نظر اس لڑکی پر پڑ گئی۔ اُس نے لڑکی کا رشتہ لے لیا اور سو دو میں بہت سی چھوٹ دے دی۔

”گھر میں لڑکی کا سلوک اور رویہ کیسا تھا؟“

”بہت بُرا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرے باپ نے اس لڑکی کو گھر لاکر سخت غلطی کی تھی۔ گھر میں بہت مین آدمی تھے۔ میرا باپ ہیں اور میرا بھائی۔ وہ کسی کے بھی ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ اُس نے ہانڈی روٹی کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ باپ نے ہانڈی روٹی اور جھاڑو برتن کے لیے ایک نوکرانی رکھ لی تھی۔“

”نوکرانی اب کہاں ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ نوکرانی ان نفیث کے سلسلے میں بڑے کام کی چیزیں ہوتی ہیں۔

”اب اُس نے ہمارا گھر چھوڑ دیا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”جو نئی پولیس ہمارے گھر میں داخل ہوئی وہ ڈر کے مارے بھاگ گئی۔“

”کہاں رہتی ہے؟“

”رہتی یہیں ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اُس کا

گھر جانتا ہوں۔“

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو بلایا اور سا ہونو کار کے بیٹے سے کہا کہ وہ اسے نوکرانی کا گھر سمجھا دے۔ اُس نے بتایا کہ منشی اُس کا گھر جانتا ہے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ منشی کے ساتھ بیڈ کائٹل کو بیچ کر اس عورت کو تنہا لے آئے۔

”تمہارے باپ کے ساتھ لڑکی کا سلوک کیسا تھا؟“

”اُس کے ساتھ تو وہ بات بھی نہیں کرتی تھی“ بیٹے نے بتایا۔  
 ”میرے باپ نے اُس کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دومرتبہ اپنے کانوں سے سنا ہے کہ یہ لڑکی کمرے میں میرے باپ سے کہہ رہی تھی۔ ”نہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالو نہ میری جان کو۔ مجھے آزاد کر دو۔“ میرا باپ اُس کی منت سماجت کرنے لگا۔ لڑکی اُسے دھمکی دے رہی تھی کہ میں تمہیں قتل کر سکتی ہوں۔ اس کے جواب میں میرے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی۔ آخر لڑکی نے کہا ”میرے باپ کا کچھ اور قرضہ معاف کر دو۔“ میرے باپ نے پانچ سو روپیہ معاف کر دیا۔“

”کل کتنا قرضہ تھا؟“

”دو ہزار اصل رقم تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”سو دو لاکھ ساڑھے چار ہزار ہو گیا ہے۔ یہ شخص جس طرح ادائیگی کر رہا ہے اس طرح قرضہ بڑھتا جا رہا ہے گا۔۔۔۔ دوسری مرتبہ میں نے رات کو سنا۔ لڑکی میرے باپ سے کہہ رہی تھی۔ ”سو دو لاکھ پھر دو۔“ میرے باپ نے غصے سے کہا۔ ”اس سے بہتر ہے کہ میرے سگلے پر چھری پھیر دو۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں تمہیں چھری سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کوہگے تو وہ بھی پھر جائے گی۔“ میں کمرے کے بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر سننا رہا۔ باپ نے بار بار منی لائی اور کہا کہ سو دو لاکھ پھر پھر دی ہے۔ لڑکی نے کہا۔ ”اب کسی روز باقی رقم پر بھی لیکر پھر جائے گی۔“ میرے باپ نے بڑے

گرم لہجے میں کہا۔ ”یہ نہیں ہوگا۔ میں تمہارے باپ کو تمہاری بہت قیمت دے چکا ہوں۔ میں اور ایک پیسہ نہیں دوں گا، اور تم نے میری اتنی رقم کے عوض مجھے کیا دیا ہے؟ ہر رات مجھے اپنے کمرے سے نکال دیتی ہو۔ میں آج اس کمرے سے نہیں نکلوں گا۔“ لڑکی نے غضب ناک آواز میں کہا۔ ”اس کمرے سے فوراً نکل جاؤ۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”کہاں جاؤں؟“ لڑکی بولی۔ ”اپنی ماں کے پاس۔۔۔۔ جلو، اٹھو یہاں سے۔“ مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ میرے باپ کو دھتکے دے رہی ہو۔ میں وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔“

”تم بیٹے کتے جو ان اپنے بوڑھے باپ کی بے عزتی کس طرح برداشت کرتے تھے؟“

”نہ داروغہ ہمارا ج۔“ اُس نے ڈر سے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم دونوں بھائی تو اُس سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں۔ میں نے باپ سے کہا تھا کہ اسے چلتا کرے۔ گھاؤں چھوڑ آئے مگر باپ نے کہا۔ ”چلتا کیوں کروں؟ رقم خرچ کی ہے۔ ہم توجی، اُس سے دُور ہی رہتے تھے۔ دراصل جی یہ لڑکی مجھے اپنے باپ کی نظر نہیں آتی۔ اس کا باپ تو غریب سا آدمی ہے۔ لڑکی پنجاب کے کسی مسلمان یا پٹن ان ک معلوم ہوتی ہے۔“

”گھر میں دو اور انسان تھے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک نوکرانی جو تمہارے گھر میں رہتی تھی۔ دوسرا منشی جو تمہارے گھر آتا جاتا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ اُس کا سلوک کیسا تھا؟“

”بہت اچھا“ اُس نے جواب دیا۔ ”تو کوئی کے ساتھ میں نے اُسے گہری سہیلیوں کی طرح اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا ہے چند ایک بار منشی میری موجودگی میں ہمارے گھر آیا تو میری سوتیلی ماں نے اس سے کام کے علاوہ دوستانہ باتیں کیں۔“

”مثلاً کیا باتیں ہوئیں؟“

اُس نے سوچ کر جواب دیا۔ ”ایک روز اُس نے منشی سے ہنس کر کہا۔ تم اب شادی کر لو۔ منشی نے اُسی کی طرح ہنس کر کچھ کہا تو لڑکی بولی۔ ”بدمعاشی کی باتیں نہ سوچا کرو تو تم آدمی بڑے اچھے ہو۔“ منشی نے کہا۔

”وہ تو چھوڑ ہی دی ہیں، لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں۔ ابھی تمہاری آنکھوں میں کچھ کسر ہے۔ یہ بھی نکال دو۔ کہو تو اپنے گاؤں سے شادی کر دو۔“

اور وہ منشی کے ساتھ اسی طرح بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی۔“

”تو کوئی کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”چالاک ہے یا سیدھی سادھی؟“

”وہ بھی تیز عورت ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا لیکن مجبوری ایسی تھی کہ اُسے رکھنا پڑا۔“

”یہ بتاؤ کوئی ایسا آدمی ہے جسے تم نہ جانتے ہو اور وہ تمہاری سوتیلی ماں سے ملنے آتا ہو؟“

”میری موجودگی میں کوئی نہیں آیا کبھی۔“

”اپنے منشی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“

”اچھا آدمی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اس کے خلاف ہمیں کوئی

نکایت نہیں۔“

## اُس کے پاس کوئی آتا تھا

یہ آدمی مجھے بڑے کام کی باتیں بتا گیا۔ لڑکی کے متعلق مجھے یقین ہو گیا کہ نڈر ہے اور اس سا ہوکا ر سے وہ اتنی نفرت کرتی تھی کہ انتقام کی گسی بھی حد تک پہنچ سکتی تھی۔ ساہوکار کے بیٹے پر مجھے یہ شک نہ ہوا کہ اُس نے اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ مراسم پیدا کر رکھے ہوں گے۔ وہ تو اُس سے خوفزدہ تھا۔ میں نے اس کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ اُس کا بیان اپنے بھائی کے بیان کی تائید کرتا تھا۔ وہ بھی اس لڑکی سے ڈرا ہوا تھا۔ اُس نے صرف یہ نئی بات بتائی کہ ایک روز وہ گھر آیا تو سوتیلی ماں نے اسے ایک کمرے میں بھیج دیا اور کہا ادھر نہ آنا عورتیں بیٹھی ہیں۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے صحن میں قدروں کی آواز آئی جو بہت تیز تھی۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک آدمی تھا جو تیز تیز باہر نکل گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس لڑکی نے اس آدمی کو اندر بٹھا رکھا تھا۔

”وہ کوئی شہری تھا یا دیہاتی؟“

”میں نے اُس کی بیٹھ دیکھی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس وقت وہ

دروازے سے نکل رہا تھا۔ ایک سینڈ کے لیے نظر آیا اور نکل گیا۔ کپڑوں سے وہ دبائی لگتا تھا۔ قد بہت اونچا اور مضبوط تھا۔“

یہ بات بھی صاف ہو کر سامنے آگئی کہ لڑکی نے کسی کے ساتھ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ رابطہ کس کی معرفت قائم تھا۔ مجھے نوکرانی پر شک تھا۔ میں نے ساہوکار کے چھوٹے بیٹے سے پوچھا۔ ”کبھی ایسا ہوا ہے کہ تمہاری نوکرانی سارا دن غیر حاضر رہی ہو؟“ اُس نے کبھی جھٹی مانگی تھی؟

”کبھی بار ایسے ہوئے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ جھٹی صرف ہماری سوتیلی ماں سے مانگتی تھی۔“

”اُس روز گھر کا کام تمہاری سوتیلی ماں کرتی تھی؟“ میں نے ایک شک کو ذہن میں رکھ کر پوچھا۔

”ہاں!۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”سارا کام وہ خود کرتی تھی۔“

”نوکرانی اگلے روز آتی تھی یا اسی رات تمہارے گھر آتی تھی؟“

اُس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ ”وہ رات کو آتی تھی۔“

”ایسے ہوتا تھا کہ وہ تمہاری سوتیلی ماں کے پاس الگ کمرے میں جا بیٹھتی ہو؟“

”ہاں جی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”بالکل اسی طرح ہوتا تھا۔ وہ میری سوتیلی ماں کے ساتھ الگ کمرے میں جا بیٹھتی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ میری سوتیلی ماں کے ساتھ چار پائی پر بیٹھی ہوتی تھی۔ نوکروں چاکروں کو اپنے برابر کون بٹھاتا ہے؟“

”تمہاری نوکرانی کا خاوند ہے؟“

”ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں کہیں محنت مزدوری کرتا ہے۔“

”اپنے منشی کو تم نے کبھی اپنی سوتیلی ماں کے پاس بیٹھے دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس کے ساتھ وہ ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔“

گندہ تھانیدار کے متعلق دونوں بھائیوں نے وہی کچھ بتایا جو منشی نے بتایا تھا۔ تھانیدار ان کی سوتیلی ماں کو کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کر لیا کرتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنی سوتیلی ماں سے پوچھتے کہ تھانیدار نے اُس سے کیا پوچھا اور کیا کہا ہے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ تھانیدار کے چلے جانے کے بعد اُن کی سوتیلی ماں گھرائی ہوتی نہیں ہوتی تھی بلکہ مطمئن اور خوش غمش سی نظر آتی تھی۔

مجھے اطلاع دی گئی کہ نوکرانی آگئی ہے۔ میں نے دونوں بھائیوں کو گھر بھیج دیا۔ آدھی رات کا وقت ہو گیا۔ یہ سبھی اچھا سمجھا کہ نوکرانی کا خاوند بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔ آدھی رات کے وقت کسی عورت کو تھانے بلانا معمولی بات نہیں تھی۔ اُس کے خاوند کو ساتھ آنا چاہیے تھا۔ میں نے نوکرانی کو اپنے پاس بلایا۔ اُس کا خوفزدہ ہونا قدرتی تھا۔ ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اُس نے بچوں پر اور سادگی کی اداکاری کی۔ میں نے توجہ نہ دی۔

ایسی عورتوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ عورتیں جو پولیس کے لیے مجزی کرتی ہیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے نظریں نیچے کر لیں۔ میں کچھ دیر اُس کے چہرے پر نظریں گاٹے رہا۔ وہ نظریں اُپر کرتی اور جھکا لیتی تھی۔ میں نے اُسے پر نشان کر دیا۔ اُس کے



پہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کی چالاکی اور اُستادی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

”تم نے پولیس کے لیے شاید کبھی کام نہیں کیا۔“ میں نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”دو روزوں پولیس سے نہ ڈرتیں۔“

”میں غریب عورت ہوں۔“ اُس نے مظلوموں کی طرح فریاد کے انداز سے کہا۔ ”لوگوں کے گھروں میں نوکری چاکری کر کے دو روٹیاں کھاتی ہوں۔“ یہی کام جو تم ساہوکار کی زوجہ ان بیوی کے لیے کرتی رہی ہو اگر پولیس کے لیے کرو تو اجرت الگ ملے گی، انعام الگ ملے گا اور عزت الگ ملے گی۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”تمہیں گھر گھر نوکری کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”چولہے چر کے کے سوا میں کر ہی کیا سکتی ہوں؟“ اُس نے دہل دہلی سی آواز میں کہا۔

”تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم نے بہت کچھ کیا ہے۔ تم استاد ہو۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ تم نے اس گھر کی نوکری پولیس کو دیکھتے ہی کیوں چھوڑ دی تھی؟“

”پولیس کے ڈر سے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں پولیس سے بہت ڈرتی ہوں۔“

”پولیس سے نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے ساہوکار کی بیوی کے لیے جو کام کیے تھے تم ان سے ڈر کر بھاگی تھیں تمہیں کس نے بتایا تھا کہ

تمہاری اور اس لڑکی کی کسی بات اور کسی حرکت کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا؟ میری ایک بات غور سے سن لو۔ ساہوکار کے قتل کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اگر بتا دو گی کہ ساہوکار کی بیوی نے اُسے کس طرح قتل کرایا ہے تو میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارا تمہانیدار اس لڑکی کو یا یہ لڑکی تمہانیدار کو کہاں لے گئی ہے۔ تمہیں بہت کچھ معلوم ہے۔ خود بتا دو گی تو مزے میں رہو گی۔ نہیں بتاؤ گی تو میں تمہیں بتاؤں گا تم نے کیا کیا ہے۔“

اُس نے ٹال مٹول کی اور رونے کی بھی اداکاری کی۔ میں نے کہا۔ ”تم جب چھٹی کرتی تھیں تو رات کو ساہوکار کی بیوی کے پاس مکر سے میں کیوں جا بیٹھتی تھیں؟“ اُس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔ اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے پوچھا۔ ”اس لڑکی کے گاؤں تک تم پیدل جاتی تھی یا سٹو پر؟ وہ آدمی قتل سے کتنے دن پہلے ساہوکار کے گھر آیا تھا جس کے پاس تمہیں ساہوکار کی بیوی بھیجا کرتی تھی؟“

اُس کا رنگ گندمی تھا، پیلا پڑ گیا۔ اُس کا سر ڈولنے لگا۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”ابھی وقت ہے۔ بتا دو۔ ساری عمر بچھتا تی رہو گی۔ قتل تم نے نہیں کیا۔ تمہانیدار اور لڑکی کو تم نے غائب نہیں کیا۔ دل کھول کر میرے آگے رکھ دو اور مون کر دو۔“ مجھے اُس کے خاندان کا خیال آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”کچھ دیر سوچ لو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں باہر نکل گیا۔ اُس کا خاندان برآمد سے میں بیٹھا تھا۔ اُسے بلا کر الگ لے

”اُس رات تمہیں پیسے دیتی تھی؟“  
 ”دیتی نہیں تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے دکھا کر ٹنک میں رکھ  
 دیتی تھی۔“

”تم نے کبھی پوچھا تھا کہ کہاں جا رہی ہے؟“  
 ”پوچھا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس نے بتایا کبھی نہیں تھا۔“  
 ”تم کبھی ساہوکار کے گھر گئے تھے؟“  
 ”نہیں حضور!“

میں نے اس سے خاصی دیر پوچھ گچھ کی جس سے میں نے یہ رائے قائم  
 کی کہ اس آدمی کو اپنی بیوی کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ غریب  
 آدمی کے گھر بیٹھے آتے رہے اور وہ اسی سے خوش رہا۔ میں نے اُسے قتل  
 دے کر انگ بٹھا دیا اور اندر چلا گیا جہاں اس کی بیوی حیران و پریشان بیٹھی  
 تھی۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رحم اور انتہائی اپیل تھی میں  
 نے اُسے کہا کہ تم تھانے میں بیٹھی ہو۔ یہاں اگر عادی قاتل اور پتھروں ڈاکو بھی  
 اپنے بھید کھول دیتے ہیں۔ تم کس کے بھروسے اپنے بھید مجھ سے چھپا رہی  
 ہو؟ جلدی بولو اور اس عذاب سے بچو۔

اُس نے میرے ساتھ ذہنی باتیں کیں جو ناٹھی مجرم اقبال جرم سے  
 پہلے کیا کرتے ہیں۔ مجھ سے مدد کے وعدے لیے اور جس راز سے پردہ  
 اٹھایا وہ یہ تھا:

اُسے مقتول ساہوکار نے اپنے گھر باندھی روٹی اور جھاڑو برتن کے

## نوکرانی نے نقاب اٹھا دیا

”اپنی بیوی کے متعلق تم جو کچھ جانتے ہو مجھے بتا دو۔“ میں نے اُسے  
 کہا۔ ”ساہوکار کے گھر سے یہ مہینہ ختم ہونے پر پیسے لاتی تھی یا لاتی رہتی تھی؟“  
 ”وہ اسے بہت پیسے دیتی رہتی تھی حضور!“ اُس نے جواب دیا۔  
 ”وہ تو بجا گوان ہے۔ اُس نے ہمارا پیسٹ بھر دیا ہے۔ کپڑے بھی دیتی تھی۔“  
 ”میں جو پوچھوں سچ بتا دینا۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا سی بھی اُوپر نڈھنگی  
 تو گرٹے جاؤ گے۔ تمہاری بیوی کبھی کبھی ساہوکار کے گھر سے ٹھوٹی کرتی تھی۔  
 تمہیں معلوم ہے؟“

”معلوم ہے حضور!“

”وہ اُس روز گھر میں رہتی تھی یا کہیں چلی جاتی تھی؟“  
 ”کہیں چلی جاتی تھی۔“

”کہاں؟“

”یہ اُس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”یہی

کہتی تھی کہ بیٹھانی کے کام سے جا رہی ہوں۔“

”راستہ کو واپس آتی تھی؟“

”جی حضور!“

کردو گے۔“

لڑکی نے نوکرانی کو ایک طرف بھیج دیا اور خود اس آدمی کے ساتھ اندھیرے میں گم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور نوکرانی کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اُس نے نوکرانی کو بتایا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن لڑکے کے والدین رضامند نہیں تھے کیونکہ وہ امیر لوگ تھے۔ اس آدمی نے لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گا ورنہ ساری عمر اکیلے گزار دے گا۔ وعدے دھرے رہ گئے اور یہ ساہوکار اُن پٹکا۔ اس نے سوڈ میں چھوٹ دے کر لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

لڑکی گاؤں میں چار پانچ دن رہ کر نوکرانی کے ساتھ شہر واپس آگئی۔ اس کے بعد اُس نے کئی بار نوکرانی کو گاؤں بھیجا اور اس آدمی کو شہر بلا یا یہ آدمی آتا تھا تو نوکرانی موقع محل دیکھ کر اُسے گھر میں داخل کر دیتی اور خود باہر پہرے پر کھڑی رہتی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی اُسے بہت اُجرت دیتی تھی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ دن بدن پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی تو اُس کے منہ سے ایسی باتیں نکلتے گنتی تھیں جیسے اُس کا داغ اُس کے قابو سے نکل گیا ہو۔

”نشی کے ساتھ اُس کا تعلق کیسا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لڑکی کا کسی اور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔“ نوکرانی نے

جواب دیا۔ ”نشی کے متعلق اُس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ آدمی غلط فہمی میں مبتلا ہے لیکن آدمی اچھا ہے۔ میں اسے کسی روز بتا دوں گی کہ مجھے اس ساہوکار سے نفرت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر مرد کے لیے

لیے رکھ لیا۔ ساہوکار کی دوسری بیوی نے اُس پر شہزادیوں کی طرح حکم چلائے۔ یہ عورت غریب تھی اور چالاک بھی۔ غریب چالاک کی سکھا دیا کرتی ہے۔ اس نوکرانی نے یہ دیکھ لیا کہ اس لڑکی کو اس موٹے، بھدے اور بوڑھے خاوند کے ساتھ بیاہ کر اُسے تنور میں پھینک دیا گیا ہے اور یہ لڑکی ساہوکار سے اور اُس کے دونوں بیٹوں سے نفرت کرتی ہے۔ نوکرانی نے اُس کی یہ دھکتی رگ پکڑ لی اور اُس پر اپنا اعتماد بیٹھا لیا۔ تھوڑے سے دنوں میں ہی وہ اس لڑکی کی مونس و غمخوار اور ہمزاد بن گئی۔ اُس نے لڑکی سے وعدہ کیا کہ وہ اُس کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔

لڑکی نے ایک روز ساہوکار سے کہا کہ وہ دو چار روز کے لیے اپنے گاؤں جانا چاہتی ہے اور وہ نوکرانی کو ساتھ لے جائے گی۔ ساہوکار میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ لڑکی کو جانے سے روکتا۔ اُس نے ٹیٹو منگوائے اور لڑکی کو نوکرانی کے ساتھ گاؤں بھیج دیا۔ وہاں وہ چار پانچ دن رہی۔ اس دوران وہ نوکرانی کو ایک زمیندار کے گھر لے گئی۔ وہاں زمیندار کا جوان بیٹا تھا جو خوب روٹھا۔ لڑکی نے اشاروں میں اس جوان آدمی کو بتایا کہ اُس نے رابطہ اس نوکرانی کی معرفت ہوا کرے گا۔ انہی دنوں ایک شام اندھیرا گہرا ہوا تو لڑکی نوکرانی کو ساتھ لیے سیر کے بہانے باہر نکلی۔ گاؤں سے باہر ایک جگہ یہ جوان اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ لڑکی نے نوکرانی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے کہا۔ ”اسے پہچان لو۔ یہ کبھی کبھی گاؤں میرے گھر آیا کرے گی۔ یہ جس روز آیا کرے گی تمہیں اپنا آپ دکھا دیا کرے گی۔ تم اسے اسی روز ملا

کھلونابن جاؤں گی۔ لڑکی دلیر تھی اور اپنی کرنے والی تھی۔  
 ایک روز اُس نے نوکرانی سے کہا ”کل صبح گاؤں جاؤ اور اُسے کہنا  
 کہ ساہوکار پرپوں فلاں گاؤں وصولی کے لیے جا رہا ہے۔“  
 اگلی صبح نوکرانی گاؤں چلی گئی۔ اُس نے پیغام پہنچا دیا میرے پوچھنے  
 پر نوکرانی نے مجھے بتایا کہ لڑکی کو ساہوکار نے بتا دیا تھا کہ وہ فلاں گاؤں میں  
 وصولی کے لیے جا رہا ہے۔ نوکرانی نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ  
 اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ لڑکی نے ساہوکار کو قتل کرانے کا بندوبست کیا تھا۔  
 ساہوکار چلا گیا پھر واپس نہیں آیا۔ دوسرے دن اُس کا بڑا بیٹا اور منشی اُس  
 گاؤں گئے۔ شام کو ساہوکار کی لاش گھر آگئی۔ دوسرے دن جب لاش جل  
 رہی تھی تھانیدار آگیا۔ اُس نے باہر کے لوگوں کو گھر سے نکال دیا۔ ساہوکار  
 کے بیٹوں اور منشی کو گھر رہنے دیا۔ اُس نے کرے میں بیٹھ کر سب کے  
 بیان لیے۔ شام کو وہ سب کو تھانے لے گیا۔ لڑکی کو بھی ساتھ لے گیا۔ نوکرانی  
 پر اُس کی نظر نہ پڑی۔ وہ اس گھر سے بھاگ کر اپنے گھر جا چھپی۔ اُسے کچھ پتہ  
 نہیں تھا کہ اس گھر میں کیا ہوتا رہا ہے۔ اُسے ڈر تھا کہ پولیس اُسے بھی  
 پکڑے گی مگر اُسے پکڑنے کوئی نہ گیا۔ وہ مطمئن ہو چلی تھی کہ اُسے اکوئی  
 نہیں پکڑے گا۔ اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی ساہوکار کے گھر سے چلی گئی  
 ہے اور اب تھانیدار اس گھر میں نہیں جاتا۔ آخر یہ رات آئی کہ اُسے میرے  
 بلاوے پر بیٹھنے کا فیصلہ بگا لایا۔

میں نے اس پر اتنی جرح کی کہ رات گزر گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس

عورت کو اس سے زیادہ کچھ علم نہیں کہ لڑکی نے گاؤں میں رہنے والے  
 اپنی پسند کے ایک آدمی کو اطلاع دی تھی کہ ساہوکار فلاں دن آ رہا ہے۔  
 اس پیغام سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی نے اس آدمی کے ساتھ پہلے طے  
 کر رکھا تھا کہ ساہوکار کو قتل کرنا ہے۔ قتل کے بعد ان کا ارادہ غالباً کہیں بھاگ  
 جانے کا ہو گا مگر تھانیدار فوراً پہنچ گیا اور اُس نے لڑکی پر قبضہ کر لیا۔ اب  
 مسئلہ یہ تھا کہ تھانیدار کو کس نے غائب کیا ہے مجھے یہی نظر آ رہا تھا کہ لڑکی نے  
 اسی آدمی کو پیغام بھیجا یا کہ وہ تھانیدار کو لارہی ہے، اُسے غائب کر دو لیکن  
 پیغام کون لے گیا ہے میں نے نوکرانی سے بہت پوچھا۔ دھمکیاں دیں۔ اپنی  
 اُستادی استعمال کی مگر وہ اس معاملے میں کوئی معلوم ہوتی تھی۔ پیغام نے  
 جانے والا منشی بھی ہو سکتا تھا مگر وہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے  
 وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لیے مجبوری کرے گا لیکن میں اُس پر بھروسہ نہیں کر سکتا  
 تھا کیونکہ مجھے مجبوری کا جھانسدے کہ وہ میرے راستے میں رکاوٹیں بھی  
 کھڑی کر سکتا تھا۔

## لڑکی رکھ لو، تھانیدار دے دو

مجھے لڑکی کے گاؤں کے اس مشتبہ آدمی کو فوراً حراست میں لے  
 لینا چاہیے تھا لیکن میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اُس پر ظاہر ہی نہ ہونے دیا  
 جائے کہ پولیس کو اُس پر شک ہے۔ نوکرانی کو استعمال کرنے کی بھی سوچی

لیکن اس میں خطرہ تھا کہ وہ دھوکہ دے جائے گی۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ خطرے تو قبول کرنے ہی پڑیں گے۔ میں نے نوکرانی کو رات بھر جگائے رکھا تھا۔ اسے بڑا اچھا کھانا کھلایا اور ایک کمرے میں اُس کے سونے کا انتظام کیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی بلکہ اسے انعام ملے گا۔ اُس کے خاوند کو میں نے اُس کے سامنے تسلی بخشی اور سختی سے کہا کہ وہ کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کرے۔ دونوں مسال بیوی غربت اور خوف کے مارے میرے قبضے میں آگئے۔ نوکرانی کھاپی کر سو گئی۔

• تمھانے کا شاف رات بھر کا جبا کا ہوا اوگھہ رہا تھا۔ میری نیند غائب تھی۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی اور اس کے کسی بھی آدمی کے ساتھ بے تکلفی یا دوستانہ انداز کی کوئی بات نہ کی۔ ان کے ساتھ میں بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں پیغمبر ہوں اور میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ میں نے انہیں کہا کہ جب تک تمھانیدار نہیں بل جاتا میں کسی کو سونے نہیں دوں گا۔ اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ لڑکی کے گاؤں سے مکھیاد (مبدار) اور چوکیدار کو اور وہاں کے ایک قابل اعتماد اور عقل مند مجر کو فوراً بلاؤ لیکن جو بلانے جائے وہ دیہاتی لباس میں اس انداز سے جائے جیسے کوئی مسافر کسی دوسرے گاؤں جا رہا ہے۔ وہ یہ اطلاع بھی لائے کہ فلاں زمیندار کا بیٹا گاؤں میں ہے یا نہیں۔ مجھے ان لوگوں کے نام یاد نہیں رہے۔ مسلمان تمھانیدار کا میں نام بتانا نہیں چاہتا۔ یہ تو میرے سینے پر لکھا

ہوا ہے۔

ایک کانسیٹیل کو میرے بتائے ہوئے محلے میں گاؤں کو روانہ کر دیا گیا.... نوکرانی تین چار گھنٹے سو کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے اُس کے ساتھ دوستانہ باتیں کیں۔ کچھ اور کھلایا پلایا۔ اس پر تمھانے اور پولیس کا جو خوف سوار تھا وہ اُتر گیا۔ یہ میری استاد ہی تھی کہ میں نے اُسے پولیس کا فرو بنا لیا اور وہ بھی اپنے آپ کو پولیس کا فرو سمجھنے لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ لڑکی کے گاؤں جائے اور اُس کے ماں باپ پر یہ ظاہر کرے کہ اُس نے اُن کی بیٹی کی بہت خدمت کی ہے اور وہ اسے اپنی بیٹی سمجھتی رہی ہے۔ اس طرح وہ اُن کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا اظہار کر کے معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لڑکی گھر میں ہے یا گھر گئی ہی نہیں۔ اگر اُسے موقع ملے تو اُس آدمی سے بھی ملے جس تک وہ لڑکی کے پیغام لے کر جایا کرتی تھی۔

میں نے اُسے بہت لمبی چوڑی ہدایات دی تھیں اور یہ بھی ذہن میں ڈال دیا تھا کہ اُس نے دھوکہ دیا یا کوئی اطلاع چھپائی اور واپس غلط بات بنائی تو اُس کے لیے نتیجہ کیا ہوگا۔ عورت چالاک اور ہوشیار تھی۔ سب کچھ سمجھ گئی۔ میں نے اس کے لیے ٹیٹو منگوا یا اور اُسے گاؤں کو روانہ کر دیا۔ اُس کی حفاظت کے لیے میں نے دو کانسیٹیل دیہاتی لباس میں اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیئے کہ اس عورت سے دُور دُور دیہاتی مسافروں کی طرح جائیں اور اس پر نظر رکھیں۔ یہ گاؤں تک پہنچ جائے تو کانسیٹیل چھپے اگر راستے میں بیٹھ جائیں۔ نوکرانی واپس آئے تو اسے اپنی نظر میں رکھ کر

واپس لے آئیں۔

لڑکی کے ماں باپ کو میں نے ابھی پردے کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔  
قاعدے کے مطابق اُن کے گھر چھاپہ مارنا چاہئے تھا لیکن میں ملزموں کو چونکا  
منہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ پہلو بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر تھانیدار اور لڑکی  
کو پیشہ درجہ مڑا لے گئے ہیں تو انہوں نے پولیس کی ہر ایک حرکت اور  
کارروائی پر نظر رکھی ہوئی ہوگی، اس لیے میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ میری کوئی  
حکمت ملزموں کو نظر نہ آئے اور وہ میرے ارادوں کو قبل از وقت نہ سمجھ سکیں۔

نوکرانی اور دوسرے افراد کو گاؤں بھیج کر میں اسے۔ ایس۔ آئی کے  
ساتھ اس مسئلے پر بات چیت کرتے لگا کہ اس علاقے کے جو پیشہ ور دو  
تین گروہ ہیں اُن تک کس طرح رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ میں نے  
یہ سوچا تھا کہ تھانیدار اور لڑکی ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے پاس ہیں تو انہیں  
دلچسپی لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ میں اُن کے ساتھ درپردہ سودا کرنا چاہتا تھا  
کہ وہ ہمارا تھانیدار واپس کر دیں۔ میں اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں  
کردوں گا۔ تھانیدار کی رہائی کی صورت میں میں نے یہ سوچا تھا کہ اس  
سے یہ بیان کھو اوں گا کہ وہ ڈاکوؤں کی قید سے فرار ہو کر آیا ہے مگر  
سوال یہ تھا، کیا تھانیدار ابھی تک زندہ ہے؟

## گاؤں بے خبر تھا

رات وہ تمام لوگ تھانے میں آگئے جنہیں بلا یا گیا تھا۔ ان

میں گاؤں کا نمبر دار تھا، چونکہ راور دو منجر تھے۔ ان سے کچھ دیر بعد نوکرانی آ  
گئی۔ میں سب سے پہلے اُسے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ لڑکی  
کے گھر گئی تو اُس کے ماں باپ نے لڑکی کے متعلق بے صبری سے پوچھا کہ  
وہ کیسی ہے اور وہ گھر یعنی گاؤں آئے گی یا نہیں؟ انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ  
پولیس اُسے اب بھی پریشان کرتی ہے یا نہیں؟

میں نے آپ کو غالباً یہ نہیں بتایا کہ لڑکی کے ماں باپ اُس کے خاوند  
کے قتل کے روز اُس کے گھر گئے اور دوسرے دن واپس آگئے تھے۔ نہیں  
تھانیدار نے کہا تھا کہ وہ چلے جائیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ انہیں تھانیدار  
نے کیوں گاؤں بھیج دیا تھا۔

نوکرانی نے جب دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ کو معلوم ہی نہیں کہ لڑکی  
لاپتہ ہے تو اُس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ انہیں بتادے کہ  
لڑکی تھانیدار سمیت لاپتہ ہے یا انہیں اس دھوکے میں رکھے کہ وہ خیریت  
سے ہے۔ نوکرانی چونکہ چالاک تھی اس لیے اُس نے پہلے تو یہ یقین کرنے  
کی کوشش کی کہ یہ دونوں جھوٹ نہیں بول رہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ  
اُن کا انداز بتاتا تھا کہ انہیں کچھ علم نہیں کہ اُن کی لڑکی کے ساتھ کیا سلوک ہو  
رہا ہے اور وہ کہاں ہے۔ نوکرانی نے انہیں کہا کہ وہ اُن کی لڑکی کا  
پیغام لے کر آئی ہے کہ اُس کے متعلق فکر نہ کریں۔ پولیس نے تفتیش ختم کر دی  
ہے۔ وہ کسی روز گاؤں آجائے گی پھر ہمیں رہے گی۔ نوکرانی نے انہیں یہ  
یقین دلایا کہ اُن کی بیٹی ہمیشہ کے لیے اُن کے گھر آ رہی ہے۔

یہ سن کر لڑکی کے ماں باپ کے آنسو بننے لگے۔ اُن کے لیے غم نہیں تھا کہ ساہوکار مر گیا تھا، اُن کا اصل غم یہ تھا کہ اُن کی بیٹی کو ساری عمر بڑا رہنا تھا۔ ہندوؤں کا مذہب اس قدر بے رحم ہے کہ بیوہ دوسری شادی نہیں کر سکتی خواہ وہ پہلے روز ہی بیوہ ہو جائے۔ میں نے پندرہ سولہ سال کی عمر کی بیوہ لڑکیاں دیکھی ہیں۔ بیوہ کے ساتھ دوسرا ظلم یہ ہوتا ہے کہ اُس کی سہیلیوں کو اُس کے پاس نہیں بیٹھنے دیا جاتا اور وہ اگر نوز عمر ہی ہو وہ چوڑیاں بھی نہیں چڑھا سکتی اور لڑکیوں کی طرح صاف ستھرے کپڑے بھی نہیں پہن سکتی۔ اس لڑکی کے ماں باپ کو اپنی بیٹی کا یہی حشر نظر آ رہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اتنی خوبصورت بیٹی ساری عمر کے لیے بیکار ہو گئی ہے۔ لڑکی کا ماں نے نوکرانی کے ساتھ اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ لڑکی نڈر اور سرکش ہے اس لیے وہ اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کی پروا نہیں کرے گی اور وہ اپنی جوانی اور اپنی امنگوں کی تسکین کرتی پھرے گی۔

”وہ راکھشش بھی اسی گاؤں میں ہے۔“ ماں نے نوکرانی سے کہا۔ وہ اُس آدمی کی بات کر رہی تھی جسے لڑکی چاہتی تھی۔ ماں کو معلوم تھا کہ اُس کی بیٹی کے اس آدمی کے ساتھ درد پر وہ مراسم ہیں۔ ماں نے کہا۔ ”یہ پلٹھ ہماری عزت کا خیال نہیں کرے گا۔ لڑکی پر ہم کس طرح پھرے گا کر رکھیں گے۔“

نوکرانی نے اس آدمی کے اتفاقاً ذکر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں میں ہی ہے۔ وہ اس گھر سے اٹھی اور زمیندار کے گھر چلی

گئی۔ وہاں بھی اُس سے پوچھا گیا کہ ساہوکار کے قتل کا کوئی مجرم پکڑا گیا ہے یا نہیں اور لڑکی کب گاؤں آئے گی۔ نوکرانی نے انہیں بتایا کہ وہ لڑکی کے والدین کو یہی پیغام دینے آئی تھی کہ وہ چار دنوں تک گاؤں آجائے گی۔ نوکرانی کو معلوم تھا کہ وہ آدمی اُسے باہر ملے گا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے باہر نکل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ وہ آدمی پیچھے سے اُس کے ساتھ جلا۔ نوکرانی نے چلتے چلتے اُسے کہا کہ میں واپس جا رہی ہوں، مجھے راستے میں ملنا جہاں کوئی اور نہ دیکھ سکے۔ وہ الگ ہو گئے۔

وہ جب ٹھو پر سوار ہو کر گاؤں سے نکلی تو کچھ دُور وہ آدمی کھڑا تھا۔ میں نے نوکرانی کی حفاظت کے لیے دیہاتیوں کے بھیس میں جو دو کانسٹیبل بھیجے تھے انہوں نے اس کی تصدیق کی تھی کہ ایک آدمی اُسے راستے میں بلا تھا۔ یہ کانسٹیبل دُور دُور سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ نوکرانی نے مجھے بتایا کہ اس آدمی نے اس سے لڑکی کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسی ہے اور گاؤں کب آ رہی ہے۔

نوکرانی نے اُسے ذرا غصت سے کہا۔ ”تم کیسے مرد ہو؟ وہ بیچارہ مصیبت میں پھنسی رہی اور تم نے جاکر اُسے دُور سے بھی نہیں دیکھا۔“

”اُس نے کیا کہا بھیجا ہے؟“ اُس نے پوچھا۔ ”اُس نے مجھے بلایا ہے؟“

”اُس نے ابھی صرف خیریت کی خبر دی ہے۔“ نوکرانی نے اُسے کہا۔ ”میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ تمہیں شہر آنے کی کہوں؟ اُس نے

کہا تھا کہ ابھی نہیں اور اُس نے خاص بات یہ کہی ہے کہ میں گاؤں میں نہیں آؤں گی۔ وہاں آئی تو گھر میں قید ہو جاؤں گی۔ جب ضرورت سمجھی تو میں شہر بلاؤں گی۔“

”اُسے کہنا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے اُس کی پرواہ نہیں کی۔“ اس جوان آدمی نے کہا۔ ”اُسے کہنا کہ تم تو جانتی ہو کہ میرا ابھی شہر آنا ٹھیک نہیں۔ پھر بھی میں ایک روز گیا تھا۔ میں نے تمہارے گھر میں تمہارا کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں واپس آ گیا۔ مجھے جب بلاؤں گی آ جاؤں گا۔ گاؤں میں آؤں گی تو جب کہو گی چل پڑیں گے۔ گھر کی قید سے آزاد ہونا کوئی مشکل نہیں۔“

## صیاد دام میں آ گیا

یہ آدمی دلیر ہو سکتا تھا مگر بیوقوف ضرور تھا۔ بیوقوفی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُسے اس نوکرانی پر مکمل اعتماد تھا اور دوسری وجہ لڑکی کی خوبصورتی تھی جسے دیکھ کر ہر کوئی ٹھٹھک جاتا تھا۔ اس آدمی کی جوانی اور دیہاتی بن کا بھی فتنور تھا۔ اُس نے نوکرانی کو یہ پیغام بھی دیا کہ اُس نے کچھ رقم اپنے پاس رکھ لی ہے اور وہ (لڑکی) بھی جتنی رقم اُس کے الگ رکھ لے۔ اُس کے چل کر بہت ضرورت پڑے گی۔ لڑکی سارے زیورات بھی الگ باندھ لے۔ اُس نے نوکرانی سے یہ بھی پوچھا کہ پولیس نے کیا کھوج لگایا ہے۔ نوکرانی نے اُسے بتایا کہ تمہارا نذرانہ لے کر دیا ہے کہ رہا ہو گا کہ ڈاکوؤں نے

قتل کر کے ٹوٹ لیا ہے اور پولیس نے اپنی کارروائی ختم کر دی ہے۔  
”یہ سن کر وہ خوش ہوا تھا یا اُس کا رویہ کیا تھا؟“ میں نے نوکرانی سے پوچھا۔

”بہت ہی خوش ہوا تھا۔“ نوکرانی نے جواب دیا۔ ”اُس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے دو تین بار مجھ سے پوچھا تھا کہ تم سچ کہتی ہو پولیس نے کارروائی ختم کر دی ہے؟ تب میں نے اُسے کہا۔ ”میں تھوڑے سے انعام پر راضی نہیں ہوں گی بھگوان نے تمہارے کھاتے کا خون ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور پولیس کو بھی اندھا کر دیا ہے تم نے بھول کو انک سے نکال لیا ہے۔ ساہوکار جیسے راکشش کا خون پُن ہے پاپ نہیں۔ بھگوان نے اسی لیے تمہیں صاف بچا لیا ہے۔“ اُس نے مست سا ہونے کہا۔ ”ہمارے راستے میں جو آئے گا اُس کا خون ہوگا۔ تم جو انعام مانگو گی ملے گا۔ اُسے کہنا تیار رہے اور مجھے بٹلا لے۔“ میں اُسے تسلی دے کر آگئی۔“

میں نوکرانی کو جالاک سمجھتا تھا لیکن مجھے بالکل توقع نہیں تھی وہ اس قدر پالاک اور ذہین ہوگی۔ میں نے اُسے بہت سی ہدایات دے کر بھیجا تھا لیکن اُس نے ان کی راہنمائی میں بہت زیادہ کام کر دکھایا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ گاؤں خانوں کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ لڑکی اور تمہارا نذرانہ لاپتہ ہیں مگر وہاں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ لڑکی کے اس آدمی کو بھی معلوم نہیں تھا۔

میں نے اس آدمی کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانے کی ترکیب سوچی نذرانہ



کہ اُن کی بیٹی نے بھیجی ہے۔  
 یہ میں نے نوکرانی کے لیے گاؤں میں جانے کا بہانہ بنایا تھا۔ وہ  
 ایک ہی روز پہلے وہاں سے ہو کر آئی تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ  
 اُس آدمی سے مل کر اُسے یہ پیغام دے کہ اُسے لڑکی نے فوراً بلایا ہے،  
 اُسے ساتھ لیتی آئے اور ساہوکار کے گھر میں داخل کر دے۔  
 نوکرانی ٹٹو پر سوار ہو کر چلی گئی۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے نوکرانی میری ہدایت کے  
 مطابق تھانے کے سامنے سے گزری۔ میں نے ایک کانسیبل بابہ کھڑا کر  
 رکھا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ نوکرانی اشارہ کر گئی ہے کہ کام ٹھیک  
 ہے۔ ساہوکار کے گھر پر نظر رکھنے کے لیے میں نے ایک مُجرب بھیج رکھا تھا۔  
 ساہوکار کے بڑے بیٹے سے میں نے کہہ دیا تھا کہ گھر کھلا رکھے اور گھر میں  
 کوئی نہ جائے۔

میں ساہوکار کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا  
 تھا۔ اے اے ایس۔ آئی کو میں نے بتا دیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ میں خدا سے  
 التجائیں کرتا جا رہا تھا کہ میرا پلان کامیاب رہے۔

پلان میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی لیکن خدا نے پھر بھی مدد کی۔ ایک غلطی مجھ  
 سے بھی ہو گئی تھی۔ چچا بیٹے یہ تھا کہ گھر کے کسی کمرے میں پہلے ہی ایک دو  
 کانسیبلوں کے ساتھ موجود ہوتا۔ میں نے اس کی بجائے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ  
 آدمی اندر چلا جائے تو میں اندر جاؤں گا۔ عین وقت پر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ

چوکیدار اور مُجرب جو گاؤں سے آئے تھے انہیں الگ الگ کمرے میں بلایا۔  
 ان سے مجھے یہ پتہ چلا کہ لڑکی اور اس آدمی کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں  
 اس سے زیادہ لڑکی کے خلاف کوئی الزام نہیں۔ اس آدمی کے متعلق بتایا گیا  
 کہ غروب صورت جوان ہے۔ گھر میں چونکہ دانے ہیں اس لیے اس میں  
 دلیری بھی ہے اور عقل بھی۔ کوئی اسے کم عقل نہیں کہہ سکتا۔

میں نے ان سب سے اپنے مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں۔  
 کسی حد تک میرا مطلب پورا ہو گیا۔ ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا  
 کہ تھانیدار اور لڑکی لاپتہ ہیں، حالانکہ اے۔ ایس۔ آئی گاؤں میں یہ معلوم  
 کرنے گیا بھی تھا کہ تھانیدار لڑکی کو ساتھ لے کر گاؤں آیا تھا، وہ اب کہاں  
 ہے۔ نمبر دار اور چوکیدار نے اُسے بتایا تھا کہ تھانیدار گاؤں میں نہیں آیا۔  
 اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تھانیدار لاپتہ ہو گیا ہے۔ میں نے  
 انہیں بتا دیا اور انہیں چند ایک ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔ دونوں  
 مُجرب ذہین تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ رہزنوں یا ڈکیتوں کے اُس گروہ  
 کا کھوج لگائیں جن کے قبضے میں لڑکی ہے۔ اب تو میں یہی کہہ سکتا تھا  
 کہ تھانیدار اور لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔

میں نے دوسرے ہی دن ساہوکار کے بڑے بیٹے کو بلایا اور  
 اُسے کہا کہ وہ ڈیڑھ سو روپیہ دے۔ وہ رقم لے آیا۔ اُس دوڑ کا ڈیڑھ سو  
 روپیہ آج کے ڈیڑھ ہزار کے برابر تھا۔ میں نے یہ رقم نوکرانی کو دے کر  
 کہا کہ وہ آج پھر گاؤں جائے اور یہ رقم لڑکی کے ماں باپ کو دے کر کہے

آدمی اندر چلا گیا اور وہاں لڑکی اُسے نہ ملی تو وہ اسے دھوکہ سمجھ کر بھاگ جائے گا۔ وقت کی ذرا سی گڑبڑ سے سارا کھیل تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میں جب ساہوکار کی گلی میں داخل ہوا تو مجھے ایک گھر کے سامنے نوکرانی کھڑی نظر آئی۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ دو آدمی میری سمت آ رہے تھے۔ ایک جواں سال آدمی پیچھے سے آیا اور میرے قریب سے گزر گیا۔ میں وردی میں نہیں تھا۔

وہ نوکرانی کے بالکل قریب سے گزرا۔ چند قدم آگے جا کر واپس آ گیا۔ میں آگے چلا گیا۔ گھوم کر دیکھا۔ وہ آدمی ساہوکار کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ نوکرانی اُس کے پیچھے تھی۔ میں مڑا اور تیزی سے ساہوکار کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ میرا مڑنے کی نگر پڑھ کر ہٹا، دوڑ آیا۔ میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ آگے ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے کواڑوں میں سے جھانکا۔ نوکرانی نے اس خبر و جواں کو ایک کمرے میں داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے منجر کے کان میں کہا کہ دوسری گلی میں اے۔ ایس۔ آئی اور دوکانسٹیل کھڑے ہیں، انہیں بلا لاؤ۔

میں اندر چلا گیا اور اُس کمرے کا دروازہ کھولا جس میں وہ بیٹھا تھا۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بے چارہ سمجھا کہ لڑکی نے دروازہ کھولا ہے۔ دروازے جتنے اُونچے قدر اور ایک کواڑ جتنے چوڑے سینے والے آدمی کو دروازے میں دیکھ کر اُس کی مسکراہٹ اس طرح غائب ہو گئی جس طرح جلتے تلب کا سوچ آف کر دیا جاتا ہے۔

”بیٹھو دوست آ۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔“ وہ نہیں آئے گی جس کے لیے تم آئے ہو۔“

”آپ کون ہیں؟“ اُس نے گہرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”صرف پہچانتے نہیں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”رام۔ رام میں چلیتا ہوں۔“

یروگ دکان پر ہوں گے۔“

میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور مسکرا کر کہا۔ ”میں تم سے ملنے آیا ہوں اور تم اٹھ کر چل دیئے۔ بیٹھیار۔“

اتنے میں باوردی اے۔ ایس۔ آئی دو باوردی کانسٹیبلوں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔ یہ آدمی چارپائی پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ اُس کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اُسے دھیمے سے پوچھا۔ ”ہتھکڑیوں میں تھانے چلو گے یا یہیں سب کچھ بتا دو گے؟“

اُس کے ہونٹ ہلے مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ میرے لیے اُس کا یہ ردِ عمل انوکھا نہیں تھا۔ قتل کرنے تک تو انسان اپنے آپ کو ولیہ اور جو افرود سمجھتا رہتا ہے، ولیہ کی صحیح ضرورت تو اس کے بعد ہوتی ہے جو کسی بھی قاتل کو حاصل نہیں ہوتی۔ قتل کے بعد پولیس کی صرف وردی دیکھ کر قاتل کا پسینہ نکل آتا ہے۔ میں نے اس آدمی کے چہرے سے پہچان لیا کہ اقبال جرم کے لیے مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ اے۔ ایس۔ آئی اور کانسٹیبل کمرے میں اُس کے

سامنے کھڑے تھے۔  
 ”چلو تمھانے چل کر بات کرتے ہیں“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”ڈرو نہیں۔“

”ہتھکڑی رنگانا“ اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”نہیں لگائیں گے۔“ میں نے شفقت سے کہا۔ ”تمہاری عزت  
 میں کوئی فرق نہیں آنے دیں گے۔“

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ کانسیٹیلوں کو ساتھ لے کر  
 تمھانے چلا چلے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔

## تمھانیدار اور لڑکی زخمی ہو گئے۔

وہ سب باہر نکل گئے۔ میں نے اُسے اٹھایا۔ ہم دونوں کمرے سے  
 نکلے۔ نوکرانی صحن میں کھڑی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ جو اس سال ملزم نے  
 اُسے دیکھا تو اُس نے جست لگائی اور نوکرانی کے منہ پر اتنی زور سے گھونسا مارا  
 کہ بے چارے دوڑ پھجے جا چڑھی۔ وہ اُس کی طرف گیا۔ میں نے دوڑ کر پیچھے سے  
 اُس کی گردن پر گھونسا جمایا۔ اللہ نے مجھے بازو لمبے اور ہاتھ بڑے بھاری دیئے  
 ہیں۔ میرے گھونسے سے وہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ میں نے اُسے کلانی ت  
 پکڑ کر روٹا دیا اور پہلو میں ایک اور گھونسا مارا۔ اُس کے منہ سے ہائے  
 نکلی اور وہ پہلو کے بل گر پڑا۔ لیٹ لیٹے اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

نوکرانی کو دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون بہ رہا تھا۔ میں نے اے۔  
 ایس۔ آئی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُسے کہا کہ نوکرانی کو ہسپتال لے جاؤ اور اس  
 کے ہونٹ پر دوائی لگواؤ۔ جس کانسیٹیل کے پاس ہتھکڑی تھی اُسے کہا کہ ملزم  
 کو ہتھکڑی لگا لو۔ میرے دو گھونسوں نے اُس کی جو اندری ختم کر دی تھی۔

تمھانے کی حوالات میں اُس روز دو پیشہ ور ملزم بند تھے۔ میں نے  
 تمھانے جا کر انہیں کہا کہ قتل کا ایک ملزم تمہارے ساتھ بند کیا جا رہا ہے۔ اسے  
 سزا سے نہیں ڈرانا لیکن تمھانے کی اذیتوں اور مار کٹائی سے ڈراتے رہنا اور  
 اسے سونے نہ دینا۔ میں آدھی رات کے بعد اسے تفتیش کے لیے نکالوں گا۔ یہ  
 ملزم جانتے تھے کہ میرا مطلب کیا ہے۔ میں تشدد و بلکہ ذرا سی سختی کا بھی قائل  
 نہیں تھا لیکن اُس نے نوکرانی کے منہ پر گھونسا مارا تو مجھے ایسے لگا جیسے اُس نے  
 میرے منہ پر گھونسا مارا ہے۔ نوکرانی غم بت کی ماری پہلے اس لڑکی کے ہاتھ میں  
 کھینٹی رہی پھر میری آلت کا ربن گئی۔ مجھے اس کے ساتھ دلچسپی اور سجدہ رزی تھی میں  
 اس ملزم کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نوکرانی کو اے۔ ایس۔ آئی ہسپتال سے لے آیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا  
 اُپر والا ہونٹ سُون گیا تھا۔ میں نے اُس کے لیے دو دھنکٹوایا اور اُسے کہا کہ  
 زہ دور دھوپ کر گھر چلی جائے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ کل اُسے کچھ پیسے دوں گا۔ وہ صبح  
 جائے۔

میں آرام کے لیے چلا گیا۔ مسلسل کام نے اوجھٹا کر دیا تھا۔  
 کھانا کھا کر میں لیٹا ہی تھا کہ ایک کانسیٹیل دوڑ آیا۔ کہنے لگا۔ ”جلدی

آئیں۔ دُور کے دور بہائی کوئی رپورٹ لائے ہیں۔“

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ چھ کانسٹیبل لیے۔ انہیں رائفلس دلوئیں۔ میرے پاس ریوالت تھا۔ وہ پیدل چلنے کا زمانہ تھا گن میں حملہ پہنچا تھا۔ اسے ایس۔ آئی نے تھوڑے سے وقت میں دو گھوڑوں اور چھ ٹھوڑوں کا انتظام کر دیا۔ دونوں دیہاتی گھوڑوں پر آئے تھے۔ مارچ میں لیں۔ رات تاریک ہو چکی تھی ہم سب روانہ ہو گئے۔ علاقے کے متعلق بتا چکا ہوں کہ چٹانی اور اونچا نیچا تھا۔ ہماری رفتار اچھی تھی تین گھنٹوں کے اندر اس گاؤں پہنچ گئے۔ دیہاتی ہمیں اس گھر لے گئے جہاں تمھانیدار تھا۔ یہ گاؤں کے بڑے زمیندار کا گھر تھا۔

میں دوڑا گیا۔ بارہ تیرہ میل دُور کے دور بہائی اسے۔ ایس۔ آئی کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے یہ خبر دی کہ آج صبح کے اندھیرے میں اُن کے گاؤں میں ایک آدمی آیا جس کے جسم پر بہت سے زخم ہیں۔ اُس کے ساتھ ایک جوان لڑکا ہے۔ وہ بھی کچھ زخمی ہے۔ اس زخمی آدمی نے اپنا نام بتا کر کہا کہ وہ اس تھانے کا تھانیدار ہے۔ گاؤں کے دو آدمی اُس کے جاننے والے نکل آئے۔ اُسے اپنے گھر لے گئے اور جوہر بم پٹی بوسکتی تھی وہ کی۔ ہمیں یہ پیغام دے کر بھیجا گیا ہے کہ اسے۔ ایس۔ آئی اس گاؤں آکر اُسے لے جائے۔ وہ بھی گھوڑے یا ٹوڑے کی سواری کے قابل نہیں۔

## لڑکی نے پاگل کیا

تمھانیدار پلنگ پر بڑا تھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر تمھانیدار کی آنکھیں حیرت سے اُبل آئیں۔ بولا۔ ”اوسے ملک؟ تم کیسے آئے؟“ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ زخم کیسے ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ ”کوئی زیادہ گہرے نہیں۔“ اُس نے جواب دیا اور ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا جو پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ وہ چلا گیا تو اُس نے اپنے میزبان کو بھی کمرے سے نکال دیا۔

”زخم اتنے گہرے نہیں کہ میں تمھانے تک نہ پہنچ سکتا۔“ تمھانیدار نے کہا۔ ”میں دراصل اسے۔ ایس۔ آئی کو یہاں بلانا چاہتا تھا۔ اُس کے ساتھ بات کر کے مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا کروں۔ تم آگئے ہو۔ یہ اچھا بھی ہوا ہے۔“

یہ ہمارا اگندہ تمھانیدار تھا اور اُس کے ساتھ ساہوکار کی نوجوان بیوہ تھی۔ پیغام لانے والے دونوں دیہاتیوں کو معلوم نہیں تھا کہ تمھانیدار کہاں اور کس طرح زخمی ہوا ہے۔ اُس نے اسے۔ ایس۔ آئی کو بلایا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں بھی اُس کے تھانے میں موجود ہوں۔ مجھے رات کو اس آدمی سے اقبال جوہر کرنا تھا جسے میں نے ساہوکار کے گھر سے پکڑا تھا لیکن تمھانیدار کو لانے کے لیے مجھے ہی جانا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی گندگی اور زخمی ہونے کا پس منظر کیا ہے۔ وہ مسلمان تھا اس لیے میں ہندو اسے۔ ایس۔ آئی کو جانے سے روکنا مناسب سمجھتا تھا۔ میں نے اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ میں صبح تک نہ آیا تو وہ ملازم کاریمانڈلے لے اور ابھی اس سے کوئی بیان نہ لے۔

اور یہ بال اور یہ گنگ اس علاقے کا نہیں تھا۔ میں نے ابھی اُس کی ماں کو اور اُس کے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے اندر بھیج دیا اور تھا نیدار سے کہا کہ وہ مجھے سناٹے۔

”میں نے تمہیں لڑکی صرف اس لیے دکھائی ہے کہ تم سمجھ سکو کہ اس کی خاطر کوئی بھی آدمی کسی بھی آدمی کو قتل کر سکتا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اور میں نے جو جرم کیا ہے وہ بے شک سنگین ہے لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر تم بھی کہو گے کہ یہ لڑکی تم جیسے مردہ دل آدمی سے بھی یہ جرم کرا سکتی ہے۔ اب میری بات غور سے سنا اور دماغ سے انسپکٹری نکال دو۔ مجھے ساہوکار کے قتل کی اطلاع ملی۔ میں موقعہ واردات پر گیا۔ آدھی سے زیادہ لاش گدھ کھا چکے تھے۔ میں اسے رہزنیوں کی واردات تکھ دینا چاہتا تھا لیکن ساہوکار کے بیٹوں کے ساتھ قصبے کے چار معزز ہندو آگئے۔ انہوں نے زور دیا کہ تحقیقات گہری ہونی چاہیے کیونکہ انہیں قتل کا شبہ ہے۔ وہ مردود قتل ہی ہوا تھا لیکن وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ مقتول کی بیوی نوجوان ہے جس کا باپ ساہوکار کا مقروض بھی ہے اس لیے انہیں شبہ ہے کہ ساہوکار کو بیوی نے قتل کرایا ہے۔“

”میں نے جس جس پر شک ہوا اُسے تھانے بٹھایا اور میں دوسرے دن ساہوکار کے گھر اس لڑکی کے بیان کے لیے گیا۔ میری عادتوں اور کر قوت سے تم واقف ہو تم نے لڑکی کو بھی دیکھ لیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں شکاری ہوں۔ بہت عورتیں دیکھی ہیں۔ کوئی لڑکی میرے جسم کے اندر داخل نہیں ہو سکی لیکن

اور بُرا بھی۔ اچھا اس لیے کہ مسلمان ہو میں جن مدد کا طلبگار ایک ہندو سے تھا وہ تم سے مل سکتی ہے۔ بُرا اس لیے ہو کہ ہر جگہ اخلاق اور اپنا مذہب لیے پھرتے ہو، اگر تم نے یہ سب کچھ میں سہی حاکم وقت کے ساتھ وفاداری کی تو میں مارا جاؤں گا کہو مدد کرو گے تب۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیا اور کہا۔ ”میری نوکری اور میری عورت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ میں نے ایک سنگین جرم کیا ہے۔ میں نے اس پر پردہ ڈالنے کی ترکیب سوچ رکھی ہے۔“ اُس نے پوچھا۔ ”تمہیں میرے تھانے میں تعینات کر دیا گیا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تمہیں زندہ یا مردہ برآمد کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔۔۔ اور میں نے تمہارے ساہوکار کا قاتل بھی پکڑ لیا ہے۔ ابھی اُس نے اقبالی بیان نہیں دیا۔ دے دے گا۔“

”وہ ساہوکار کی دوسری بیوی کے گاؤں کا ہے نا؟“ اُس نے اس آدمی کا نام پوچھا۔ ”مجھے لڑکی بتا چکی ہے۔۔۔ لڑکی دیکھو گے؟ لیکن تم دین اور ایمان کے مار سے بوئے انسان ایسے سُن کی قدر کرنا کیا جانو۔ مجھے تو کبھی نہ پائل کر دیا تھا۔ تم مردہ دل ساری سروں اقبالی جرم کراتے پوری کر جاؤ گے۔“ اُس نے کسی کو آواز دی۔ اس حالت میں بھی یہ شخص زندہ دل اور سنگین مزاج تھا۔

میزبان اندر آیا تو تھا نیدار نے اُسے کہا کہ لڑکی کو ادھر بھیج دو۔ لڑکی جب آئی تو میں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ کسی دیہاتی ہندو کسان کی بیٹی ہے۔ وہ بڑی ہی خوبصورت پٹھان لڑکی معلوم ہوتی تھی میں بھی اسے۔ ایسے۔ آئی کی طرح انہوں گا کہ اُس کی خوبصورتی عجیب و غریب تھی۔ یہ انکھیں

## اس عشقِ خانہ خرابے....

”قتل کے بعد لڑکی اور اس آدمی کا پروگرام یہ تھا کہ کہیں دُور بھاگ جائیں گے اور شادی کر لیں گے۔ ان دونوں بد بختوں کو بھاگ کر کہیں دُور ہی چلے جانا تھا تو وہ ساہوکار کو قتل کیے بغیر یہی بھاگ سکتے تھے۔ قتل کرنے کی انہیں ضرورت یہ پیش آئی تھی کہ لڑکی کے دل میں ساہوکار کی اتنی نفرت پیدا ہوگئی تھی کہ اُسے دیکھ کر اس پر باؤ لاپن طاری ہو جاتا تھا۔ وہ اس سے انتقام لینے کو پاگل ہوئی جا رہی تھی اور جو آدمی اس لڑکی کا متوالا تھا وہ جوانی کے جوش میں آکر ساہوکار کو قتل کر بیٹھا۔ قتل کامیاب تھا۔ میں نے لاش اور مقام دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ ساہوکار کو ٹوٹا اور قتل کیا گیا ہے اور یہ رہزनों کا کام ہے مگر لڑکی میرے جال میں آگئی اور بھاگ نہ سکی....

”لڑکی نے عجیب جذباتی لہجے میں مجھے کہا۔ میں نے آپ کے اس وعدے پر آپ کو دل کا جید بتا دیا ہے کہ آپ میری جوانی اور میری خوبصورتی کو جیل میں گلنے سڑنے سے بچالیں گے۔ میں نے سنا ہے مسلمان زبان اور ان کے پکتے ہوتے ہیں۔ کیا آپ اپنا وعدہ پورا کریں گے؟ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اپنا وعدہ ہر قیمت پر پورا کروں گا لیکن قاتل کو ضرور پکڑوں گا۔ اُس نے کہا۔ یہ کوئی بات نہ بنی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرے خاوند کو ڈاکوؤں نے ٹوٹا اور مار ڈالا ہے؟....

اس لڑکی نے مجھے یوں سمجھو کہ حراست میں لے لیا۔ ایسا بانگین کبھی نہیں دیکھا میں تفتیش کے تمام کرتب بھول گیا۔ ساہوکار کے دونوں بیٹے اصل بدصوا اور بزدل نکلے۔ میں نے لڑکی کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ قتل میں اس کا ہاتھ ہے۔ پہلے روز اسے الگ کمرے میں بٹھایا تو میں نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ سیدھا کہا۔ اس جوانی اور اس سُن پر رحم کرو اور اسے جیل خانے میں گلنے سڑنے سے بچا لو۔ صاف بتا دو کہ تم نے خاوند کو کس سے قتل کرایا ہے، میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا....

”لڑکی بہت ہوشیار ہے اور اس کے سینے میں مردوں کا دل ہے۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے گاؤں سے شہادت جمع کر چکا ہوں۔ بہت دیر لگی۔ میں اسے تھانے لے گیا۔ تفتیش کے کمرے میں بٹھائے رکھا۔ تم جانتے ہو کہ اس کمرے میں کیا ہوتا ہے۔ آدھی رات کے بعد لڑکی موم ہوگئی، لیکن ملک ابیں سچ بتا دوں کہ میں پہلے ہی موم ہو چکا تھا۔ میں اس لڑکی کے ساتھ دو چار روز کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی ملکیت میں رکھنے کا عہد کر لیا۔ اسے تم محبت کہہ لو، میری بیوقوفی کہہ لو، پاگل پن کہہ لو۔ میں نے اس لڑکی کو ان عورتوں سے اُونچا درجہ دیا جو میری زندگی سے گزر چکی تھیں۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ ساہوکار کو اس نے اُس آدمی کے ہاتھوں قتل کرایا ہے جسے تم نے حوالات میں بند کیا ہے۔ لڑکی نے اس آدمی کو اپنی نوکرانی کے ذریعے پیغام بھیجا تھا کہ ساہوکار فلاں فلاں فلاں گاؤں میں دھوئی کے لیے جا رہا ہے....

دیکھنا۔ اس کے چہرے پر مضمومیت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے ایک آدمی کے ساتھ دل گار کھا تھا لیکن اس کی حالت ایک پیچھی کی سی تھی جو پنجرہ توڑ کر اڑ جانا چاہتا تھا۔“

اس واردات کو بہت مدت گزر گئی ہے لیکن مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تھا نیدر میرے سامنے بیٹھا بائیں کر رہا ہے۔ ڈیوٹی سے بے نیازی اور عیاشی کے لحاظ سے وہ شہزادہ تھا۔ کسی سے ڈرتا اور دیکتا نہیں تھا لیکن اس لڑکی کے متعلق باتیں کرتے مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ وہ نہیں کوئی اور ہے۔ ہنسنی مذاق اور بد معاشی کے ٹوڈ میں رہنے والا یہ شخص جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کی زبان نہیں دل بول رہا تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اس کا لب و لہجہ اتنا اثر انگیز تھا کہ میں اس کے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ میں اُس لڑکی کو بھی دیکھ چکا تھا جس نے اس کی ذہنیت ہی بدل ڈالی تھی۔ لڑکی میں بلا شک و شبہ یہ اثر تھا جو ہمارے تھا نیدر پر طاری ہو گیا تھا۔

بیٹی اپنے باپ کی منہیں تھی؟

”تم نے اس کی ماں کو اور باپ کو دیکھا ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا وہ اپنی بیٹی کے نقش و نگار اور رنگت کے ہیں؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس کا باپ سیاہ رنگ کا ہے

”میں نے اسے اس خطرے سے خبردار کیا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ بھاگ گئی تو کمپن بھی اور کسی بھی وقت پکڑی جائے گی۔ اس آدمی کا باپ کھاتا پلیازینڈر ہے۔ وہ اپنے جوان بیٹے کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دے گا۔ اگر نہ پکڑے گئے تو وہ کیا کرے گا؟ ان پڑھ آدمی ہے کسی زمیندار کا نوکر بن کر کھیتی باڑی کرے گا، اور جس زمیندار کی بھی نوکری کرے گا وہ لڑکی کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرے گا....“

”اس طرح میں نے اس کے سامنے اس کے مستقبل کی ایسی بھیانک تصویر رکھی کہ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ لے۔ میں ہر طرح مدد کروں گا۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ میں ہی اسے پکڑ لوں گا....“

”اب تم مجھے کہو گے کہ میں نے لڑکی کو حالات میں کیوں نہ بند کر دیا اور اس کا اقبالی بیان مجھڑیٹ سے ریکارڈ کیوں نہ کر لیا؟ میں تمہیں جو جواب دوں گا اس سے تم خوش نہیں ہو گے۔ میں تفتیش کے قاعدے قانون مجبول چکا تھا اور میں یہ بھی مجبول چکا تھا کہ میں تھا نیدر ہوں۔ یہ دیہاتی لڑکی، قتل کی بلیم، میرے ہاتھ میں کھلوانے تھی۔ میں اسے تفریح کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ وہ میرے قدموں میں گری جا رہی تھی لیکن ملک! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے ذہن سے جس طرح تھا نیدراری نکل گئی تھی اسی طرح عیاشی بھی نکل گئی۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی تفتیش کے بند کرے میں ہنس کھیل کر اسے چلتا کروں۔ تم نے اس لڑکی کو غور سے نہیں دیکھا۔ ایک بار پھر

اور یہاں کے کسانوں کی طرح کاکسان۔ اس کی ماں کارنگ اس جیسا گورا تو نہیں گندمی ہے اور اُس کے نقش و نگار اچھے ہیں۔ جوانی میں اس عورت میں خاصی کشش رہی ہوگی۔ اب بھی اُسے دیکھو تو اپنی قبیل سے مختلف اور الگ تھلگ لگتی ہے۔ مجھے یقین کی حد تک شک ہے کہ یہ لڑکی اس باپ کی بیٹی نہیں۔ اس کی دلیری اور ذہانت بتاتی ہے کہ اس کے دل اور دماغ میں جو خوں دوڑ رہا ہے وہ کسی مسلمان کا ہے اور یہ مسلمان کوئی عام قسم کا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ شاید یہ خون کی مطابقت تھی یا کشش کہ لڑکی نے اس مجبور سی کی حالت میں بھی اپنے آپ کو میرے آگے رشوت کے طور پر پیش نہ کیا۔ تم جانتے ہو ملک اب کوئی عورت جب جرم کر کے کسی تھانیدار کے چنگل میں آجاتی ہے تو وہ اپنی سب سے زیادہ قیمتی ستے جسے عصمت کہتے ہیں پیش کر دیتی ہے۔ یہ تجربہ تمہیں کئی بار ہوا ہوگا، مگر اس لڑکی کے رویے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ اپنی سطح سے نیچے نہیں گرے گی۔۔۔

”میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کردار کی کیسی ہے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے دھیمی مگر پختہ آواز میں کہا۔ ”آپ کے اس ہاتھ کو میں اپنے ہاتھ سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔ میں نے کہا۔ ”تم نے عمر قید کے لیے جیل جانے کا ارادہ کر لیا ہے؟“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر کہا۔ ”اگر آپ سو داکر رہے ہیں تو میں پھانسی چڑھنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ مردوں کی طرح بات کریں۔ آپ تو بڑے کچھے آدمی ہیں۔۔۔

”میرے دل سے آواز اٹھی کہ خان! اس لڑکی پر ثابت کر دو کہ تم مرد ہو۔ میں نے اس کے ساتھ بہت باتیں کیں۔ اس نے بھی کیں۔ آدھی رات کے بہت بعد ہم ایک دوسرے کے دل میں اُتر گئے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اسے اس حد تک چاہتا ہوں کہ اس کے جسم کو اُس وقت اپنا سمجھوں گا جب میں اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لوں گا۔ ایسا اشارہ دراصل اسی نے دیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ میں نے جب اسے یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ میں اب تفتیش کے بہانے اس کے گھر آیا کروں گا تو دو طرح کی سوچوں نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ایک یہ کہ یہ لڑکی مجھے بیوقوف بنا گئی ہے اور دوسری یہ کہ میں اس لڑکی سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میں اتنی زیادہ قیمت دینے کے لیے تیار ہو گیا جتنی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔

”اب تم میرے جرم سنو۔ تفتیش سے میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ تامل کی نشاندہی ہو جانے کے باوجود میں نے اُس کی گرفتاری کا کچھ بھی انتظام نہ کیا۔ مجر اپنی اپنی رپورٹیں لائے جو میں نے بددلی سے سنیں اور انہیں کہا کہ اُسندہ وہ اس واردات کے سلسلے میں کوئی بات تمھانے میں کسی کے ساتھ نہ کریں، صرف میرے ساتھ واسطہ رکھیں۔ میں نے انہیں کوئی اور ہدایت نہ دی۔ اگر کوئی مجھے کہے کہ اس لڑکی نے مجھ پر تعویذ، ٹونے یا کالے علم کے ذریعے قبضہ کر لیا ہے تو میں اسے سچ مان لوں گا۔ میں دن کے وقت اس کے گھر گیا۔ مجھے شک تھا کہ یہ غائب ہو چکی ہوگی مگر وہاں موجود تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ”مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ میرے منہ سے نکل گیا۔“ گرفتار ہو کر آیا ہوں۔۔۔



”بیم کمرے میں چلے گئے، اس نے مجھ پر بھروسہ کر لیا تھا اور اس نے میرے جذبات کو بھی قبول کر لیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ واردات کے متعلق کوئی بات نہ کی میرے دل میں کوئی گندہ خیال بھی نہ آیا۔ مجھ پر نئے کھانا طاری ہو گیا۔ اگر میری دل چسپی اس کے جسم کے ساتھ ہوتی تو میری جذباتی حالت یہ نہ ہوتی۔ میں ہلکا مجنوں کی قسم کی کہانیوں کا ہمیشہ مذاق اڑاتا رہا ہوں۔ اب کہہ سکتا ہوں کہ ان میں صداقت تھی....

”میں ہر روز اس کے گھر چلا جاتا اور اس کے ساتھ کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ وہ بھی میری طرح دیوانہ سی ہو گئی تھی۔ ایک روز میں نے اس سے جذبات کی شدت میں پوچھا۔ تمہارا باپ تم سے بہت پیار کرتا ہوگا؟۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اُداس سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے پیار ماں سے بلا ہے یا اب تم نے دیا ہے۔ اس نے مجھے تم کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے لگی۔ ”باپ اگر مجھ سے نفرت نہیں کرتا تھا تو اس نے مجھے کبھی پسند بھی نہیں کیا تھا۔ میں بچپن میں بہت شوخ ہوا کرتی تھی۔ شرارتیں بہت کیا کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، باپ نے مجھے تین بار غصے سے کہا تھا۔ ”اُوہ بیچھہ مسلمان کی اولاد! چہین کر اور چہین کرنے دے۔۔۔ میں باپ کے پیار کو زست ہی رہی ہوں۔ ماں مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ گھر میں بھینس اور ایک دو بکریاں رہتی تھیں۔ مجھے باپ سے چوری بہت دودھ پلاتی تھی....

’یہاں سے میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ کسی مسلمان کی اولاد ہے اور اس کا باپ اس حقیقت سے واقف ہے۔ میں نے اس سے اس آدمی کے

متعلق پوچھا جس سے اس نے ساہوکار کو قتل کرایا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”تم مجھے بے وفا کہو۔ میں سچ بتاتی ہوں کہ میری خاطر میرے خاوند کو قتل کرنے کے باوجود مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔ اسے میرے ساتھ جو لگاؤ تھا وہ تمہاری طرح کا نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ جو حرکتیں کی ہیں وہ تم آسانی سے کر سکتے تھے۔ میں تمہارے ہاتھ میں مجبور ہوں۔ تمہاری قیدی ہوں۔ تم مجھے جیل خانے بھیج سکتے ہو لیکن تم نے مجھے وہ محبت دی ہے جس کے لیے میرا دل ترستا تھا۔ اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے سر میری گود میں چھینک دیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔ ”اگر بے دھوکہ دینا ہے تو فوراً دو۔ میں ناپاک ہوں۔ یہی سمجھوں گی کہ ایک اور ناپاک آدمی سے پالا پر گیا تھا۔ میرا بیان کھنکھو کہ میں نے اپنے خاوند کو قتل کرایا ہے۔ میں انگوٹھا گادوں گی....

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ملک! تم میری جذباتی اور ذہنی حالت سمجھ گئے ہو، مجھ پر جذبات کا پائل پن سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہندو شری جو میرے پاس آئے تھے کہ میں پوری تحقیقات کروں گا کیونکہ انہیں شک تھا کہ ساہوکار کو بیوی نے قتل کرایا ہے، وہ دو تین بار مجھے ملے اور پوچھا کہ میری تعینش کہاں تک پہنچی ہے۔ میں انہیں تسلی دے کر ٹالتا رہا۔ وہ کشتہ تک پہنچنے کی باتیں کرتے تھے میرے دماغ پر لڑکی کا قبضہ تھا۔ اس کیفیت نے مجھے اس فیصلے پر پہنچایا کہ میں لڑکی کو لے کے کہیں چلا جاؤں۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ میں نے ساہوکار کے قاتل کو گرفتار کیا تو لڑکی کو بھی اعانت جرم میں گرفتار کرنا پڑے گا۔ یہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا تھا کہ اسے میں کہیں لے جاؤں گا۔ اس نے کہا تھا

کہ جہاں چاہو لے چلو۔ مسلمان ہو جاؤں گی۔ میں نے طے کر لیا کہ اسے کہیں لے جاؤں گا۔۔۔۔

## تھانیدار اور لڑکی پکڑے گئے

”میں نے اُس روز دوسرے کی بوتل ساتھ لی اور روزمرہ کی طرح ساہوکار کے گھر چلا گیا۔ اس سے پہلے میں صرف ایک بار چنی کر اس کے گھر گیا تھا۔ اب پوری بوتل ساتھ لے گیا۔ اس نے مجھے پینے سے روکا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ شادی کر کے چھوڑ دوں گا۔ ایک نشہ اس لڑکی کا طاری تھا، اس کے ساتھ شراب پی لی۔ رہی سہی تھل بھی ماری گئی۔ دن کا پچھلا پھر تھا۔ ساہوکار کا نشہ آ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تھانے جاؤ اور دو ٹوٹوں یا گھوٹوں کا فوراً انتظام کرو وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد میں اکیلا تھانے گیا اور اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ میں لڑکی کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں جا رہا ہوں۔ اس نے نشاندہی کی ہے۔ اتنے میں دو گھوڑے آگئے پھر میری ہدایت کے مطابق لڑکی تھانے آگئی۔ اے۔ ایس۔ آئی کو میں نے یہ کہہ دیا کہ میں شام کے بعد جاؤں گا، وردی میں نہیں جاؤں گا اور میرے ساتھ کوئی کانسٹیبل نہیں جائے گا۔ شام کے بعد ایک گھوڑے پر لڑکی کو سوار کیا، دوسرے پر میں خود سوار ہوا اور ہم روانہ ہو گئے۔۔۔۔

”میں بہت دُور جا رہا تھا۔ رات کو میں ریل گاڑی سے جا سکتا تھا لیکن میں احتیاط کرنا چاہتا تھا کہ کوئی مجھے لڑکی کے ساتھ سٹیشن پر نہ دیکھ لے لڑکی

نے بہت سی رقم اور زیورات مجھ سے دیئے تھے۔ شراب، لڑکی اور جذبات نے مجھ سے بڑا ہی دلیرانہ اور اہمقانہ فیصلہ کرایا۔ میں ایک ملزمہ کے ساتھ پولیس کی ٹوکری سے جگلوڑا ہو رہا تھا۔ مجھے ڈیڑھ سو میل دُور اپنے ایک دوست کے پاس جانا تھا۔ وہ اتر و سرخ والی حیثیت کا آدمی ہے۔ اس کی مدد سے مجھے چھپے رہنا یا کہیں اور چلے جانا تھا۔ میں نے قصبے کے ریلوے سٹیشن سے گاڑی پر سوار ہونے کی بجائے پنڈرہ سولہ میل دُور کے سٹیشن سے گاڑی پکڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ تم اگر ان راستوں سے واقف ہو تو جانتے ہو گے کہ ریل گاڑی چکر کاٹ کر جاتی ہے۔ میں نے جنگل کے راستے سیدھا جانے کی سوچی۔ اس علاقے میں جانے سے میں ریتاثر بھی دینا چاہتا تھا کہ میں لڑکی کے گاؤں جا رہا ہوں۔“

وہ مجھے اپنا پلان سنارہا تھا جو سراسر جاہلانہ تھا۔ اب جب کہ وہ زخمی حالت میں پڑا تھا وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اُس سے بہت بڑی لغزش سرزد ہوئی ہے۔ وہ اگر عقل سے کام لیتا تو لڑکی کو بچانے کا محفوظ راستہ نکال سکتا تھا۔ قاتل کو گرفتار کر کے لڑکی کے بغیر عدالت میں پیش کر سکتا تھا۔ قاتل بری ہو جاتا تو ہوتا رہتا۔ اس کے بعد تھانیدار لڑکی کو در پردہ کسی محفوظ جگہ پہنچا دیتا۔ پھر اسے مسلمان کر کے شادی کر لیتا۔ تھانیدار بہت کچھ کر سکتا ہے وہ بھی کر سکتا تھا مگر جیسا کہ میں نے شروع میں آپ کو بتایا ہے، یہ شخص احمقوں کی سی حرکتیں بھی کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ اس بنیاد پر ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے عادت کے مطابق بد اخلاقی نہیں کی بلکہ لڑکی کو اپنے دل میں پاکیزہ

درجہ دیا تھا۔

”ہم دونوں گھوڑوں پر سوار قبے سے کم و بیش سات آٹھ میل دور ویران علاقے میں جا رہے تھے جہاں چٹانیں اور نشیب و فراز زیادہ ہیں۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ میرے ذہن سے جہاں اور حقیقتیں نکل گئی تھیں وہاں میں اس خطرے سے بھی بے خبر ہو گیا تھا کہ اس علاقے میں ڈاکو اور رہزن بھی ہو سکتے ہیں۔ اچانک ہم پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ تب مجھے خطرے کا احساس ہوا لیکن میں نے اپنے آپ کو یہ تسلی دی کہ ڈاکو اور رہزن رات کو جنگل میں سموڑا ہی پھرتے رہتے ہیں۔ مجھے آواز سنائی دی، ٹھنڈا مہٹی، میں رگ گیا، ٹارچ کی روشنی مجھے کچھ دیکھنے نہیں دے رہی تھی میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھا تو آواز آئی، نہ نہ۔ ہاتھ پیچھے کر لو۔ چار بندو توں کی نالیاں تمہاری طرف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آواز آئی، ”اوہو یہ تو ہمارے خان صاحب ہیں۔ آئیے داروغہ صاحب، میں اصلے ٹھگ کے گھرے میں آ گیا تھا۔“

اصلاً اس علاقے کا رہزن اور ڈکیت تھا۔ وہ اصلے ٹھگ کہلاتا تھا۔ اس کا پورا گروہ تھا۔ وہ کوئی نامور ڈاکو نہیں تھا۔ ایک دو بار پکڑا گیا اور سزا پا چکا تھا۔ علاقے کی دشواریوں کی وجہ سے اسے پکڑنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہ ڈاکو جنہیں ٹھگ بھی کہا جاتا تھا، منگنیہ خاندان کے آخری دور میں زور پکڑ گئے تھے۔ انگریزوں کو بھی انہوں نے بہت پریشان کیا تھا۔ امیر علی ٹھگ اور سلطانہ ڈاکو گلوں کے پیراستا تھے۔ انگریزوں نے ان کے متعلق کتابیں بھی لکھی تھیں۔ یہ لوگ ایک

طاقت بن گئے تھے۔ ان کے خلاف اکثر فوج استعمال کی جاتی تھی مسلسل محرکہ آرائی سے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر جب تک میں وسطی اور شمالی ہندوستان میں رہا رہزنوں کے گروہ موجود رہے۔ اب بھی موجود ہیں اور سرگرم رہتے ہیں۔

ہمارا اتھانیدار اصلے ٹھگ کے گھرے میں آ گیا۔ وہ آٹھ دس آدمی تھے۔ اصلاً ان کے ساتھ تھا۔ وہ کہیں سے آ رہے تھے اور اپنے ٹھکانے کو واپس جا رہے تھے۔ انہیں اتھانیدار اور لڑکی مل گئے۔ یہ ان کے لیے بڑا ہی قیمتی شکار تھا۔ لڑکی کی قیمت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ اتھانیدار کو وہ یرغمال کے طور پر رکھ کر حکومت سے منہ مانگی رقم لے سکتے تھے۔ ریوالور تھا دو گھوڑے تھے اور اتھانیدار کے پاس رقم اور زیورات تھے۔ اتھانیدار کو اصلے نے پہچان لیا۔ اتھانیدار نے اسے کہا کہ لڑکی کو میرے ساتھ جانے دو باقی جو کچھ ہے لے لو مگر اصلانہ مانا۔

”خان صاحب!“ اصلے نے کہا، ”آپ اور لڑکی ہی تو ہمارے

دولت ہیں۔ گھوڑے ہمارے کس کام کے۔“

واقعی چار بندو توں کی نالیاں اتھانیدار کی طرف تھیں۔ اس کا پستول لے لیا گیا اور اس سے رقم اور زیورات بھی لے لیے گئے اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لے چلے۔

اصلاً اور اس کے آدمی پیدل جا رہے تھے۔ اتھانیدار اور لڑکی کو انہوں نے گھوڑوں پر سوار رہنے دیا اور انہیں اپنے ساتھ لے چلے۔ اتھانیدار کا نشہ اُتر گیا۔ اسے اپنی لغزش کا احساس ہوا۔ وہ بہت دلیر آدمی تھا مگر اکیلا اور نہتہ تھا۔ لڑکی کے متعلق اس نے سوچ لیا تھا کہ جیتے جی اصلے ٹھگ کے پاس

نہیں جانے دے گا۔ اس نے اصلے سے سووے بازی کرنا چاہی۔ وہ زیندار  
خان دان کا فرد تھا۔ اس نے اصلے کو رقم پیش کی۔

”خان صاحب!۔ اصلے نے ہنس کر کہا۔ ”میں آپ کا نقصان نہیں  
کروں گا۔ انگریز بادشاہ سے آپ کی قیمت لے کر آپ کو رہا کر دوں گا۔ آپ گھبراہٹیں  
نہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ جا کہاں رہے تھے؟“

تھانیدار نے لڑکی کو اپنی بیوی بتایا اور کوئی جھوٹ بولا۔ اس نے اصلے  
سے یہ بھی کہا کہ میرے علاقے میں واردات کرو گے تو وعدہ کرتا ہوں کہ نہیں پکڑوں  
گا۔ اصلاً اتنا کچا نہیں تھا، نہ مانا۔

تھانیدار گھوڑے سے اتر کر اصلے کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور اس کی  
مرواگی کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اُسے کہا۔ ”تم اتنے زیادہ آدمی ہو اور میں  
اکیلا ہوں۔ اگر تم نے میرے جسیٹے جاگتے میری بیوی پر ہاتھ ڈالا تو میں سمجھوں گا  
کہ اصلاً اپنے باپ کا نہیں تھا اور بد بخت بیچڑہ تھا۔“ اصلے نے اسے  
کہا۔ ”جب تک میرے پاس ہو تمہاری بیوی تمہارے پاس رہے گی۔ اگر  
مجھے تمہارے عوض رقم مل گئی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تمہاری بیوی کو نہیں  
چھوڑوں گا۔“

اس سے تھانیدار کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اسے فرار کا موقع پیدا کرنے کے  
لیے وقت مل جائے گا۔ رات کا آخری پہر تھا جب یہ گروہ ایک جگہ رکا۔ اردگرد  
چٹانیں اور درخت تھے۔ وہیں کہیں کچا سا ایک مکان تھا جس میں تھانیدار  
اور لڑکی کو بند کر دیا گیا۔ کمرے کی کوئی کھڑکی اور روشندان نہیں تھا۔ صرف ایک

دروازہ تھا جو باہر سے بند کر دیا گیا۔ فرش پر خشک گھاس بچھی تھی۔ اس پر کبیل  
اور چادریں بچھا دی گئیں۔ دونوں سو گئے۔ تھانیدار کی جب آنکھ کھلی تو دروازے  
کی درزوں سے روشنی اندر آرہی تھی۔ ایک آدمی نے انہیں کھانا دیا۔ اُس کا سر  
اور چہرہ کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ تھانیدار نے اُس  
کے ساتھ باتیں کیں لیکن وہ خاموش رہا اور چلا گیا۔

## قتید، سلاخ اور ایک فوجی

وہ تین چار روز اس کمرے میں بند رہے۔ لڑکی نے تھانیدار سے کہا۔  
”اگر میرے بدلے یہ لوگ تمہیں چھوڑ دیں تو میں تمہارے لیے یہ قربانی دینے  
کے لیے تیار ہوں۔ بھگت لون گی!“  
تھانیدار نے اسے کہا۔ ”مروں گا تو تمہیں ساتھ لے کر مروں گا، نکلوں  
گا تو تمہیں ساتھ لے کے نکلوں گا۔ مجھے صرف تمہارا غم ہے۔“

”مجھے معلوم نہیں کہ یہ تیسرا دن تھا یا چوتھا۔“ تھانیدار نے مجھے سنایا  
۔ ”مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ باہر رات ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہمارے  
لے کھانا آیا تھا۔ کھانا لانے والے کا چہرہ بدستور کپڑے میں ڈھکنا ہوا تھا۔ اُس  
نے کھانا ہمارے آگے رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ قیصن کے اندر سے اُس نے  
تقریباً دو فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی ٹوپے کی سلاخ نکالی۔ اس کا ایک سرا  
بیچس کس کی طرح تھا۔ اس آدمی نے سلاخ میرے قریب خشک گھاس کے نیچے

چھپا دی اور آہستہ سے کہا۔ یہ دیوار پچھوڑے کی ہے۔ دیوار پتھروں کی ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اس سلاخ سے پتھر نکال لینا۔ آواز نہ نکلے۔ پتھر آسانی سے نکل آئیں گے۔ تین چار پتھر نکلے تو تم دونوں بڑے آرام سے اس سوراخ میں سے نکل جاؤ گے۔ آج یہاں آدمی تھوڑے ہیں۔ وہ اس طرف دروازے کی طرف سوئے ہوئے ہوں گے۔ آواز نہ نکالنا۔۔۔

”وہ مجھے لقب لگانے کو کہ رہا تھا تم جانتے ہو کہ یہ کام ماہر نقب زن آواز نکالے بغیر بڑی تیزی سے کو لیا کرتے ہیں لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ میرا کونسا ہمدرد ہے؟ مجھے شک ہو کہ یہ مجھے قتل کرنے کا بہانہ پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے کہا۔ میں آپ کا ایک احسان مند ہوں۔ آپ نکل جائیں میں احسان کا بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ میرے اصرار پر اس نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ کوئی ایک سال ہوا میں دوسرے تھا نے میں تھا۔ ایک جگہ ٹوڑے فوجی کی گرفتاری کے کاغذات آئے۔ وہ گاؤں کا رہنے والا تھا میں نے ایک رات اس کے گھر چھاپہ مارا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ مسلمان ہے۔ اس کے باپ نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ یہ فوجی اس کا اکیلا بیٹا تھا۔ باقی دو لڑکیاں تھا۔ یہ اکلوتے بیٹا گھر سے بھاگ کر بھرتی ہو گیا تھا۔ اسے فرنٹ پر بھیجا گیا تو راستے سے بھاگ آیا۔ اس کی ماں اور بہنیں بہت روئیں۔ ماں نے دوپٹہ اتار کر میرے پاؤں میں رکھ دیا۔“

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بعض جگہوں سے فوجی اپنے تھانے کے تھانیداروں کو ماہوار رشوت دیتے اور گرفتاری سے بچے رہتے تھے۔ یہ تھانیدار ایسے تین فوجیوں سے رشوت لے رہا تھا۔ یہ چوتھا فوجی آگیا کہ وہ باقاعدہ رشوت دینے

کے قابل نہیں تھا۔ تھانیدار نے اس کی غربت کو دیکھتے ہوئے اور اس کی ماں اور بہنوں کی فریادوں سے متاثر ہو کر اور یہ خیال کر کے بھی کہ وہ مسلمان ہے، اسے گرفتار نہ کیا۔ اس نے چوکیدار اور نمبردار سے بھی کہہ دیا کہ اس جوان پر پردہ ڈالے رکھیں۔ اس نے گرفتاری کے حکم مانے کا جواب دیا کہ ہنگوڑا ابھی مفرد ہے، گرفتاری کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ چھ سات مہینے بعد تھانیدار کو اس تھانے میں بھیج دیا گیا جہاں وہ اب تھا۔ اتنا عرصہ اس نے جگہ ٹوڑے کو گرفتار نہ کیا۔

”اب ایک سال بعد وہی فوجی میرے سامنے بیٹھا تھا۔“ تھانیدار نے مجھے بتایا۔ اس نے بتایا کہ دوسرے تھانیدار نے آتے ہی اسے گرفتار کر لیا اور اتنی زیادہ رشوت مانگی جو وہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن ایک ہیڈ کانسٹیبل اس کے گھر چلا گیا۔ اس سے ماہوار رشوت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو ٹالا اور گھر سے جنگل کو بھاگ گیا۔ ایک روز اتفاق سے اصلے کے دو آدمیوں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اسے اصلے کے پاس لے گئے۔ اسے رہزنی کی ٹریننگ دی گئی اور جرائم کے کچھ اور ٹریننگ بھی سکھائے گئے۔ اس نے بخوشی یہ پیشہ قبول کر لیا۔ میری خوش نصیبی دیکھو کہ وہ اس گروہ میں تھا جس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ اسے اس رات میرے پاس آنے کا موقع ملا۔ میری نیکی میرے کام آئی۔ اس نے مجھے راستہ سمجھا دیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اصلا میرے متعلق فیصلہ نہیں کر سکا کہ میرے عوض حکومت سے رقم مانگے یا مجھے قتل کر دیا جائے۔ وہ گرفتاری سے ڈرتا ہے شاید مجھے قتل کر دیا جائے گا۔۔۔

یہ فوجی یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ میری اور کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر وہ مدد کرنا چاہتا  
 گیا تو اسے اصلاً سزائے موت دے گا۔ اس نے میری بہت زیادہ مدد کی  
 تھی۔ میں نے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ دیا، بھجا دیا جو کہ میں چلتا رہتا تھا۔ اندر  
 میں سلانخ اٹھائی اور دیوار کے پاس بیٹھ کر دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ یہ بے قاعدہ  
 پتھروں کی دیوار تھی۔ اوپر ٹی کالیپ تھا۔ میں نے لیپ اکھاڑ کر ہاتھ سے ٹوٹا  
 اور دو پتھروں کے درمیان سلانخ کا سر رکھ کر زور لگایا۔ کوشش کے بعد دو  
 پتھر ہلنے لگے۔ پابندی یہ تھی کہ آواز نہ نکلے ورنہ یہ پتھر نکلنے کی شکل نہیں تھے۔  
 ایک پتھر باہر آ گیا۔ اب کوئی شکل نہیں تھی۔ میں نے فرش تک چارپانچ پتھر نکال  
 لیے۔ یہ سیمینٹ سے نہیں مٹی سے جوڑے ہوئے تھے۔ پھر اتنا سوراخ ہو گیا کہ  
 اس میں سے رینگ کر نکلا جا سکتا تھا....

## لڑکی کو بچانا مشکل تھا

”میں نے سلانخ ہاتھ میں رکھی اور پیٹ کے بل باہر نکل گیا۔ میں اٹھایا  
 تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک لاشی میرے کندھے پر پڑی۔  
 میں نے یہ ضرب سہی اور سلانخ سے جوابی وار کیا۔ سلانخ اُس کے سر پر پڑی۔  
 رگتے گرتے اُس نے اپنے ساتھیوں کو بکارا۔ اس کے بعد اُس کی آواز نہ نکلی۔  
 اگر لڑکی ساتھ نہ ہوتی تو میں دوڑ پڑتا۔ لڑکی سوراخ سے نکل رہی تھی۔ ادھر  
 سے آدمی دوڑتے آ رہے تھے۔ میں نے لڑکی کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور اسے کہا

”کیرے ساتھ رہو۔ وہ شاید چار تھے۔ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ایک کے پاس  
 برہمی تھی۔ مجھے زیادہ زخم برہمی کے آئے ہیں لیکن گہرا کوئی نہیں۔ سلانخ نے  
 بہت کام دیا۔ لڑکی کو میں نے بائیں بازو کے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اسے  
 بھی دو زخم آئے ہیں لیکن معمولی ہیں۔ دوسروں کے پاس ڈنڈے اور شاید چاقو  
 بھی تھے....

”میں اپنے قید خانے سے دوڑھٹا جا رہا تھا اور مقابلہ سبھی کر رہا تھا۔  
 لڑکی نے مجھ کو دو پتھر اٹھالیے اور تاک تاک کر مارے۔ شاید پتھر ایک دو  
 کے منہ پر گئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک رہ گیا اور میں لڑکی کو ساتھ لیے  
 بھاگ اٹھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں آیا۔ وہ سلانخ اس پلنگ کے نیچے پڑی  
 ہے۔ زخموں سے خون بہ رہا تھا۔ میں چلتا رہا۔ بہت دور آکر لڑکی کا دوپٹہ بھاڑ کر  
 جہاں جہاں باندھا جا سکتا تھا باندھا اور چل پڑا....

”میری رفتار کم ہونے لگی۔ جسم بے حال ہو گیا۔ کچھ دور تک لڑکی نے ہمارا  
 دبا۔ یہ مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ ذرہ بھرنہ گھرائی۔ اس نے یہاں تک کہا کہ چل نہیں  
 سکتے تو میں تمہیں پیٹھ پر اٹھا لیتی ہوں۔ میں نے مروح کی بھی قوت صرف کر ڈالی  
 اور چلتا رہا۔ سحر کے وقت یہ پہلا گاؤں راستے میں آیا۔ ان لوگوں نے مجھے پہچان  
 لیا اور ایک آدمی کو جکلا لائے جس نے زخموں پر کورسٹ جلا کر رکھ رکھی اور  
 اوپر دسی شراب میں کپڑے جھگو کر باندھ دیئے....

”اب ملک! مجھے یہ بتاؤ میں کیا کروں۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی  
 کو بلایا تھا مگر یہ بڑبھری تھا کہ ہندو ہے اس لیے دھوکہ دے گا۔ اُس کی جگہ تم

آگے۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ہے لیکن میں یہ بتاؤں کہ میں اس لڑکی سے دست بردار نہیں ہوں گا اور اسے قتل کی اس واردات میں شامل نہیں ہونے دوں گا، خواہ مجھے ایک بار پھر بھگانا پڑے۔ یہ میرے لیے اب صرف لڑکی نہیں ہے۔ یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ اسے اب مسلمان سمجھو۔ اس پر جو ظلم ہوا ہے وہ دیکھو۔ کس مردود کے ساتھ اسے بیاہ دیا گیا تھا؟

”تم نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس سے صورت بدل گئی ہے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ یہ بیان دوں گا کہ لڑکی کی نشاندہی نہیں اس کے گاؤں جا رہا تھا۔ راستے میں رات ہو گئی اور میں اصلے کے گھر سے میں آ گیا۔ اصلے سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا کافی احوال اپنی حفاظت کا انتظام کرنا ہے۔ مجھ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ میں اکیلا کیوں گاؤں کو چل پڑا تھا۔ اس کا یہ جواب دے سکتا ہوں کہ میں کسی کو خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اکیلا گیا اور خاموشی سے گیا اور رات کو گیا۔“

”لڑکی کی نشاندہی کیا بتاؤ گے؟“

”یہی لازم ہے تم نے پکڑ لیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں لڑکی سے یہ بیان دلاؤں گا کہ یہ آدمی اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا کہ ساہوکار کے گھر سے جاگ چلو۔ شادی سے پہلے بھی پریشان کرتا رہتا تھا۔ چونکہ وہ امیر کبیر زمیندار کا بیٹا ہے اس لیے لڑکی اسے دھنکارنے سے ڈرتی تھی۔ اس آدمی نے ساہوکار کو قتل کر کے لڑکی سے کہا کہ چلو اس کے ساتھ۔ وہ لڑکی کو بھی قتل کر دینے کی دھمکیاں

دیتا تھا۔“ اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”مخدا کے منڈے، تم بھی کچھ بولو۔ کیا تم انگریزی حکومت سے وفاداری کرو گے یا ایک مظلوم لڑکی کی عزت بچانے کی کوشش کرو گے جو اسلام قبول کر رہی ہے؟“

”میں تمہیں کوئی راستہ نکال دوں گا۔“ میں نے اُسے اُسی بے تکلفی سے کہا جس بے تکلفی سے وہ میرے ساتھ بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن تم ایسے حرامی ہو کہ اس لڑکی کو مسلمان بھی کر لو گے، اس کے ساتھ شادی بھی کر لو گے مگر تھوڑے سے عرصے میں تمہارے آج کے جذبات شراب اور بدکاری میں ڈوب جائیں گے اگر تم مجھ سے لڑکی کے لیے جہدِ ردی چاہتے ہو تو مجھے یقین دلاؤ کہ تم ہمیشہ اس کے وفادار رہو گے۔“

”تم شاید نہیں سمجھ سکتے کہ اس لڑکی کی محبت میری روح میں اُتر گئی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور اصلے تنگ نے مجھے انسان بنا دیا ہے۔ میں حرامی بن چھوڑ چکا ہوں۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم اگر میرا بھیرا پڑاؤ تو تم پورے چکر باز ہو، میری مدد کرو۔“

میں نے مدد کا وعدہ کر دیا۔

## میں نے جھوٹ کا جال پھرایا

لڑکی کو بلا کر اسے اچھی طرح بتایا کہ وہ کیا بیان دے گی۔ اسے قاتل کے خلاف بیان دینے تھے۔ اس پر بھی وہ آمادہ ہو گئی۔ میں نے اپنے طور پر

لڑکی کا گہرا جائزہ لیا۔ اسے بولنے کا موقعہ دیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکی دھوکہ باز تو نہیں۔ مجھے ایسا کوئی اشارہ نہ ملا۔ اس کے دل میں ساہوکار کے خلاف جو نفرت تھی وہ اُسے قتل کر کے بھی نہیں نکلی تھی۔ اس نے قتل سے پہلے ساہوکار سے اپنے باپ کا سارا سود اور ادھا قرض معاف کرا لیا تھا لیکن اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف بھی نفرت تھی۔ وہ اس لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اُس روز یہ نفرت اور زیادہ گہری ہو گئی تھی جس روز باپ نے اسے اتنے بڑھے اور ایسے بھدے جسم کے ساہوکار کے ساتھ صرف اتنے سے لاپرواہ سے بیاہ دیا تھا کہ ساہوکار نے تھوڑا سا سود معاف کر دیا تھا۔

لڑکی کی ان باتوں سے مجھے شک ہو گیا کہ اس کا باپ جو اتنی پیاری بیٹی سے پیار نہیں کرتا تھا اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ سچپن میں اُس نے لڑکی سے کہی بار کہا تھا ”اے بیٹھے مسلمان کی اولاد“ اور اُس نے لڑکی کو اس ساہوکار کے حوالے کر کے اس عداوت کی تسکین کی تھی جو اس کے دل میں لڑکی کے خلاف تھی۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ جب اس کے باپ نے اس ظالمانہ شادی کا فیصلہ کیا تو لڑکی کی ماں بہت روئی تھی مگر باپ نے پروا نہیں کی تھی۔ میں نے ہر مذہب اور مختلف علاقوں کی عورتیں دیکھی ہیں۔ ہندو لڑکی کا انداز کچھ اور ہوتا ہے لیکن یہ لڑکی ہندوؤں سے بہت مختلف تھی۔ اس کی باتوں میں بچنگی اور ذہانت تھی۔ بات سنتی تھی اور فوراً اچھا جی نہیں کہتی تھی۔ اپنی رائے دیتی اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی تھی۔ اس نے میری باتیں سمجھ لیں۔ مجھ سے کچھ سوال پوچھے اور معاملہ طے ہو گیا۔

تھانیدار کو بھی میں نے ایک راستہ بتا دیا۔ دراصل میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ مجھے اس تھانیدار کو برآمد کرنا تھا اور برآمدگی کے بعد کارروائی میں شہادت دینی تھی لیکن مسئلہ ایسا پیدا ہو گیا کہ میں نے اپنی ڈیوٹی طے کر لی۔ قتل کی واردات کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کیس میں میری حیثیت ایک گواہ کی بن گئی تھی کیونکہ میں نے قاتل کو پکڑا تھا۔ نازک مسئلہ نگرانی کا تھا۔ اسے گواہ کے طور پر پیش کرنا ضروری تھا لیکن اب اس سے یہ نہیں کہلانا تھا کہ وہ لڑکی کے پیغامِ ملزم تک پہنچاتی تھی۔ اسے اب کسی اور طریقے سے استعمال کرنا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ اس سے ملزم کو فائدہ نہ پہنچ سکے۔

سوچ سوچ کر میں نے تھانیدار سے کہا تھا کہ وہ اس پر زیادہ توجہ نہ دے کہ ملزم کو ضرور سزا ہو۔ بری ہو جاتا ہے تو ہونے دو۔ کوشش یہ کرنی تھی کہ تھانیدار کے خلاف کوئی شوشہ نہ نکل آئے۔ ہم نے اسے۔ ایس۔ آئی کو بھی اندھیرے میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات وہیں گزاری۔ سو راج نکلنے سے پہلے ہم تھانیدار اور لڑکی کو ایک پاکی میں بٹھا کر روانہ ہوئے۔ پاکی اٹھانے والے گاؤں کے آدمی تھے شہر پہنچتے ہی دونوں کو ہسپتال میں لے گئے۔ لڑکی کے دونوں کندھوں پر بچھبوں کے زخم تھے جو گہرے نہیں تھے۔ کھال کٹ گئی تھی۔ میں تھالے گیا اور پہلا کام یہ کیا کہ ایک کانٹیل کو لڑکی کے گاؤں بھیجا کہ لڑکی کی ماں اور اس کے باپ کو بلا لائے۔ میں ملزم کو حالات سے نکال کر تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ یہ دراصل میرا کام نہیں تھا لیکن میں نے اس دھاندلی کو جائز سمجھا۔ ملزم کی ذہنی حالت بہت



بڑی تھی۔ قتل کے الزام میں پکڑے جانا بجائے خود بہت بڑی چوٹ تھی جس نے اُس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ جو کسر رہ گئی تھی وہ ان ملزموں نے پوری کر دی تھی جو حالات میں بند تھے۔ میرے کہنے پر وہ اسے ڈراتے رہے تھے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے ذرا پیار سے بات کی تو وہ رو پڑا۔

میں نے پیار اور شفقت کا رویہ اختیار کیا۔ اسے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی جو میں نے دے دیا اور وہ میرے اشاروں پر ناپنچے لگا۔ اس نے اقبالی بیان دیتے ڈرا دیر نہ لگائی۔ یہ بالکل وہی کہانی ہے جو میں آپ کو دوسروں کی زبانی سنا چکا ہوں مگر اس میں لڑکی اور نوکرانی کا رول ہمارے ڈرامے کے لیے خطرناک تھا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ لڑکی کو اتنا زیادہ چاہتا ہے کہ اس کی خاطر اُس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اور لڑکی اس پر قربان ہونے کو تیار ہے۔ میں نے اس کے جذبات کو بھڑکا کر کہا کہ یہ مرد انگلی نہیں کہ وہ اپنے ساتھ لڑکی کو بھی عدالت میں خراب کرتا پھرے۔ یہ جذباتی دیہاتی مان گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کیا بیان دے۔ میں نے اسے بتا دیا۔ اس کا بیان مکمل کر کے اسے مجسٹریٹ کے سامنے دفعہ نم ۱۶۱ کے تحت بیان دینے کے لیے تیار کیا۔

اس کی گرفتاری ساہوکار کے گھر کی رکھی۔ نوکرانی کو میں نے جو بیان یاد کرایا اس میں اس پر زور دیا کہ ملزم ساہوکار کے گھر میں داخل ہوا۔ نوکرانی گھر میں اکیلی تھی۔ ملزم نے لٹکار کر پوچھا کہ لڑکی کہاں ہے۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔

نوکرانی نے ملزم کو ایک کمرے میں یہ کہہ کر بٹھا دیا کہ وہ لڑکی کو بلائے جا رہی ہے۔ لڑکی کی سہائے وہ پولیس کو بلا لائی۔ ملزم نے پولیس کو دیکھ کر نوکرانی پر حملہ کیا مگر اسے ہتکڑی لگا لی گئی۔

یہ میں نے آپ کو نہایت مختصر سنایا ہے کہ میں نے شہادت کو کیا رنگ دیا۔ اس میں بہت باریکیاں اور کئی نازک پہلو تھے جو میں اس لیے نہیں سنارہا کہ بہت طویل ہیں۔ آپ دل چسپی کھو بیٹھیں گے۔ مختصر یہ کہ میں نے دونوں میں شہادت تیار کر دی۔ ہو سکتا ہے آپ کہیں کہ میں نے کیس پر جھوٹ کا رنگ چڑھا کر ناجائز حرکت کی تھی۔ میں نے یہ حرکت ہندو ہی سمجھی تھی۔ ایک مظلوم لڑکی کا مستقبل سنوارنے کے لیے مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ ساہوکار کے قتل کا مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ آپ نہیں جانتے کہ ہندوستان میں ہندو میرے ساتھ کیسا بڑا سلوک کرتے رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ میں مسلمان تھا۔ اپنی بعض کہانیاں میں ان کے سلوک کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں ان کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

## مسلمان لڑکی کا قبول اسلام

شام سے بہت پہلے لڑکی کا باپ اور ماں آگئی۔ میں نے باپ کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ وہ قتل کے الزام میں پکڑا جائے گا۔ بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ میں جو بیان بتاؤں وہ یاد کرو اور عدالت میں یہی بیان دینا۔ غریب سا کسان رضامند

بہو گیا۔

جنگل میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ وہاں شکاری آیا کرتے تھے۔ بعض اپنے ساتھ خیمے لاتے تھے اور بعض ڈاک بنگلے میں رہتے تھے۔ ایک شکاری آیا۔ مسلمان تھا۔ بہت خوبصورت جوان تھا۔ اُس نے جنگل میں مجھے دیکھ لیا۔ اس نے میرے ساتھ زبردستی نہیں کی۔ کوئی بد تمیزی نہیں کی۔ بڑی پیاری باتیں کرتا رہا اور چلا گیا۔ میں اُسے دل میں یاد کرتی رہی۔ میں نے اتنا خوبصورت جوان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چھ سات روز بعد پھر آیا۔ اب میں جان بوجھ کر اس کے راستے میں آئی.... اور میں اپنی خواہش اور پند کا شکار ہو گئی....

”لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا رنگ اور نقش اپنے باپ کے تھے۔ میرے خاوند نے صاف کہہ دیا کہ یہ اس کی اولاد نہیں، اور اس نے یہ بھی کہا۔ میں نے تمہیں اُس شکاری کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ تم ہجرت کے لیے اُس کا کوئی کام کر رہی ہو۔ وہ مجھے وہاں سے لے آیا اور جگہ جگہ خراب ہوتے ہم اس گاؤں میں آگئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ یہ وجہ تھی کہ میرے خاوند نے اس لڑکی سے کبھی پیار نہ کیا اور یہ جوان ہوئی تو ذرا سے لالچ میں اس ساہوکار کے حوالے کر دی۔“

مجھے اپنے تھانے میں واپس جانا تھا۔ میں نے تھانیدار کی برآمدگی کی رپورٹ تیار کی اور اپنے ہیڈ کوارٹر کو چلا گیا۔ تھانیدار ہسپتال سے فارغ ہوا تو قتل کا کیس عدالت میں گیا۔ تھانیدار نے لڑکی کو ساہوکار کے گھر رکھا اور ساہوکار کے بیٹوں کو ڈرایا کہ وہ اسے گاؤں نہ بھیجیں ورنہ پکڑے جائیں گے۔ مجسٹریٹ نے کیس سیشن سپر وکریا لیکن صفائی کے ذمیل نے گواہوں کے

لڑکی کی ماں کے بیان کو میں نے غیر ضروری سمجھا پھر بھی ایک دو باتیں بھانے کے لیے اسے الگ بٹھا لیا۔ یہ عورت ایک اور کہانی کی کردار نکلی۔ لڑکی کا باپ رنگ اور نقش و نگار کے لحاظ سے اسی علاقے کی صحیح نمائندگی کرتا تھا، لڑکی کی ماں کے نقش بڑے اچھے تھے اور رنگ گندمی۔ جوانی کی خوبصورتی بھی اس میں موجود تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے بہت روتی تھی میں نے اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ شفقت کی۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ وہ اپنے خاوند کو کوستی تھی جس نے اس کی بیٹی کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ میں اس سے پوچھ بیٹھا کہ تمہارا خاوند اپنی بیٹی کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، کیا وجہ ہے؟

”وہ کہتا ہے یہ اس کی بیٹی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور کس کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس وقت تک میں اسے اپنے ساتھ خاصا بے تکلف کر چکا تھا۔ میرے سوال کا اس نے جواب نہ دیا۔ سر جھکا لیا۔

”اگر تم بڑا زمانہ تو یہ شک مجھے بھی ہے کہ یہ بیٹی تمہارے خاوند کی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم غم نہ کرو۔ تمہاری بیٹی کو میں صاف پہچانوں گا اور اس کی زندگی سنوار دوں گا۔“

”میرا خاوند ٹھیک کہتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ لڑکی اس کی بیٹی نہیں۔“ اُس نے شمالی ہندوستان کے ایک دُور کے علاقے کا نام لے کر کہا۔

”وہاں میری شادی ہوئے دو چار روز گزرے تھے ہم بہت غریب لوگ تھے۔“

بیانات میں تضاد واضح کر دیا تھا۔ عدالت میں جھوٹ کو پتہ ثابت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے شک تھا کہ کہیں کا یہی حشر ہوگا۔ وہی ہوا۔ ملزم سیشن کورٹ سے بری ہو گیا۔

تھانیدار اور لڑکی کے اغوا کے بعد کی کارروائی انگ کہانی ہے۔ چھ ماہ بعد تھانیدار نے لڑکی کو غائب کر لیا۔ ڈیڑھ دو سو میل دور اپنے ایک دوست کے گھر پہنچایا۔ پھر خود گیا۔ لڑکی کو مسلمان کیا اور شادی کر لی۔ چار سال بعد وہی بس اُس سے ملاقات ہوئی تھی کیس کے بعد یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں لڑکی کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ ان کا ایک بچہ پیدا ہو چکا تھا۔

○○○

## اس نے گناہ تو نہیں کیا

آج میں اپنی نہیں کسی اور تھانیدار کی تفتیش کی کہانی سناؤں گا۔ اُس کا نام خان باز گل تھا۔ کوہاٹ کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس کی کہانی اس لیے سنارہا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ صرف احمد یار خان تفتیش کا ماسٹر تھا۔ پولیس کے محکمے میں ایک سے ایک ”سٹے خان“ تھا۔ اس واردات کا قصہ پڑھ کر آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کیسی کیسی وارداتیں ہوتی ہیں اور انسانی فطرت کیسے کیسے دکھایا کرتی ہے۔

میں اُن دنوں سب انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔ ابھی دوسری جنگِ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک مہینے کی چھٹی گزار کر واپس جا رہا تھا میں راولپنڈی سے ریل گاڑی میں سوار ہوا۔ خان باز گل بھی وہیں سے سوار ہوا۔ وہ کوہاٹ سے چھٹی گاڑی کر رہا تھا۔ راولپنڈی سے اُس نے گاڑی بدلی تھی۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔ ہم ایک ہی ڈبے میں سوار ہوئے۔ اُن دنوں ریل گاڑیوں میں کوئی ریش نہیں ہوا کرتا تھا۔ آدھی

گاڑی خالی ہوتی تھی۔ ہمسفر بڑے مزے سے گپ شپ لگاتے جاتے تھے۔

خان باز گل میرے پاس بیٹھا۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ بھی سب انکپڑ ہے اور صنلج امرتسر کے کسی تھانے کا انچارج ہے۔ مجھے اس تھانے کا نام یاد نہیں رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں بھی سب انکپڑ ہوں تو ہم فوراً دوست بن گئے۔ اُس نے اپنا ایک مسئلہ میرے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ میری کہانی سُن کر مجھے بتائیں کہ میں نے گناہ تو نہیں کیا ہے وہ جس تھانے میں تھوادہ سکتوں کا علاقہ تھا۔ ہماری جونسلیں پاکستان میں پیدا ہوئی ہیں انہوں نے سکتوں کو صرف دیکھا ہوگا۔ اُن کی خصلتوں اور ان کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔ دیہاتی علاقے کے سکھ جنگلی اور وحشی ہوا کرتے تھے۔ اب بھی اُن کی حالت دیسی ہی ہوگی۔ گھر میں عورتوں اور بھوسلیوں کے سامنے بات کرتے ہیں تو انتہائی فحش گالیاں بکتے ہیں۔ گالیوں کے بغیر وہ اپنی بات کو نا کمل سمجھتے ہیں۔ یہی حال اُن کی عورتوں کا ہے۔ وہ شرم اور حیا کو تسلیم نہیں کرتے۔ جو لوگ سکھوں کو نہیں جانتے وہ شاید یقین نہ کریں کہ اگر ایک بھائی شادی کر لے تو اُس کی دُسن اُس کے تمام بھائیوں کی دُسن ہوتی ہے۔ اس بے حیائی کو بھائی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ البتہ باہر کا کوئی آدمی کسی کی بیوی سے چھڑغانی کرے تو بات قتل تک پہنچ جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ سکھ جس طرح جسمانی لحاظ سے غلیظ ہوتے ہیں اسی طرح اُن کی عادتیں بھی بیہودہ ہوتی ہیں۔

خان باز گل نے ایک واردات اس طرح سُنائی کہ ایک روز اُس کے ایک مخبر نے اُسے بتایا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر کوئی آدمی قتل ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ ایک عورت بھی قتل ہو جائے۔

میں آپ کو اپنی کہانیوں میں کئی بار بتا چکا ہوں کہ ہر تھانے میں مخبر ہوتے ہیں جن میں سے بعض سکھاری یعنی باقاعدہ ملازم ہوتے ہیں اور بعض غیر سکھاری۔ اکثر تھانیدار بعض جرائم پیشہ آدمیوں کو اپنے اعتماد میں لیے رکھتے اور انہیں مخبری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بعض مخبر اتنے ذہین اور گھاگھ ہوتے ہیں کہ زمین کے نیچے کی خبریں معلوم کر لیتے ہیں۔

ایسے ہی ایک گاؤں میں رہنے والے ایک مخبر نے خان باز گل کو بتایا کہ ایک سکھ کی جوان بیوی کئی دنوں سے لاپتہ ہے اور سکھ اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اُس نے کسی کو بتایا نہیں کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ بیوی کے والدین کو بھی شک ہو گیا ہے کہ اُن کی بیٹی اپنے خاوند کے گھر میں نہیں ہے۔ مخبر نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ بیوی بیمار نہیں اور وہ ضرور لاپتہ ہے۔

مخبر نے یہ بھی بتایا کہ یہ لڑکی عام سکھ عورتوں سے بہت مختلف ہے۔ باتیں بھی صاف ستھری کرتی ہے اور رستی بھی صاف ستھری ہے۔ دلیر اور نڈر ہے اور یہ شک کیا جاسکتا ہے کہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اُس کا خاوند اُسے مارتا پٹتا تھا۔ وہ اپنے خاوند سے غرض نہیں تھی۔ اگر اس سکھ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے تو وہ اُسے قتل

کردے گا اور اُس کے دوست کو بھی قتل کر دے گا۔

سکھوں کو میں جانتا تھا۔ وہ اپنی بہو بیٹی اور بیوی کی گمشدگی کی رپڑ پولیس کو نہیں دیا کرتے بلکہ خود سرانفرسانی کر کے مجرموں کو سزا سنا دیا کرتے تھے جو سزائے موت یعنی قتل سے کم نہیں ہوا کرتی تھی۔ مجھ نے اس سکھ کے متعلق بھی خان باز گل کو قبل از وقت خبردار کر دیا کہ قتل کی واردات ہونے والی ہے۔

خان باز گل نے مجھے بتایا کہ اُس نے پروانہ کی بلکہ مخبر سے کہا کہ قتل ہونے دو تو کارروائی کریں گے۔ اُسے یہ بھی توقع تھی کہ یہ سکھ اپنی بیوی اور اُس کے آسٹنا کو قتل کر کے خود ہی تھانے آجائے گا۔ یہ لوگ عموماً ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ ہمارے دیہات میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے کہ خاوند اپنی بے وفا بیوی کو یا اُس کے دوست کو یا دونوں کو قتل کر کے آئے قتل کے ساتھ تھانے چلا جاتا اور جرم کا اقبال کر لیتا ہے۔

خان باز گل ان تھانیداروں میں سے تھا جو قتل کی واردات میں دونوں فریقوں سے مالی فائدہ حاصل کیا کرتے ہیں۔ مقتول کے لواحقین پولیس کو اس مقصد کے لیے کھلاتے پلاتے ہیں کہ قاتل کو پکڑا جائے اور ایسی شہادت پیش کی جائے کہ قاتل پھانسی سے نہ بچ سکے اور قاتل کے لواحقین مقدمہ کمزور رکھنے کے لیے پولیس کو منہ مانگی رشوت دیتے ہیں اور جب تھانیدار تعینات کے لیے کسی گاؤں میں جا ڈیرا جاتا ہے تو اُس کی خاطر تواضع اتنی ہوتی ہے جتنی ملک کے صدر یا بادشاہ کی ہوتی ہوگی۔

باز گل اس پر بھی خوش ہوا کہ یہ سکھ قتل کر کے خود تھانے نہ آیا تو اُسے پکڑنا مشکل نہیں ہوگا کیونکہ مجھ نے اُسے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی۔

”تم سکھ ہو، میں پٹھان ہوں“

دوسرے ہی دن تھانے میں اطلاع آئی کہ ایک عورت کی لاش ملی ہے جسے شناخت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ لاش کا سر نہیں ہے۔ خان باز گل موقع پر گیا۔ لاش پر چادر پڑی تھی۔ چادر ہٹا کر لاش دیکھی۔ اس کا سر غائب تھا۔ گردن تیز دھاڑھتیا ر سے کاٹ کر سر الگ کیا گیا تھا۔ ایک بازو گتھی کے اوپر سے کاٹ کر جسم سے الگ کیا گیا تھا اور ایک ٹانگ گتھے سے کاٹ کر الگ کر دی گئی تھی۔ جسم کے کٹے ہوئے یہ حصے وہاں نہیں تھے۔ لاش پر کھماڑی یا چھری کے بے شمار زخم تھے۔

لاش سے چار پانچ قدم دور ایک گڑھا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ لاش اس گڑھے میں سے بھڑیلوں یا گیدڑوں نے نکالی ہے۔ کہیں کہیں سے لاش کھائی ہوئی تھی۔ کپڑے خون میں رنگے گئے اور ان پر مٹی جم گئی تھی۔ کپڑے پھٹ بھی گئے تھے جو بازو سلامت تھا اس کی کلائی میں سونے کی دو باریک چوڑیاں اور تین چار چوڑیاں کایچ کی تھیں۔ لاش کے ساتھ سونے کی اشیا کی موجودگی تھی کہ یہ قتل دشمنی کی بنا پر کیا گیا ہے، رہزنی کے لیے نہیں۔ لاش سوج گئی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اسے مرے

چار پانچ دن گزر گئے ہیں۔

سکھ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ اُس کی بیوی کی لاش نہیں ہے۔  
دیہاتی سکھوں میں یہ بھی وصف تھا جو اب بھی ہو گا کہ عند اور  
بٹ کے پکے تھے۔ بات صحیح ہو یا غلط سچ ہو یا جھوٹ، سکھ اڑھائے  
تو اس سے ذرا سا بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا تھا۔ خان باز گل سکھوں کے  
اس وصف سے واقف تھا۔

”تم سکھ ہو اور میں پٹھان ہوں۔“ اُس نے اس سکھ سے کہا۔  
”اگر تم عند کے پکے ہو تو میں تم سے زیادہ ڈھیٹ ہوں۔ مجھے صرف  
یہ بتا دو کہ تمہاری بیوی کہاں ہے۔ اپنی بیوی کو میرے سامنے لے آؤ  
اور جاؤ چھٹی کرو۔“

”میری بیوی نے کیا جرم کیا ہے کہ تمہارے سامنے لے آؤں؟“  
سکھ نے بڑی دلیری سے کہا۔ ”تم بلاوجہ یہ قتل میرے سر قہو رہے ہو۔“  
”میں تمہاری بیوی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ خان باز گل نے کہا۔  
”تم اُس کی ہوا کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔“ سکھ نے جواب دیا۔ ”تم  
پٹھان خان ہو تو میں پانچ پیاروں کا چلیا ہوں۔ اپنا سر کاٹ کر اپنی ہتھیلی  
پر رکھ کر دکھا سکتا ہوں۔“

سکھ کے اس جواب کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سکھوں کی تاریخ  
دران کے عقیدوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ خان باز گل پٹھان ہونے  
کے علاوہ تھا نیدار بھی تھا۔ دیہاتی علاقے کا تھا نیدار بادشاہ ہوتا ہے۔  
اس نے سکھ پر غصہ نہ جھاڑا کیونکہ وہ اپنی پاور اور اتھارٹی سے واقف تھا۔

اردگرد کا علاقہ چھان گیا۔ موقعہ واردات قریب ہی تھا یعنی مقتولہ  
کو قریب ہی قتل کیا گیا تھا۔ زمین پر خون جما ہوا اور مجرتوں کے نشان  
تھے۔ ان میں گیدڑوں، گوتوں اور بھٹیوں کے پنجروں کے بھی نشان تھے۔  
ایک کھڈ میں ایک جھاڑی کے ساتھ ایک دوپٹہ پڑا تھا اور چند قدم  
بہٹ کر ایک پاؤں کی زمانہ چپل پڑی تھی۔ کھرے کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ  
کئی دن گزر چکے تھے۔ کھرے واضح نہیں رہے تھے۔ یہ دیہاتی علاقہ تھا۔  
کہیں ویران اور بنجر زمین تھی، کہیں سرنڈے اور کہیں کھیتیاں تھیں۔ گاؤں  
موقعہ واردات سے کچھ دُور تھے۔ تھانے میں کسی عورت کی گشدگی کی  
کوئی رپورٹ نہیں آئی تھی۔ البتہ خان باز گل کو ایک مجب نے ایک ہی  
دن پہلے بتایا تھا کہ ایک سکھ کی بیوی لاپتہ ہے اور یہ بیوی اگر اُسے مل  
گئی تو قتل ہو جائے گی اور وہ آدمی بھی قتل ہو جائے گا جس کے ساتھ  
اُس کی بیوی گئی تھی۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے مجھوانے سے پہلے خان باز گل نے  
اس سکھ کو اُس کی ماں اور باپ اور اُس کی ساس اور مسر کو وہیں بلا  
لیا جہاں لاش پڑی تھی۔ وہ آئے تو اس پٹھان تھا نیدار نے باقی سب  
کو دُور کھڑا رہنے دیا اور اس سکھ یعنی خانو کو لاش کے پاس لے جا کر کہا  
— ”یہ تمہاری بیوی کی لاش ہے۔ اگر اسے تم نے قتل نہیں کیا تو بتا دو کہ  
قاتل کون ہو سکتا ہے۔ تمہیں کس پر شک ہے؟“

اُس نے لاش کی پھٹی ہوئی قمیض کا ایک ٹکڑا اور ایک ٹکڑا اشلوار کا اپنے ایک آدمی کو دے کر کہا کہ جہاں کہیں پانی ملے وہاں یہ دونوں ٹکڑے اس طرح دھولاؤ کہ خون کا نشان نہ رہے۔ کہ پڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔ وہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔ وہ آدمی دوڑتا گیا۔ خان بازگل نے سکھ کو اپنے دو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔ مجھے کسی کا بھی نام یاد نہیں رہا۔ اس سکھ کو آپ ہرنام سنگھ کہ لیں تاکہ کہانی منانے اور منسنے میں آسانی رہے۔

## ”تمہاری بیوی کہاں ہے؟“

خان بازگل کو یہی شک تھا کہ یہ لاش ہرنام سنگھ کی بیوی کی ہے اور قاتل ہرنام سنگھ ہے۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی ساس اور سسر کو بلایا۔ اپنی دیر میں وہ آدمی لاش کے کپڑوں کے ٹکڑے دھولا یا تھا۔ ساس اور سسر نے لاش کی چوڑیاں دکھیں۔ کاپڑ کی چوڑیاں بھی دکھیں، قمیض اور اشلوار کے ڈھلے ہوئے ٹکڑے دکھیں تو دونوں نے کہا کہ یہ اُن کی بیٹی کی لاش ہے۔

اگر سربل جاتا تو شناخت صحیح ہو سکتی تھی۔ تلاش کے باوجود سرنہ ملا۔ شک تھا کہ کہیں دُور اور گمراہا گیا ہوگا یا نہر میں پھینک دیا گیا ہوگا جو وہاں سے تھوڑی ہی دُور تھی۔ مقتولہ کی ساس یعنی ہرنام سنگھ کی ماں کو الگ بلا کر لاش، کپڑے اور چوڑیاں وغیرہ دکھائی گئیں۔ خان بازگل نے اس عورت

کو آزادی سے کوئی رائے یا فیصلہ نہ دینے دیا۔ بڑی چالاکي سے اُسے اپنی بات پر لاتا رہا اور بڑھیا سے کہلوا لیا کہ یہ اُس کی بیوی کی لاش ہے۔ مقتولہ کے سسر سے بھی اُس نے یہی کہلوا لیا۔

در اصل خان بازگل کے لیے سہولت اس میں تھی کہ ثابت ہو جائے کہ مقتولہ ہرنام سنگھ کی بیوی تھی۔ عام قسم کے تھانیداروں کی طرح وہ سرانجامی کے جھیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اُسے وہ طریقے معلوم تھے جن سے وہ ہرنام سنگھ کو قاتل ثابت کر سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ قاتل واقعی ہرنام سنگھ تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ کے ماں باپ اور اُس کی بیوی کے ماں باپ سے کہلوا کر کہ یہ ہرنام سنگھ کی بیوی ہے، اُسی کے مطابق کاغذات تیار کیے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور سب کو تھانے لے گیا۔ ہرنام سنگھ کو اُس نے باقاعدہ حراست میں نہ لیا تھا نہ میں ہٹھائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اُسے ایک بار پھر کہا کہ ہرنام نے خود ہی بیان دے دیا اور سزا میں فائدہ اٹھاؤ، مگر ہرنام سنگھ ہبہ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ سیدھی اور شریفانہ بات منسا ہی نہیں تھا اور وہ جو بات کرتا وہ غصتے اور طعنے کے لہجے میں کرتا تھا۔

”پھر یہ بتا دو کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟“ خان بازگل نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تمہاری بیوی لاپتہ ہے۔ اگر تم نے اُسے قتل نہیں کیا تو رپورٹ درج کرواؤ۔ میں اُسے تلاش کروں گا۔“

”تم میری بیوی کے باپ گتے ہو؟“ ہرنام سنگھ نے کہا۔ ”میں تُو

کا بچہ ہوں۔ داہگورو کا خالصہ ہوں۔ اپنی بیوی کو خود تلاش کروں گا۔ اگر مل گئی تو اُس کی لاش اپنے کندھوں پر اٹھا کر تمہارے تھانے میں تمہارے سامنے رکھ دوں گا اور کہوں گا، یہ لو خان بابا اب مجھے باندھ لو۔

”تو یہ صحیح ہے کہ تمہاری بیوی لاپتہ ہے؟“

”معلوم نہیں۔“ ہر نام سنگھ یہ تسلیم کر کے کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہے بگڑ گیا اور بولا۔ ”گم ہے یا گھر میں ہے، وہ میری بیوی ہے۔ میں جانوں وہ جانے۔ تم اُس وقت اس معاملے میں ٹانگ اڑانا جب میں تمہارے دفتر میں عرضی ڈالوں گا کہ میری بیوی ڈھونڈ دو۔“

”تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ اُس کے تعلقات کس کے ساتھ خراب ہیں؟“

خان بازگل نے کہا۔

ہر نام سنگھ کی غیرت کو اتنی سخت چوڑی لگی کہ وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس نے خان بازگل کو یہاں تک کہ دیا۔ ”تمہاری بیوی کے تعلقات کس کے ساتھ خراب ہیں؟ تمہاری بہن کے تعلقات کس کے ساتھ خراب ہیں؟ میرے ساتھ ہوش سے بات کرو۔ میں خالصہ ہوں مسلمان، نہیں ہوں۔“

خان بازگل اُس وقت تک دوستانہ لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ہر نام سنگھ بچنس جائے اور اقبال جرم کر لے۔ اب اس سنگھ نے اتنی سخت باتیں کہیں تو خان بازگل کا پٹھانی اور مسلمان خون ابل پڑا۔ اُس نے دو مسلمان کانسٹیبلوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ اسے دہرام سنگھ کو لے جاؤ۔ اس کی بگڑی لہجہ دو اور اس کے بال رستی سے باندھ کر

اسے لٹکا دو... سنگھوں کے سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے ہوتے ہیں۔ سنگھوں کے علاقوں کے اکثر تھانیدار سنگھ ملزموں کو پہلی اذیت یہ دیتے تھے کہ انہیں بالوں سے باندھ کر چھت کے ساتھ لٹکا دیتے تھے۔

خان بازگل نے مجھے بتایا کہ وہ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اسے اب یغیال نہیں تھا کہ ہر نام سنگھ قاتل ہے یا نہیں۔ اب وہ اسے انتقاماً قاتل ثابت کرنے پر نکل گیا تھا۔

ہر نام سنگھ کو کانسٹیبل لے گئے تو خان بازگل نے مقتولہ کی ماں اور اُس کے باپ کو بلایا۔ اُن سے پوچھا کہ اُن کی بیٹی کب سے لاپتہ تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے تھے۔ ماں باپ سخت بھڑکے ہوئے تھے۔ اُن کی بیٹی قتل ہو گئی تھی۔ خان بازگل نے انہیں اور زیادہ بھڑکایا۔ انہوں نے بتایا کہ ہر نام سنگھ ان کی بیٹی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا تھا۔ اُسے مارتا پٹیتا بھی تھا۔ اُن کی بیٹی تیسرے چوتھے دن ماں باپ کے گھر جاتی تھی اور خاوند اُس کے ساتھ جو سلوک کرتا وہ انہیں بتاتی تھی۔ اُسے مقتولہ کی شک تھا کہ ہر نام سنگھ نے کسی عورت کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ہر نام سنگھ اسی بات پر اُسے مارتا پٹیتا تھا کہ وہ اُسے باہر جانے سے روکتی تھی اور آٹے دن لڑائی کھڑا رہتا تھا۔

مقتولہ کے ماں باپ نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ ان کی بیٹی کو ہر نام سنگھ نے قتل کیا ہے۔ دراصل یہی کوشش خان بازگل



دھکی دے کر کہا کہ باہر کسی سے ذکر نہ کریں کہ لڑکی غائب ہے۔ وہ ابھی لڑکی ہی تھی۔ شادی کو ڈیڑھ برس ہوا تھا اور اُس کی عمر بائیس تیس سال تھی ہرنام گھ کے دو بھائی تھے۔ دونوں اس سے چھوٹے تھے لیکن جوان تھے۔

ہرنام سنگھ نے بیوی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کلمہ لٹریچر اٹھائے سارا دن غائب رہتا تھا۔ اُس نے اُن مسلمان گھرانوں کے دو جوان آدمیوں کو بھی دھکیا دی تھیں جہاں اس کی بیوی جاتی رہتی تھی۔ ہرنام سنگھ کو نوٹک تھا کہ ان دونوں میں سے کسی نے اس کی بیوی اڑالی ہے۔

## لاش کے ٹکڑے کیوں کیے؟

خان بازگل نے ہرنام سنگھ کے بھائیوں کو بلایا۔ ان میں سے ایک کی عمر بیس اکیس سال اور دوسرا اس سے دوڑھائی سال چھوٹا تھا۔ دونوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان سے سوال جواب ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ مقتولہ سے بہت ہی نالاں تھے جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ دیہاتی سکھوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ ایک بھائی کی بیوی پر دوسرے بھائیوں کا بھی خاوندوں جیسا حق ہوتا تھا۔ خان بازگل نے ہرنام سنگھ کے بھائیوں سے اس رواج کے متعلق سوال کیا۔

”وہ تو نام کی سکھ تھی“۔ دونوں بھائیوں نے مقتولہ کو گالیاں دے کر کہا۔ ”اسے طور طریقے مسلمانوں والے اچھے لگتے تھے۔ کہتی تھی کہ

کی تھی۔ وہ اُن کے جذبات کو چھڑ چھڑ کر اُن کے منہ سے اپنے مطلب کی باتیں نکلا رہا تھا۔ مقتولہ کے ایک بھائی کو اُس نے اتنا مشتعل کر دیا کہ وہ بھائی ہرنام سنگھ کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ خان بازگل نے اُسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا اور اُسے یقین دلایا کہ وہ خود اسے پھانسی کی سزا دلائے گا۔

ہرنام سنگھ کی ماں کو الگ اور باپ کو الگ بلا کر خان بازگل نے پوچھ گچھ کی۔ قدرتی طور پر انہوں نے اپنے بیٹے کے حق میں باتیں کیں اور اُسے بچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے مقتولہ کے خلاف باتیں کیں اور اُس پر یہ الزام عائد کیا جو کسی عورت کو ہرنام کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ خان بازگل نے اپنی استاد سے اُن سے یہ کہلوایا کہ ہرنام گھ اُسے اکثر تارتا پٹیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہرنام سنگھ کو اُس کے چال چلن پر شبہ تھا۔ وہ یہ نہ بتا سکے کہ اُس کے مراسم کس کے ساتھ تھے۔ مقتولہ کے متعلق انہوں نے یہ خاص بات بتائی کہ وہ مسلمان گھرانوں میں زیادہ جاتی تھی اور گھ میں مسلمانوں کی طرح رہنے سمنے کے طریقے رائج کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُس کی دو سہیلیاں تھیں۔ دونوں مسلمان تھیں۔

مقتولہ کی گندگی کے متعلق انہوں نے بتایا کہ پانچ روز گزرے، وہ رات کو خاوند کے ساتھ کوٹھے پر سوئی تھی۔ صبح معلوم ہوا کہ غائب ہے۔ ٹرنک دیکھے تو پتہ چلا کہ تمام زلیو رات اور جو رقم اُس کے ہاتھ لگی ہے گئی ہے۔ اُس کے خاوند ہرنام سنگھ نے اپنے والدین اور دونوں بھائیوں کو

جس کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے وہی میرا خاوند ہے۔ اس بات پر ہر نام سنگھ نے اُسے مارا پٹیا بھی تھا۔ اُس نے (مقتولہ نے) کہا تھا کہ میرے ساتھ جانوروں والا سوکڑ کر کے تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی یا گھر سے بھاگ جاؤں گی۔

ان بھائیوں نے یہ بھی بتایا کہ ہر نام سنگھ اپنی بیوی کی تلاش میں مارا پھرتا رہتا تھا۔ اُن سے یہ بھی کہوا لیا گیا کہ ہر نام سنگھ کی توجہ باہر کسی عورت کی طرف تھی لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ہر نام سنگھ کی بیوی اس کے ساتھ کئی بار لڑی تھی۔ چونکہ وہ دلیر اور منڈر لڑکی تھی اس لیے وہ تین بار کلما لڑی اٹھا کہ ہر نام سنگھ پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اگر گھر میں ہر نام سنگھ اکیلا ہوتا تو بیوی اُسے قتل کر دیتی۔

خان باز گل نے سوچا کہ مقتولہ کو گھر سے غائب ہوئے پانچ دن گزر گئے ہیں۔ بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا کہ اُسے قتل ہوئے چار روز گزر گئے ہیں۔ اگر اُس کے غائب ہونے والے دن ہی ہر نام سنگھ نے اُسے قتل کر دیا تھا تو پھر اُس کے والدین اور بھائیوں کے بیانات کے مطابق وہ اس کی تلاش میں کیوں مارا مارا پھرتا رہا؟ شاید اُس نے اُسی روز اُسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا ہوگا اور اب اُس آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوگا جس کے ساتھ مقتولہ گئی تھی۔ وہ آدمی ہر نام سنگھ کے ہاتھ سے بچ کے نکل گیا ہوگا۔

ہر نام سنگھ نے خان باز گل کو یہ بھی کہا تھا کہ اُسے اُس کی بیوی مل گئی تو وہ اُسے قتل کر کے اُس کی لاش تھانے میں غودھی لے آئے گا۔

ان بیانات کی روشنی میں تو یہ نظر آتا تھا کہ قاتل ہر نام سنگھ نہیں۔ خان باز گل کے دماغ میں ایک اور بات آئی۔ ہر نام سنگھ کے ماں باپ کے بیان سے پتہ چلا تھا کہ مقتولہ زیورات اور رقم لے گئی تھی۔ یہ ایشیا مہی اس کے قتل کا باعث ہو سکتی تھیں۔ راستے میں کوئی رہزن مل گیا ہوگا۔ مقتولہ اُسی اپنے آشنا تک نہیں پہنچی ہوگی اور رہزموں کے ہاتھوں لٹ گئی اور شاید مزاحمت کے باعث قتل ہو گئی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جس کے ساتھ بھاگی تھی اُسی نے اُسے دھوکہ دیا اور اُسے زیورات اور رقم کے لالچ میں قتل کر کے اس کی لاش دبا گیا۔ مگر اُس نے ایک ٹانگ، ایک بازو اور سر کا ٹکڑا کہاں غائب کیا اور کیوں کیا؟ لاش کی یہ حالت انتقام کے شدید جذبے کے تحت کی جاتی ہے۔ قاتل اس قدر مشتعل ہوتا ہے اور اُس کے دل میں مقتول کی اتنی زیادہ نفرت ہوتی ہے کہ وہ لاش کا قیام بنا دیتا ہے۔ اگر مقتولہ کو اس کے دوست نے قتل کیا ہوتا تو لاش کی یہ حالت نہ کرتا۔ اس کا گلا گھونٹ دیتا یا سر پر کلما لڑی کا ایک پی دار کانی تھا۔ لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے اشتعال، انتقام اور حقارت کی انتہائی شدت کی کیفیت میں قتل کیا گیا ہے۔ لہذا قاتل خاوند ہو سکتا تھا۔

خان باز گل اس جہنی کمر سے میں گیا جہاں ہر نام سنگھ بالوں سے بندھا ہوا تھا۔ اُسے لٹکایا نہیں گیا تھا۔ اُسے پیٹھ کے بل لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے بال دو حصوں میں دو رستیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کانٹیل ڈراڈور بیٹھا دونوں رستیوں کے سر سے پکڑے ہوئے زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

ہر نام سنگھ در دستے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کرتا تھا مگر ایک کانٹیل اس کے دونوں ہاتھوں پر ایک ایک پاؤں رکھ کر کھڑا تھا اور بار بار کہتا تھا — ”ہر نامے ایک ذمے۔ ہر نامے ایک ذمے۔“ اور ہر نامہ انہیں ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔

خان باز گل نے جب اُسے دیکھا، کم و بیش چار گھنٹے گزر گئے تھے۔ ہر نام سنگھ کا اتنا پسینہ بہ چکا تھا کہ فرش پر پانی کی طرح ادھر ادھر جا رہا تھا، مگر وہ سخت جان اتنا تھا کہ مسلسل انکار کیے جا رہا تھا۔ خان باز گل نے اسے اس سے بھی زیادہ ظالم اذیت میں ڈال دیا۔

مجھے اس پٹھان تھا نیرا کی یہ بات ساری عمر نہیں بھولے گی۔ اس نے مجھے یہ واردات سناتے ہوئے کہا تھا — ”میں پٹھان ہوں۔ اپنی تاریخ کو میں نہیں بھول سکتا۔ مجھے سکھوں اور پٹھانوں کی لڑائیاں بچپن میں سنائی گئی تھیں۔ ہندوستان کے مجاہدین مرحوم میں اگر سکھوں کے خلاف لڑے تھے۔ میں یہ نہیں بھول سکتا کہ سکھ اور انگریز ہمارے دشمن ہیں۔ میں اپنے بچوں کو وہی تاریخ سنایا کرتا ہوں جو مجھے باپ نے سنائی تھی۔ باپ کو یہ تاریخ میرے دادا نے سنائی تھی۔ میرا دادا سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑا تھا۔ آج میرا یہ حال ہے کہ سکھوں کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ اس سکھ کو اپنے کنبے میں لے کر میں جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ میرے دل میں ذرا سا بھی رحم نہیں تھا۔ مسلمانوں میں یہی خرابی ہے کہ وہ اپنے دشمن کو بھول کر اُسے اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں“

یہ تو خان باز گل کا قومی جذبہ تھا جس کی میں نے اُس کے منہ پر بھی تعریف کی لیکن جہاں تک تھا نیرا کی اور تفتیش کا تعلق تھا وہ بڑی ہی غلط اور کمزور بنیاد پر کام کر رہا تھا۔ وہ مجھے واردات اور تفتیش کی روئیدار بنا رہا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ اس نے ایسی لاش کی شناخت کتنی غلط کرائی تھی جس کا چہرہ اور سر تھا ہی نہیں۔ مشتبہ ہر نام سنگھ کی ساس اور سسر نے صرف عداوت کی بنا پر کہہ دیا تھا کہ یہ اُن کی بیٹی کی لاش ہے اور اسے ہر نام سنگھ نے قتل کیا ہے۔ خان باز گل کیس ہر نام سنگھ پر یہی مکمل کرنے اور اُسے سزا دلانے کے لیے اُس کے ماں باپ سے استاد ہی سے اپنے مطلب کی باتیں نکلاتا رہا۔ اُس نے تھا نیرا کی کا یہ مظاہرہ کیا کہ ہر نام سنگھ کو تھوڑا ڈگری (تشتہ دم) میں ڈال دیا۔ اس نے سارا دن اُس پر تشدد کیا۔ رات کو بھی اسے تشدد اور طرح طرح کی اذیتوں کا تختہ مشق بنا کر رکھا اور اُسے کہتا رہا کہ وہ اقبال جرم کر لے۔

ہر نام سنگھ نے اس کی بات نہ مانی۔ اُس کی حالت یہ ہو گئی کہ اُس پر نشی طاری ہونے لگی۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے دن کے پچھلے پہر ہر نام سنگھ ایسا بے ہوش ہوا کہ منہ پر پانی پھینکنے اور منہ میں پانی ڈالنے کے باوجود ہوش میں نہ آیا۔ موسم سخت گرم تھا۔ اُسے ہوش میں لانے کی کوششیں ہو رہی تھیں کہ امرتسر سے اطلاع آگئی کہ کل پولیس کپتان جواگریز تھا دُور سے پر آ رہا ہے۔ یہ انگریز دراصل شکار کھیلنے کہیں جا رہا تھا۔ اُس نے راستے میں پڑنے والے تھانوں کو اطلاع دے دی کہ وہ مختصر سے

دور سے پر آ رہا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی خان باز گل پریشان ہو گیا۔ اُس کے پاس اسٹینٹ سب انسپکٹر نہیں تھا۔ کوئی ہوتا تو اسے مشورہ دیتا کہ غصے اور انتقام کے تحت تفتیش نہیں کی جاتی اور ابتدائی کارروائی گہری سوچ کے بعد کی جاتی ہے۔ اس کا ہیڈ کانسٹیبل عطل والا آدمی تھا۔ اتفاق سے وہ مسلمان تھا۔ اس نے اُسے بتایا کہ ملزم کل تک ہوش میں نہ آیا تو پولیس کپتان ہم سب کو معطل کر دے گا لاش کی شناخت بالکل غلط ہوئی ہے اور تفتیش کی بنیاد نہ صرف کمزور ہے بلکہ طریقہ کار کے منافی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اسے کہا کہ یہ واردات چھپائی بھی نہیں جا سکتی۔ انگریز افسر تفتیش میں تشدد اور اذیت رسانی کے خلاف تو نہیں تھے بعض کیسوں میں اسے ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے لیے ٹھوس وجہ ہونی چاہیے جو خان باز گل کے پاس نہیں تھی۔

## ایک ڈرامہ، ایک معجزہ

اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ہر نام سنگھ کے منہ میں دوڑ ڈالا اور کئی جتن کر کے اُسے ہوش میں لائے۔ خان باز گل نے اسے کہا کہ وہ گھر چلا جائے اور قاتل کو تلاش کرنے میں پولیس کی مدد کرے۔ اُسے تسلی دی گئی کہ اس کے خلاف جو شک تھا وہ رفع ہو گیا ہے۔ ہر نام سنگھ نے بڑی

ہی نحیف آواز میں کہا کہ اُسے سو فیصد یقین ہے کہ یہ اُس کی بیوی کی لاش نہیں ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ قاتل کو زندہ نہیں لائے گا، بلکہ اُس کی لاش لائے گا اور اس کے ساتھ اُس کی بیوی کی بھی لاش ہوگی۔

اُس نے یہ باتیں کہ تو دیکھیں اس کی آواز میں حجان نہیں تھی اور وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ خان باز گل نے اُسے خوب کھلایا پلایا۔ اسے شراب منگوا کر پلائی اور اسے گھر بھیج دیا۔

دوسرے دن پولیس کپتان آ گیا۔ اُس نے تھانے کا معائنہ کیا۔ ریکارڈ دیکھا اور اُس کے سامنے یہ واردات آگئی۔ خان باز گل نے پولیس کپتان کو بتایا کہ ابھی تک کسی پرنسک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ لاش بغیر سر کے تھی اس لیے شناخت ممکن نہیں۔ اس نے وہ کاغذات چھپا لیے تھے جن میں ہر نام سنگھ کے سسرال اور والدین کے بیانات قلمبند کیے گئے تھے۔ اُس نے پولیس کپتان کو بتایا کہ سر اور جسم کے دیگر حصوں کی تلاش جاری ہے۔

پولیس کپتان نے اسے کچھ ہدایات دیں اور مشورے بھی دیئے۔ اب جبکہ یہ واردات پولیس کپتان کی نظر میں آگئی تھی اسے وہ گول نہیں کر سکتا تھا۔ عموماً ایسے کیس ہیں جن میں مقتول کے وارثوں کا ہی سراغ نہ ملے اور کہیں سے کسی کی گمشدگی کی بھی رپورٹ نہ آئے تھانیدار کوئی سراغ خانی نہیں کرتے۔ کیس فائلوں میں دفن ہو جاتا ہے، اور اگر تھانیدار دیر ہو تو فائلوں میں بھی اس کا نام و نشان نہیں رہتے دیتا۔ خان باز گل کے لیے یہ راستہ بند ہو گیا تھا۔

اُس نے ہر نام سنگھ کو گھر بھیج دیا اور دو مہر اُس کے پیچھے لگا دیئے۔ یہ دونوں اس کے گاؤں کے ہی آدمی تھے۔ اُن کے لیے ہدایت یہ تھی کہ ہر نام سنگھ کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہیں اور رپورٹ دیتے رہیں، لیکن ہر نام سنگھ کی جسمانی حالت اتنی بُری ہو چکی تھی کہ وہ بین چار دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ اُسے بڑی ہی ظالمانہ اذیتیں دی گئی تھیں جو مہمک بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ تو گھر میں پڑا تھا اور اُس کی بیوی کا باپ اور بھائی صبح شام تھانے میں آتے اور خان بازگل سے پوچھتے کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے اور ہر نام سنگھ کو کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ لوگ دیہاتی اور اُن پڑھتے تھے۔ وہ مطالبہ یا احتجاج نہیں کرتے تھے۔ ان کا انداز درخواست اور التجا کا ہوتا تھا۔ خان بازگل کے پاس ٹال ٹول کے کئی ذریعے تھے جو اس نے استعمال کیے۔ ابھی وہ انہیں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ مقتولہ اُن کی بیٹی نہیں تھی۔ دراصل اس کا اپنا یقین قائم نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں (ہر نام سنگھ کے سسرال) نے مقتولہ کی لاش اپنے دستور کے مطابق جلادی تھی۔ اسے وہ اپنی ہی بیٹی سمجھ رہے تھے۔

کیس میں ایک ڈرامائی واقعہ ہو گیا۔ خان بازگل کسی کیس کی گواہی کے لیے امرتسر گیا۔ اس کے ساتھ اپنا ایک مخبر تھا جو اس کیس میں جھوٹا گواہ تھا۔ پولیس کو یہ ڈھنگ بھی کھیلنے پڑتے ہیں کہ شہادت میں غلطی ہو جائے یا کوئی گمراہی کمزور ہو تو جھوٹے گواہوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ وہ متعلقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا تو وہاں ایک جوان لڑکی مجسٹریٹ کے پاس اپنا یہ بیان قلمبند کرا رہی تھی کہ وہ بالآخر اور غیر شادی شدہ ہے اور وہ اپنی مرضی

سے اس آدمی کے ساتھ گھر سے نکلے ہے۔ اُس نے سفید بُرقع لے رکھا تھا اور اُس کا منہ نکلا تھا۔

خان بازگل کے لیے یہ کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ لڑکیاں اغوا بھی ہوتی تھیں اپنی مرضی سے گھروں سے بھاگ بھی جاتی تھیں۔ مجسٹریٹوں کے پاس بیان قلمبند ہوتے رہتے تھے۔ پھر یہ واقعات قتل اور خودکشی کا باعث بھی بنتے تھے۔ پولیس کے لیے یہ کوئی نرالی بات نہیں تھی مگر خان بازگل کے ساتھ جو مخبر تھا اُس نے اُسے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔

”خان صاحب!“ اُس نے سخت حیرت کے لہجے میں کہا۔  
 ”اللہ جھوٹ نہ بلوائے، یہ تو ہر نام سنگھ کی بیوی ہے۔“  
 ”تمہارے دماغ کو گرمی لگ گئی ہے۔“ خان بازگل نے مہر سے کہا۔ ”یہ کوئی مسلمان لڑکی ہے۔ ہر نام سنگھ کی بیوی قتل ہو کر چتا میں جل بھی چکی ہے۔“

مخبر ہر نام سنگھ کے گاؤں کا تھا۔ ہر گھر کے بچے بچے کو پہچانتا تھا۔ خان بازگل کے لیے تمام چہرے اجنبی تھے۔ مخبر نے ذرا آگے ہنر لڑکی کو غور سے دیکھا۔ لڑکی نے اسے دیکھا تو بُرقع کو ذرا سا سر کا کر آدھا چہرہ چھپا لیا۔ مخبر نے خان بازگل سے کہا کہ دو انسانوں کی شکلیں ایک جیسی بھی ہو سکتی ہیں مگر ایسی نہیں کہ ناک نقتے میں بال برابر بھی فرق نہ ہو۔

لڑکی کا بیان قلمبند ہو گیا۔ عدالتی کارروائی مکمل ہو گئی تو لڑکی نے چہرہ بُرقعے میں چھپا لیا اور ایک آدمی کے ساتھ عدالت سے نکل گئی۔ یہ آدمی

دجیہہ جو ان تھا۔ قدت بھی اچھا شکل و صورت بھی اچھی۔

خان باز گل نے باہر جاکر اس آدمی کو بازو سے پکڑا اور انگ لے جاکر پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں سے اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا۔ ”یہ لڑکی شادی شدہ ہے اور سکھ ہے۔“

اس آدمی نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔ ”میں مسلمان ہوں اور امرتسر پولیس میں کانسٹیبل ہوں۔ آپ بھی مسلمان ہیں۔ آپ نے لڑکی کو پہچان لیا ہے اس لیے میں آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ یہ لڑکی واقعی سکھ ہے، اور شادی شدہ بھی ہے۔“

کانسٹیبل وردی میں نہیں تھا۔ اُس نے لڑکی کے خاندان کا نام بتایا اور اس کے گاؤں کا نام بھی بتایا۔ مخبر کی شناخت صحیح نکلی۔ وہ ہرنام سنگھ کی بیوی تھی۔

”اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو میری مدد کریں“ کانسٹیبل نے کہا۔ ”یہ لڑکی مسلمان ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ نکاح پڑھا لیا ہے۔ دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس سے عدالت میں بیان دلو اور وہ یہ مسلمان ہے، غیر شادی شدہ اور بالغ ہے اور اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔ بیان ہو چکا ہے۔ عدالت ہمارے حق میں فیصلہ دے چکی ہے۔

اب اگر آپ گڑ بڑ کریں گے تو میں بھی اور لڑکی بھی جھوٹا بیان دینے کے جرم میں سزا پائیں گے اور کسی کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کا جرم الگ ہے۔“ خان باز گل چکر لگایا۔ پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ مقتولہ اگر ہرنام سنگھ کی

بیوی نہیں تھی تو اور کون تھی؟ ہرنام سنگھ کو تو خان باز گل نے اس بنا پر شکینے میں لے لیا تھا کہ مخبر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کی بیوی لاپتہ ہے اور ہرنام سنگھ کو وہ جہاں بھی نظر آئی اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ فرض کر لیا گیا کہ اسے بیوی مل گئی تھی جسے اس نے قتل کر دیا۔ اب پتہ چلا کہ وہ قتل نہیں ہوئی۔ پھر قتل ہونے والی کون تھی؟ اور اُس کے دارتوں نے ابھی تک اُس کی گمشدگی یا قتل کی رپورٹ کیوں نہیں دی تھی؟ یہی ہو سکتا تھا کہ مقتولہ کو ہمیں دور سے لاکر یہاں قتل کیا گیا ہے۔

یہ تو بعد کا مسئلہ تھا۔ فوری مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ خان باز گل ہرنام سنگھ کی بیوی اور کانسٹیبل کو گرفتار کرے یا اپنے مذہب کا احترام کرتے ہوئے انہیں جانے دے۔ کانسٹیبل نے جس صاف گوئی اور دلیری سے اور جذباتی انداز سے حقیقت بتادی تھی، اس سے خان باز گل بہت متاثر ہوا۔ کانسٹیبل گجرات کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ خان باز گل نے اُسے کہا کہ اُسے اس لڑکی پر بھروسہ ہے تو اسے فوراً گجرات اپنے گھر چھوڑ آئے، اور اگر اسے امرتسر میں رکھنا ہے تو اسے پوری طرح چھپائے رکھے لیکن بہترین اور محفوظ صورت یہ ہے کہ امرتسر سے تبدیلی کرا کے یہاں سے دُور چلا جائے۔

خان باز گل نے اپنے مخبر کو جو عموماً قسمی سے مسلمان تھا سختی سے کہا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے۔ اگر اُس نے کسی کو بتا دیا تو اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ غریب سے مخبر میں اتنی جرأت کہاں کہ اپنے علاقے کے

مقتانیدار کے حکم کی خلاف ورزی کرتا۔

یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ یہ لڑکی اس کانسیٹیل کے پاس کس طرح پہنچی۔ یہ ڈرامہ سنانے سے پہلے میں اپنی طرف سے ایک دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ اُس زمانے میں مردوں کے قدِ حُبت دیکھنے کے قابل ہوتے تھے اور صحت ایسی کہ چہروں پر جلالی سی رونق ہوتی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں کی تو شان ہی کچھ اور تھی۔ چھ چھ فٹ تو قد ہونے سے جسم گٹھے ہوئے اور ہرے بھرے ہوئے طبیعت، مزاج اور کردار بھی مردوں جیسا ہوتا تھا۔ اب ایسے جوان کہاں نظر آتے ہیں۔ شہر کے نوجوان کو تو جیسے دیکھ اور چیز نیاں کھا گئی ہیں۔ فوج میں بھی ہمارے زمانے والے جوان نہیں ملتے۔ سڑکوں پر گشت کرنے والے پولیس کے کانسیٹیل کی وردی اور اُن کی جسمانی حالت دیکھ کر پولیس کے محکمے پر ترس آتا ہے۔

## لڑکی اور کانسیٹیل کی کہانی

خان باز گل نے مجھے بتایا کہ یہ کانسیٹیل بڑا خوبصورت جوان تھا آپ کو معلوم ہوگا کہ ام ترس میں سکھوں کا دربار ہے جو سکھوں کی سب سے زیادہ مقدس عبادت گاہ ہے بہت خوبصورت عمارت ہے۔ وہاں زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ وہاں شروع سے ہی پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ کانسیٹیل گشت بھی کرتے ہیں۔ اس مسلمان کانسیٹیل کی بھی وہاں ٹیوٹ

لگا کرتی تھی۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں اس لیے میں اسے کانسیٹیل ہی کہوں گا۔ قتل کی واردات سے چار پانچ مہینے پہلے یہ کانسیٹیل دربار صاحب کے باہر ڈیوٹی پر تھا۔ دو تین سگھ عورتیں اس کے پاس آئیں اور اسے بتایا کہ ان میں سے ایک کا بھتیجا جس کی عمر سات آٹھ سال تھی کہیں کھو گیا ہے۔ یہ ہر نام سنگھ کی بیوی کا بھتیجا تھا۔ وہ بہت گھرائی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ گاؤں کی عورتیں تھیں۔ یہ لڑکی اچھی شکل و صورت کی تھی اور یہ ہر نام سنگھ کی بیوی تھی۔ کانسیٹیل نے اس کے بھتیجے کی تلاش شروع کر دی۔ لڑکی اس کے ساتھ رہی۔ دوسری عورتیں دربار صاحب کے اندر چلی گئیں۔ لڑکی نے کانسیٹیل کو بتایا کہ اُس نے دو کانسیٹیلوں سے کہا تھا کہ اس کے بھتیجے کو ڈھونڈیں لیکن انہوں نے توجہ نہیں دی۔

بچہ مل گیا۔ وہ بھیڑ میں کہیں ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ ایک دکاندار نے اُسے روٹا دیکھ کر اپنے پاس بٹھالیا تھا۔ ہر نام سنگھ کی یہ نوجوان بیوی کانسیٹیل کی مشکور تھی اور اس کی ذات اور کردار سے متاثر بھی ہوئی۔ ولی لگاؤ وہیں پیدا ہو گیا۔ لڑکی نے اسے کہا کہ اسے مسلمان اچھے گنتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی پندرہ بیس روز بعد ام ترس جانے لگی اور کانسیٹیل کے ساتھ اس کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

خان باز گل نے کانسیٹیل کی سنائی ہوئی باتیں مجھے سنائیں تو میں نے یہ رائے قائم کی کہ ہر نام سنگھ کی بیوی اس کانسیٹیل کی ظاہری شکل و صورت سے اور قدِ حُبت سے بھی ضرور متاثر ہوئی ہوگی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اُسے

سکھوں سے نفرت تھی۔ اس کی ساس ہنسرا اور ہر نام سنگھ کے بھائی بنا چکے تھے کہ اس کی سہیلیاں مسلمان تھیں، اور وہ مسلمان گھرانوں میں آتی جاتی تھی۔ کانٹیل کو اس لڑکی نے بتایا کہ اس کے خاوند کے بھائی بھی اسے اپنی بیوی سمجھتے ہیں۔ اُسے سکھوں کے اس رواج سے نفرت تھی۔ وہ صاف ستھری رہنے والی لڑکی تھی۔ سکھوں کی جسمانی غلامت اور سر سے پاؤں تک بالوں ہی بالوں کے علاوہ اُسے ان کی عادتوں کی گندگی اور زبان کی غلامت یعنی گالی گلوچ سے کراہیت آتی تھی۔

لڑکی نے کانٹیل کو ایک وجہ یہ بھی بتائی کہ اُس کے خاوند نے کسی دوسرے گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ مراسم قائم کر رکھے تھے۔ اس لڑکی کے رشتہ دار اس کے گاؤں میں بھی تھے۔ وہ کبھی کبھی اُن کے گاؤں آیا کرتی تھی۔ ہر نام سنگھ اُسے اپنے گاؤں میں ملنے کے علاوہ کبھی کبھی اُس کے گاؤں چلا جاتا یا اُسے باہر کہیں بلا لیتا تھا۔ ہر نام سنگھ کی بیوی نے کسی عورت کی مدد سے ان دونوں کے تعلقات اور ملاقاتوں کی سرانجامی کر لی تھی۔ اس نے جب ہر نام سنگھ کو اس لڑکی سے ملنے سے منع کیا تو ہر نام سنگھ نے اس کی پٹائی کر دی۔ پھر آئے دن ان کا لڑائی جھگڑا ہونے لگا۔

لڑکی کو امرتسر میں یہ کانٹیل مل گیا۔ یہ اتفاقہ ملاقات تھی۔ کانٹیل ویسا ہی صاف ستھرا مسلمان تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ کچھ تو وہ پہلے ہی دلیر اور نڈر تھی، گھر لیو حالات نے اسے اور زیادہ دلیر بنا دیا۔ کانٹیل سے ملاقات ہوئی تو اتنی زیادہ نڈر ہو گئی کہ اتنی دُور گاؤں سے دربار صاحب کی زیارت

کے بہانے امرتسر جانے لگی۔

کانٹیل اس کی اُمیدوں کے مطابق نکلا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ گھر سے بھاگ کر اُس کے پاس آنا چاہتی ہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لے تو وہ مسلمان ہو جائے گی۔ ان کی محبت پاک صاف تھی۔ اس سے بھی وہ بہت متاثر تھی۔ کانٹیل نے اسے کہا کہ وہ آجائے۔ ایک روز لڑکی زیورات اور کچھ رقم لے کر آگئی۔ کانٹیل نے اپنے ایک دوست کی مدد سے رہائش کا انتظام کر لیا۔ لڑکی کو ایک مولوی کے ہاتھ پر مسلمان کر لیا گیا اور اسی مولوی نے نکاح پڑھا دیا۔ اس سلسلے میں جھوٹا یہ بولا گیا کہ لڑکی غیر شادی شدہ ہے۔ کانٹیل کو اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں لڑکی کو لے جا کر اس کا بیان قلمبند کر لیا جائے۔ چنانچہ قانون کا یہ تحفظ حاصل کر لیا گیا اور وہاں ان کی ملاقات خان باز گل سے ہو گئی۔

جہاں تک خان باز گل کا تعلق تھا ہر نام سنگھ کی بیوی کی کہانی میں پر ختم ہو گئی تھی۔ اُس نے کانٹیل سے وعدہ کیا کہ وہ اُس کی مدد کرے گا۔ اُس نے اسلام کے رشتے کا حق ادا کر دیا۔ اُسے اس پر بہت خوشی ہوئی کہ لڑکی نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ خان باز گل امرتسر میں اپنی گواہی سے فارغ ہو کر اپنے محلے میں چلا گیا جو دیہات میں تھا۔ اسے اب دو محلے پریشان کر رہے تھے۔ ایک یہ کلاش کس عورت کی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ ہر نام سنگھ اور اُس کے والدین اور اُس کے سسرال کو کس طرح بتائے کہ بولاش برآمد ہوئی تھی وہ ہر نام سنگھ کی بیوی! نہایت تھی۔ یہ تو بتایا ہی نہیں



جا سکتا تھا کہ اُس کی بیوی زندہ ہے اور ام ترس میں ہے۔

وہ آخر تھانیدار تھا۔ اُس نے ہر نام سنگھ کے ماں باپ اور اُس کی بیوی کے ماں باپ کو تھانے بلایا۔

باز گل پر ہی نہ آپڑے اور وہ اعانتِ جرم کا مجرم بن جائے۔ دوسرے یہ کہ پولیس کپتان سے وہ گھبراہٹ میں کہہ چکا تھا کہ لاوارث لاش ملی ہے جو قتل کی واردات ہے۔ تیسرا خطروہ یہ کہ کسی بھی وقت اس کے پاس لاش کا سرہ بازو اور ٹانگہ آسکتی تھی جو معلوم نہیں کہاں دفن تھیں۔ مقتولہ کے وارث رپورٹ لے کر آسکتے تھے۔

وہ جو نہی تھانے میں داخل ہوئے خان باز گل نے گرج کر کہا۔ ”ان سب کو جو حالات میں بند کر دو۔ انہوں نے جھوٹ بول کر پولیس کو گمراہ کیا ہے۔“ حالانکہ اس نے خود ہی اسنادی سے ان سے کہلوا یا تھا کہ یہ ہر نام سنگھ کی بیوی کی لاش ہے۔

## پٹھان اور سکھ کی ملاقات

خان باز گل نے ادھر سے تو جان چھڑالی مگر لاوارث مقتولہ اُس کے ذہن پر سوار تھی۔ اس کے ساتھ ہر نام سنگھ بھی اس کے دماغ پر سوار ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ ہر نام سنگھ نے خان باز گل کو نمبر دار کی زبانی پیغام بھیجا کہ تم نے میرے مسس رال کے کہنے پر مجھے تھانے میں لے بس کر کے میرا جسم توڑا ہے۔ اب تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ لاش میری بیوی کی نہیں تھی۔ اب میں تم سے بدلہ لوں گا۔ ذرا سنبھل کر رہنا۔ میرے ہاتھ پر دو اگروں نے دو کی جگہ تین قتل کبھ دیئے ہیں۔ ایک اپنی بیوی، دوسرا وہ آدمی جس کے ساتھ وہ گئی ہے اور تیسرے تم۔ اگر مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کرو گے تو سارا پنجاب مٹے گا کہ ایک اور ڈاکو میدان میں آ گیا ہے جس کا نام ہر ناما ڈاکو ہے۔ لوگ بھگتے اور ماہن سنگھ کو بھول جائیں گے۔ بھگتا اور ماہن سنگھ اس علاقے کے بہت بڑے ڈاکو اور رہن تھے۔

خان باز گل نے ہر نام سنگھ کو تھانے بلایا۔ ہر نام سنگھ نے پیغام کا جواب

وہ چاروں خوف سے کانپنے لگے۔ سب نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ خان باز گل ان پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتا تھا۔ اس نے ان کی حالت ایسی تپلی کی کہ سب نے بیان دیا کہ انہوں نے شک میں شناخت کی تھی۔ ہر نام سنگھ کے مسس سے اس نے یہ بھی کہلوا لیا کہ اُس نے ہر نام سنگھ کو سزا دلانے کی خاطر کہا تھا کہ یہ اُس کی بیوی کی لاش ہے اور اُسے ہر نام سنگھ نے قتل کیا ہو گا۔ خان باز گل نے نمبر دار کو اور دو تین معزز افراد کو بلا کر ان کے سامنے مسس وغیرہ کے بیان لیے یہ سراسر دھاندلی اور سکھ شاہی تھی جو یہ پٹھان تھانیدار کر رہا تھا۔ وہ اپنی ابتدائی غلطی پر پر وہ ڈالنے کے لیے غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک صورت یہ بھی آئی تھی کہ اس شناخت کو چلنے دے اور مقتولہ کو ہر نام سنگھ کی بیوی رہنے دے اور ہر نام سنگھ کو ہی گرفتار کر کے مقدمہ قائم کر دے، مگر اسے دو تین خطرے نظر آ رہے تھے۔ ایک یہ کہ ام ترس والا کاشیل ہر نام سنگھ کی بیوی کو ام ترس سے خائب کرنے سے پہلے ہی پکڑا گیا تو کیش خان

دیا کہ نہ میں تمہارے تھانے میں آتا ہوں نہ تم میرے گاؤں میں آؤ۔ دونوں جگہوں کے درمیان ملاقات ہوگی۔ سپٹھان کے حلالی بچے بہو تو اپنے ساتھ پولیس کی گارڈ نہ لانا۔ خان بازگل نے سپٹھان کا حلالی بچہ بن کر دکھا دیا۔ وہ ہرنام سنگھ سے ملنے آکیلا گیا۔ ہرنام سنگھ کلھاڑی لے کر آیا تھا۔ خان بازگل بغیر وردی گیا۔ اُس کے پاس رولواور بھی نہیں تھا، کوئی اور ہتھیار بھی نہ تھا۔ اس نے ہرنام سنگھ کو دوستانہ طریقے سے سمجھایا کہ تمہا نیداری کے فرائض میں اُسے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خان بازگل نے اُسے بتایا کہ وہ قتل کی دھمکی سے ڈرنے والا انسان نہیں۔ اس طرح کی کئی ایک باتیں کر کے اُس نے اس سکھ کا دماغ کچھ درست کیا اور اُسے کہا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں اور تمہارے پاس کلھاڑی ہے۔ ہمت سے تو پہلا دارم کر دو پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم ہرنام سنگھ سے ہرنام ڈاکو بن سکتے ہو یا نہیں۔ خان بازگل نے اسے یہ بھی کہہ دیا۔ ”جس مرد کو عورت لات مار کر چلی جائے اُسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ کلھاڑی اٹھا کر اور سر اُدسچا کر کے چلے پھرے۔ تم جاؤ ہرنامے اگھر ٹیٹو۔ تم مرد نہیں ہو۔“

خان بازگل نے مجھے ایک عجیب بات سنائی۔ اُس نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ ہرنام سنگھ مشتعل ہو جائے گا مگر اُس نے سر جھکا لیا اور اُس کے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ خان بازگل کو بازو سے پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے گیا اور اسے وہاں بٹھا کر کہنے لگا۔ ”خان صاحب! میں اپنی بیوی کو اس لیے نہیں ڈھونڈ رہا کہ وہ میری بیوی ہے اور بیوی عزت ہوتی ہے۔ میں اُسے اس لیے ڈھونڈ رہا ہوں کہ اُس کے سینے میں مردوں والا دل ہے جو مجھے اُس

رات معلوم ہوا جس رات وہ گھر سے بھاگی تھی۔ یہ تو میں لوگوں کے سامنے اپنی ناک رکھنے کے لیے کہتا پھر تا ہوں کہ وہ مجھے جہاں نظر آئی وہیں قتل کر دوں گا لیکن وہ مجھے بل گئی تو اپنی پگڑی اتار کر اُس کے قدموں میں رکھ دوں گا میں نے اُس کی قدر نہیں کی۔“ ایسی ہی چند اور جذباتی سی باتیں کر کے اس نے کہا۔

”جس دیہی سے اُس نے قتل کیا ہے کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔“  
خان بازگل نے بدک کر پوچھا۔ ”اُس نے کسے قتل کیا ہے؟“  
ہرنام سنگھ پریشان ہو گیا۔ یہ بات جذبات کی رو میں اُس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اُس نے پردے ڈالنے شروع کر دیئے۔  
خان بازگل نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ تمہا نیداری کے رعب سے نہیں دوستی کے رنگ میں پوچھ رہا ہے۔

”مجھے ایک بار پھر تھانے لے چلو اور میرے جسم کے ٹکڑے کر دو۔“  
ہرنام سنگھ نے کہا۔ ”یہ راز میرے منہ سے نہیں نکال سکو گے۔“ اُس نے یہ راز دہرایا۔

”ہرنامے! خان بازگل نے اسے کہا۔ ”تمہاری بیوی کی تلاش میں مجھے جو قربانی دینی پڑی دوں گا، مجھے یہ بتا دو کہ جس عورت کی لاش ملی ہے وہ کون تھی۔ اُسے تمہاری بیوی نے تو قتل نہیں کیا تھا؟“  
”مجھے کچھ سچی معلوم نہیں۔“ ہرنام سنگھ نے جواب دیا۔ اُس عورت کو تو میں جانتا ہی نہیں جس کی تمہیں لاش ملی تھی۔“

خان بازگل بہت کوشش کے باوجود اُس سے یہ راز نہ لے سکا کہ اُس

# لاش کسی اور لڑکی کی نکلی

کی بیوی نے کسے قتل کیا ہے۔ وہ تھانے میں واپس چلا گیا۔

دوسرے دن ساتھ والے علاقے کا تھانیدار اُس کے پاس آیا اور اسے کہا "میرے تھانے کی ایک عورت لاپتہ ہے وہ غیر شادی شدہ جوان لڑکی تھی۔ گھر سے غائب ہو گئی۔ گھر والے کئی دن اُسے خود ہی ڈھونڈتے رہے آخر انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ انہوں نے جس جس پر شک کا اظہار کیا تھا انہیں میں ٹھونک بجا کر اور چھاپے مار کر دیکھ چکا ہوں۔ لڑکی نہیں ملی۔ دو تین روز گزرے مجھے کسی نے بتایا ہے کہ تمہیں ایک لاش ملی ہے جو کسی عورت کی ہے۔ لاش کے کپڑے اور جسم سے برآمد ہونے والی اشیاء تمہارے پاس ہوں گی۔ اگر تم نے ملزم پکڑ لیے ہیں تو یہ کوئی اور ہوگی۔ اگر نہیں تو مجھے اس کی چیزیں دکھا دو۔ وہ یہی گمشدہ لڑکی نہ ہو۔"

خان باز گل نے اُسے کہا کہ اللہ تمہارا بھلا کرے، کہہ دو کہ یہ گمشدہ لڑکی کی لاش تھی اور یہ تمہارے تھانے کی واردات ہے۔ اُس نے لڑکی کے کپڑوں کے ٹکڑے، سونے اور کایخ کی چوڑیاں، دوپٹے اور جوتی کا ایک پاؤں اُسے دکھایا۔ لاش سے برآمد ہونے والی اشیاء عدالت میں پیش کی جاتی ہیں۔ تھانیدار نے خان باز گل سے کہا کہ وہ اُسے اپنا ایک کانسٹیبل دے دے جسے وہ گمشدہ لڑکی کے گاؤں بھیج کر اُس کے وارثوں کو بلانا چاہتا تھا۔ گاؤں ڈیڑھ دو میل دور تھا۔ خان باز گل نے ٹٹو کا انتظام کر کے اپنا ایک کانسٹیبل بھیج دیا۔ دوسرے تھانیدار نے گاؤں کا اتا پتا دیا تھا۔ خان باز گل نے اُسے بتایا کہ مقتولہ کی شناخت غلط ہو گئی تھی، اس لیے غلط لوگ لاش لے گئے اور جلا ڈالی۔

گمشدہ لڑکی کے لواحقین آگئے۔ اُس کی ماں نے چوڑیاں دیکھیں تو اُس نے پورے یقین سے کہہ دیا کہ یہ اُس کی بیٹی کی چوڑیاں ہیں۔ دوپٹے اور جوتی (چپل) سے تصدیق ہو گئی۔ مقتولہ کے کپڑوں کے دو ٹکڑے دھلائے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر ماں نے سر پیٹ لیا۔ اُس نے کسی شک کی گنجائش ہی نہ رہنے دی۔ مقتولہ کے باپ نے بھی تصدیق کر دی کہ یہ ان کی بیٹی کی چیزیں ہیں۔ دونوں تھانیداروں نے ضروری کاغذی کارروائی کی۔ رپورٹ لکھی۔ اُوپر بھیجی اور فٹنیشن دوسرے تھانیدار نے لی جس میں خان باز گل کی حیثیت گواہ کی رہ گئی۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کیس سے جان چھوٹی۔

دوسرے تھانیدار نے آٹھ دس دنوں میں یہ سراغ لگا لیا کہ مقتولہ کی دوستی ہر نام سنگھ کے ساتھ تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مقتولہ کے رشتہ دار ہر نام سنگھ کے گاؤں میں بھی تھے۔ وہ اس گاؤں میں آیا کرتی تھی اور اسی لڑکی پر ہر نام سنگھ اور اس کی بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑا تھا۔ مقتولہ کے والدین نے تو کہا تھا کہ ان کی بیٹی کا چال چلن اچھا تھا لیکن دیہات میں کوئی بات چُھپی نہیں رہ سکتی۔ بسکھوں میں تو بے حیائی عام تھی۔ کم ہی بُرا مانا جاتا تھا مگر ہر نام سنگھ کی بیوی کے خیالات بسکھوں سے مختلف تھے۔ بعد کے حالات اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مقتولہ نے کبھی ہر نام سنگھ کی بیوی کو طعنے بھی

دیئے تھے کہ اُس کا خاوند اُس کے قبضے میں ہے۔ غالباً انہی طعنوں نے اُسے مُشتعل کیا تھا جس سے وہ ایسے مجرم کی مُرتکب ہوئی جس نے پولیس کو بھی حیران کر دیا، حالانکہ پولیس کے سامنے ایسی وارداتیں بھی آتی ہیں جو عام لوگوں کے لیے قابلِ یقین ہی نہیں ہوتیں۔

دوسرے تھانیدار نے تفتیش محنت اور دیانتداری سے کی تھی۔ اُس نے مجڑوں کا استعمال بھی عقلمندی سے کیا جس کے نتیجے میں وہ ہرنام تک پہنچ گیا مگر سوال یہ تھا کہ لڑکی کو کیا ہرنام لگھنے نے قتل کیا ہے؟ اور ایسے غصے میں قتل کیا ہے کہ لاش پر کلہاڑیوں کے بے سے زیادہ زخم تھے، سر کاٹ کر غائب کر دیا گیا تھا اور ایک بازو اور ٹانگ بھی ساتھ نہیں تھی؛ دوسرے تھانیدار کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ اس نوعیت کا قتل انتہائی غصے اور انتقام کے جذبے کے زیر اثر کیا جاتا ہے۔ اگر مقتول کو ہرنام لگھنے نے قتل کیا ہے تو اس کے باعث دوہرہ ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس لڑکی کے پیچھے بڑا ہوا تھا اور لڑکی نے اسے دھسکار دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ لڑکی نے کسی اور کے ساتھ بھی دوستی کر لی ہوگی، مگر جو شہادتیں ملی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ لڑکی ہرنام لگھنے کے بلانے پر آجاتی تھی۔ اس کیس کی شہادتوں میں ایک اہم شہادت غائب تھی۔ وہ ہرنام لگھنے کی بیوی تھی۔ اس سے کام کی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

ایک روز دوسرے تھانیدار نے خان باز گل کے تھانے میں آکر ہرنام لگھنے کو وہاں بلایا اور اس سے سیدھا سوال پوچھا کہ مقتولہ کے ساتھ اُس کا میل جول تھا یا نہیں۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اُسے کہا گیا کہ اُس پر قتل کا الزام عائد نہیں

کیا جا رہا بلکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ لڑکی کے مراسم اور کس کے ساتھ تھے۔ یہ راز ہرنام لگھنے کو ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ اسے کہا گیا کہ کوئی اور آدمی لڑکی کو بچکانسا چاہتا ہوگا لیکن ناکام ہو کہ اُس نے لڑکی کو قتل کر دیا۔

اس کے جواب میں ہرنام لگھنے نے ایسا روئیہ اختیار کیا جیسے وہ ان تھانیداروں کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ پرانے لوگوں کو معلوم ہے کہ سکھ احمقانہ باتوں اور حرکتوں میں شہرت یافتہ تھے۔ یہی حال ہرنام لگھنے کا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہرنام لگھنے کہتا رہا تھا۔ اُس کے رویے سے شک ہو رہا تھا جیسے اس واردات سے وہ واقف ہے اور چھپا رہا ہے۔

خان باز گل نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے اپنی بیوی کے متعلق کہا تھا کہ جس دیری سے اُس نے قتل کیا ہے، کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے جواب میں ہرنام لگھنے نے ایسی احمقانہ باتیں کیں کہ اس کے خلاف شک پکا ہو گیا۔ مقتولہ کے متعلق گاؤں کے خیر دار نے بتایا تھا کہ بڑی اچھی صورت کی لڑکی تھی لیکن کوئی شریف گھرانہ اس کا رشتہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ منہ چھٹ اور بے حیا تھی۔ سکھوں کے ہاں بے حیائی کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ دونوں تھانیداروں نے محسوس کیا کہ واردات کے ساتھ ہرنام لگھنے کا تعلق ہے۔ انہوں نے اسے دوستانہ طریقے سے سمجھایا۔ پیارا اور محبت کے سارے ڈھنگ آزمائے مگر وہ نہ مانا۔ اس کی بجائے وہ چیلنج کے انداز سے باتیں کرتا تھا۔

اُسے اُسی کمرے میں لے گئے جہاں خان باز گل نے اُسے ایک دن اور

## بھنگ نے بھانڈا اچھوڑ دیا

اس تھانیدار نے ہرنام سنگھ کو خالی پیٹ دیسی شراب پلائی۔ اس کا اثر بہت بڑا ہوا ہوگا۔ اس کے بعد اُسے بھنگ میں ملا کر کچھ پلایا اور اُسے کھانے کے لیے بھی کچھ دیا۔ تھانیدار اس کے پاس بیٹھ گیا اور جب ہرنام سنگھ پر نشہ طاری ہونے لگا تو اُس نے دوستانہ لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی مروانگی کی خوب تعریفیں کیں اور کہا کہ جو لڑکی قتل ہو گئی ہے وہ اُس پر مرتی تھی۔ بہر حال وہ ہرنام سنگھ کے ذہن کو اپنے قبضے میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ تھانیدار کوئی بہت ہی عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ سے کوئی سوال پوچھا ہی نہیں! اپنے شکوک کے مطابق اُس کے ذہن میں باتیں ڈالتا رہا جن میں ایک بات یہ بھی تھی جو اُسے خان باز گل نے بتائی تھی، کہ اس کی بیوی نے جس دلیری سے قتل کیا ہے کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔

ہرنام سنگھ نے جھوم جھوم کر راز فاش کر دیا۔ اُس نے واردات کی جو کہانی سنائی وہ ناقابل یقین لگتی تھی۔ دونوں تھانیداروں نے یہ رائے قائم کی کہ ہرنام سنگھ نشے کے اثر سے اُدٹ پٹانگ باتیں گھڑتا جا رہا ہے۔ اُس نے پہلے تو مقتولہ کے ساتھ اپنی محبت کی داستان مست ہو کر سنائی اور لہجہ کی ملاقاتوں کی تفصیل بھی سنائی۔ اُس کی بیوی کو پتہ چل گیا۔ بیوی نے اُسے روکا تو اس نے بیوی کو مارنا پٹینا شروع کر دیا۔ ہرنام سنگھ نے یہ حرکت بھی کی کہ لڑکی جب اُس

رات رکھا تھا۔ دوسرا تھانیدار تشدد اور اذیت رسانی ڈٹا رہا۔ اس کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اس کے بال نہ باندھے اور اس قسم کی کوئی اذیت نہ دی۔ اسے کمرے میں کھڑا رکھا گیا۔ پانی کا گھونٹ تک نہ دیا گیا۔ پھر اُسے خالی پیٹ اسی علاقے کی کشید کی ہوئی شراب پلائی گئی۔ یہ دیسی شراب بہت ہی تیز ہوتی ہے۔ اسے بیٹھنے نہیں دیا گیا۔ شام کے بعد اسے بھنگ پلائی گئی۔ بھنگ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے نشے میں آدمی ہنسنا شروع کر دے تو گھنٹوں ہنسنا ہی رہتا ہے اور اگر رونے لگے تو مدعا ہی چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی عقل مند آدمی اُس کے ذہن میں اپنے مطلب کی کوئی بات ڈال دے تو اسی کے متعلق بولنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھے خان باز گل نے بتایا تھا کہ بھنگ میں کچھ اور بھی ملا گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کیا چیز تھی۔ میں اس سے واقف بھی نہیں تھا۔ دوسرا تھانیدار اس کا استعمال جانتا تھا۔

سکھوں کے اس علاقے کے متعلق میں یہ بھی بتا دوں کہ وہاں تھانیداروں کو قتل اور غن خرابے کی وارداتوں میں لمبی چوڑی تفتیش اور اذیت رسانی کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی کیونکہ سکھ خاندانی دشمنی کی بنا پر لڑتے اور مرتے تھے۔ ایسے لڑائی جھگڑوں میں قاتلوں کو پکڑنا مشکل نہیں ہوتا تھا بلکہ اکثر قابل اہل قتل لہراتے اور لہکارتے ہوئے سارے گاؤں کا پکڑ لگاتے اور تھانے چلے جاتے تھے۔ پراسرار وارداتیں کبھی کبھار ہوتی تھیں جیسے اس لڑکی کا قتل تھا۔ ایسے قاتلوں سے اقبال جرم کرانے کے لیے تھانیداروں نے اپنے اپنے طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔

کے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں آتی تھی تو ہر نام سنگھ اُسے اپنے گھر بلاتا اور اپنی بیوی سے کہتا تھا کہ دیکھو کتنی خوبصورت لڑکی مجھ پر خدا ہے یہ اصل سکھوں والی حرکت تھی۔ لڑکی بھی سکھ ہی تھی۔ اُس نے ہر نام سنگھ کی بیوی کو طعنے دیئے اور ہر نام سنگھ کی موجودگی میں کہا کہ تم ہر نام سنگھ جیسے جوان کے قابل نہیں ہو۔ اس پر گھر میں لڑائی ہوئی۔ ہر نام سنگھ کی بیوی لڑکی کو مارنے کے لیے دوڑی۔ ہر نام سنگھ نے اُسے گرا لیا اور بہت ہی بُری طرح پٹیا۔ ایک بار یوں بھی ہوا کہ بیوی کلھاڑی اٹھا کر ہر نام سنگھ پر ٹوٹ پڑی۔ ہر نام سنگھ کے بھائیوں نے درمیان میں آکر بھاؤ کرادیا۔

ہر نام سنگھ نے بتایا کہ اُسے بیوی نے کبھی بار کہا تھا کہ جس طرح مسلمان اپنی بیویوں کو رکھتے ہیں اس طرح رہوں گی، ورنہ مجھے طلاق دے دو۔ اگر مجھے آزاد نہیں کرو گے تو میں کسی مسلمان کے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ اس پر بھی ہر نام سنگھ نے اُسے مارا پٹیا۔ اُس نے تمنا دیداروں کو نشے کی حالت میں بیان دیتے ہوئے اپنی بیوی کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں آتی جاتی تھی اور مسلمانوں نے اس کا داغ خراب کر دیا تھا، لیکن وہ بہت دلیر لڑکی تھی۔ اُس نے جب اپنا آپ دکھایا تو میں نے قسم کھائی کہ تمام عمر اس عورت کا غلام رہوں گا۔

یہ واقعہ اُس نے اس طرح سنایا کہ ایک رات وہ چھت پر سویا ہوا تھا۔ اُس کی بیوی کی چار پائی اُس کے ساتھ تھی۔ اس کے دونوں بھائی مکان سے باہر کھلی جگہ چار پائیاں ڈالے سو رہے تھے۔ صحن میں اُس کی ماں اور باپ

سوئے ہوئے تھے۔ ہر نام سنگھ کی ویسے ہی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے ساتھ والی چار پائی خالی دیکھی۔ بیوی غائب تھی۔

ہر نام سنگھ کو پہلا خیال یہ آیا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن اسے یقین نہ آیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ ذرا نیچے اتر گئی ہوگی۔ وہ لیٹ گیا۔ یہ دیرماتی طرز کا کچا مکان تھا۔ تنوڑی دیر بعد ہر نام سنگھ کو مکان کے پھوڑے سے ہلکی سی آواز آئی۔ رات اندھیری تھی۔ اُس نے لیٹے لیٹے اُدھر دیکھا تو منڈیر سے کسی کا سر اُدھر اٹھا پھر کسی کا باقی جسم اُدھر آیا۔ ہر نام سنگھ نے دیکھ لیا کہ یہ کسی عورت کا سایہ سا تھا جو اُس کی بیوی ہی ہر سکتی تھی، مگر اس کی بیوی پھوڑے سے کیوں اُدھر آ رہی تھی؟ اُسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ منڈیر سے چار پائیاں دوڑ نہیں تھیں۔ اس عورت کے ہاتھ میں کلھاڑی تھی۔ وہ کلھاڑی اُدھر کر کے ہر نام سنگھ کی طرف تیزی سے آئی۔

ہر نام سنگھ کی قسمت اچھی تھی کہ جاگ رہا تھا۔ کلھاڑی کا وار اپنے اوپر پڑنے سے اتنی دیر پہلے اچھل کر اٹھا کہ کلھاڑی اُس کے سر پر نہ پڑے۔ ہر نام سنگھ نے پھرتی دکھائی۔ عورت کو اس نے دوسرا وار نہ کرنے دیا۔ بڑی ہی تیزی سے اُس نے کلھاڑی پکڑ لی۔ وہ اُس کی بیوی تھی۔ بیوی نے اس کے ہاتھ سے کلھاڑی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ وہ آخر عورت تھی۔ اُس کا ہت بلہ تندرست جوان کے ساتھ تھا۔ ہر نام سنگھ نے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ اُس کی بیوی کے پاؤں اٹھ گئے۔ ہر نام سنگھ نے اسے نیچے گرا لیا اور اُس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے کلھاڑی کا دستہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیوی کی

شہرگ پر رکھا اور زور سے دبا یا۔ بیوی تڑپ اٹھی۔

”کس یار کے پاس گئی تھی؟“ ہرنام سنگھ نے پوچھا۔ ”تمہیں کس نے میرے قتل کے لیے بھیجا ہے؟“ اُس نے دستے کا دباؤ ڈھیللا کر دیا۔ ”میں جانتی ہوں تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔ ”میں نہ قتل ہونے سے ڈرتی ہوں نہ قتل کرنے سے۔ قتل ہونے سے پہلے تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں کیا کر کے آئی ہوں۔“

بیوی نے اُسے جو قصہ سنایا وہ یوں تھا کہ اُس روز مقتولہ ہرنام سنگھ کے گاؤں آئی ہوئی تھی۔ ہرنام سنگھ کی بیوی نے اس وقت تک معلوم کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو جب وہ اپنے گاؤں میں ہوتی تھی کس کے ہاتھ پیغام بھیجا کرتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان دونوں کی ملاقاتیں دونوں گاؤں کے درمیان ہوا کرتی تھیں۔ لڑکی ہرنام سنگھ کے بلانے پر آجایا کرتی تھی۔ بیوی نے اس عورت کو پیسے دیئے اور کہا کہ اس لڑکی کو ہرنام سنگھ کی طرف سے کہے کہ رات فلاں جگہ آجانا۔ اُس کی چال کامیاب رہی۔ دیہات میں لوگ شام کے فوراً بعد سوجاتے ہیں۔ ہرنام سنگھ سو گیا تو بیوی اٹھی۔ دلبے پاؤں نیچے گئی۔ اُس نے ہرنام سنگھ کی کھانسی اپنی مرضی کی جگہ رکھ لی تھی۔ وہ اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ اُس نے شام سے کچھ دیر پہلے بچھوڑے سیڑھی رکھ دی تھی۔ یہ چار پانچ ڈنڈوں کی معمولی سی سیڑھی تھی جو دیہات میں اکثر مکانوں کے ساتھ لگی نظر آتی ہے۔

بیوی نے ہرنام سنگھ کو بتایا کہ وہ اُس جگہ پہنچی جہاں اُس نے لڑکی کو بلایا تھا تو تھوڑی ہی دیر بعد وہ آگئی۔ لڑکی نے ذرا دھیمی آوازیں دیں۔

”ہرنام۔ ہرنام۔“

وہ جسے آوازیں دے رہی تھی وہ ہرنام کی بیوی تھی۔ اندھیرے میں یہ دونوں سائے ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو ہرنام سنگھ کی بیوی نے کھانسی کا ایک ایسا زبردست وار کیا کہ لڑکی کی گردن صاف کٹ گئی۔ پھر اُس نے لڑکی کا ایک بازو اور ایک ٹانگہ کاٹ دی۔ اُس کی لاش وہیں پڑی رہنے دی اور واپس ہرنام سنگھ کو قتل کرنے کے لیے آئی۔ اس نے ہرنام سنگھ سے پہلے لڑکی کو اس لیے قتل کیا تھا کہ چھت پر ہی نہ پڑی جائے۔ آخر وہ کپڑی گئی مگر وہ لڑکی کو قتل کر چکی تھی۔

ہرنام سنگھ کو اپنی بیوی کی اس کہانی پر اعتبار نہ آیا۔ وہ اُسے اُس جگہ لے گیا جہاں لڑکی قتل ہوئی تھی۔ وہاں واقعی لاش پڑی تھی، اور لاش کے ٹکڑے بھی قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ ہرنام سنگھ نے اپنی بیوی کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے دل میں یہ غیرت جاگ اٹھی کہ وہ اپنی بیوی کو پولیس کے ہاتھ میں نہیں دے گا اور اُسے کبھی نہیں چرٹھنے دے گا۔ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ بیوی اُس کی عزت ہے اور اس کی بیوی نے اپنی عزت اور غیرت کی خاطر اس لڑکی کو قتل کیا ہے۔ یہ جنگلی سکھ کا دماغ تھا۔ جدھر رخ ہو گیا ہرنام سنگھ اسی سمت چل پڑا۔ اپنی بیوی کی یہ دلیری اُسے بہت پسند آئی۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ اُس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اُس نے کھانسی سے گڑھا کھود کر لاش دبا دی اور اس سے تھوڑی دُور ایک گڑھا گہرا کھود کر دبا یا اور ٹانگہ اور بازو ایک اور جگہ دبا یا۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ

وہ بے غم ہو جائے اُسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

اس کے بعد ہر نام سنگھ نے جو بات سنائی وہ بھی مشکوک لگتی تھی۔ خیال یہی تھا کہ وہ نشے کے اثر کے تحت خیالی باتیں کر رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ بیوی کو واپس لے آیا۔ اندھیرے میں نظر نہیں آتا تھا کہ اُس کے کپڑوں پر خون کے پھینٹے ہیں یا نہیں۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ ہر نام سنگھ نے بیوی سے کہا کہ وہ دبے پاؤں کپڑے بدل لے اور کل یہ کپڑے دھو لے مگر کوئی خون نہ دیکھ سکے۔ وہ اطمینان سے سو گئے۔

آدھی رات کے بہت بعد ہر نام سنگھ کی آنکھ پھر کھلی تو پھر دیکھا کہ بیوی غائب ہے۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ وہ نظر نہ آئی۔ صبح ہو گئی۔ وہ نہ آئی۔ سورج نکلنے کے بعد تک نہ آئی۔ ہر نام سنگھ کی ماں نے کسی شک کی بنا پر ٹرنک دیکھا۔ تمام زیورات غائب تھے اور دوسرے ٹرنک میں کچھ رقم رکھی تھی، وہ بھی غائب تھی۔

ہر نام سنگھ کو کئی خیال آئے۔ ایک یہ کہ وہ اس ڈر سے بھاگ گئی ہے کہ ہر نام سنگھ اُسے پیار کے دھوکے میں پکڑا دے گا۔ دوسرا یہ کہ اُس نے درپردہ کسی اور کے ساتھ دوستی لگا رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ تیسرا یہ کہ لڑکی کو اس کی بیوی نے قتل نہیں کیا، اس آدمی نے کیا ہے جس کے ساتھ وہ چلی گئی ہے۔ پھر وہ اپنے آپ سے کہتا کہ اس کی بیوی بہت دلیر تھی۔ لڑکی کو اُسی نے قتل کیا ہے۔

بہر حال اُس نے بیوی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اُس نے مسلمان گھرانوں

کے دو جوان آدمیوں کو دھکیا بھی دیں۔ اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے کہا کہ وہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ اُس کی بیوی ہمیں چلی گئی ہے۔ اُدھر اُس لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی جو قتل ہو چکی تھی۔ ہر نام سنگھ سے بھی پوچھا گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس کے گاؤں میں آئی تھی جس طرح ہر نام سنگھ اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو نہیں دینا چاہتا تھا اسی طرح متولہ کے لواحقین بھی سکھتے تھے۔ وہ بھی اسے اپنے طوطے پر تلاش کر رہے تھے۔ وہ اپنی لڑکی کے چال چلن سے واقف ہوں گے اس لیے انہیں یہی شک ہو گا کہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔

چوتھے پانچویں دن درندوں نے لاش نکال لی۔ ہر نام سنگھ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک مجرنے خان باز گل کو اطلاع دے دی ہے کہ اس کی بیوی لاپتہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاش برآمد ہوتے ہی خان باز گل نے ہر نام سنگھ کو دھر لیا۔ لاش کی شناخت دانستہ کرائی، اس سے یہ ہوا کہ لڑکی کے لواحقین کو یہ شک ہوا ہی نہیں کہ یہ لاش اُن کی لڑکی کی ہو سکتی ہے۔ لاش غلط وارثوں کو دے دی گئی جو انہوں نے اپنے دستور کے مطابق جلا ڈالی۔

اس واردات میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر نام سنگھ نے خان باز گل کے ہاتھوں اپنا جسم تڑوا لیا لیکن یہ نہ بتایا کہ یہ لاش فلاں لڑکی کی ہے اور اسے اُس کی بیوی نے قتل کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ڈر بھی گیا ہو۔ لاش کو اُس نے خرد دفن کیا تھا۔



## ناقابل یقین کہانی سچ نکل

خان باز گل نے مجھے بتایا کہ اُس نے ہر نام سنگھ کے اس بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ دوسرے تھانیدار نے کہا کہ اس کا سارا بیان سچا نہیں ہو سکتا۔ اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قتل میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔ ہر نام سنگھ بیان دے کر سو گیا تھا۔ وہ بہت ہی دیر سو یا رہا۔ جب جا کا تو اُسے کھلایا پلایا گیا۔ اس کے ہوش ٹھکانے آچکے تھے۔ دوسرے تھانیدار نے اُسے کہا کہ ساتھ چل کر لاش کا سرا بازو اور ٹانگ برآمد کراؤ۔

”کونسی لاش؟“ ہر نام سنگھ نے حیران ساہو کے پوچھا۔ ”کس کی لاش؟“

اُسے اُس کا بیان یاد دلایا گیا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے مجھے شراب پلائی پھر جھنگ پلائی۔ میں نے راضی خوشی بی لی۔ مجھے اتنا زیادہ نشہ ہو گیا تھا کہ اپنی بھی ہوش نہیں تھی۔ میں بیان دینے کی حالت میں ہی نہیں تھا۔

”ہر نامے!“ اُسے خان باز گل نے کہا۔ ”قاتل تم نہیں ہو تمہاری بیوی ہے، اور وہ لاپتہ ہے۔ تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ تم صرف اتنا کہو کہ لاش کے ٹکڑے برآمد کرا دو۔ یا یہ بتا دو کہ تم نے لاش والے گڑھے سے کس طرف اور کتنی دُور دبائے تھے۔ ہم خود نکال لیں گے۔“

اُس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے تھانیدار نے خان باز گل سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے لڑکی کو اس نے خود قتل کیا ہے اور یہ اتفاق ہے کہ اس کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے۔ خان باز گل کو معلوم تھا کہ ہر نام سنگھ کی بیوی کہاں ہے۔ اُس کے ساتھ اس کی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ کانسیبل نے اس کے سامنے خان باز گل کو سنا یا تھا کہ ہر نام سنگھ کی بیوی کس طرح اُس کے پاس پہنچی تھی۔ اُس نے قتل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خان باز گل نے یہ بھی سوچا کہ قتل کا اقبال کون کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہر نام سنگھ کی بیوی نے ہی قتل کیا ہو۔ انسان کی فطرت بڑی گہری ہوتی ہے۔ خان باز گل نے بہت کچھ سوچ کر دوسرے تھانیدار کو مشورہ دیا کہ وہ ہر نام سنگھ کو گرفتار کر کے لے جائے اور اس کے بیان کے مطابق شہادت اکٹھی کر لے۔

ایسا ہی کیا گیا۔ وہ تھانیدار ہر نام سنگھ کو گرفتار کر کے لے گیا۔

اپنی تسکین اور تصدیق کے لیے خان باز گل کسی بہانے اور تشریح چلا گیا۔ اُسے کانسیبل مل گیا۔ اُس نے گجرات کے تبادلے کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور ہر نام سنگھ کی بیوی کو اُس نے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ خان باز گل نے اُسے ہر نام سنگھ کا بیان سنایا تو کانسیبل کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

”آپ تفتیش کے لیے آئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

خان باز گل نے اُسے تسلی دی کہ وہ اپنے وعدے پر قائم ہے اور وہ صرف اپنی دلچسپی کے لیے اصل واردات معلوم کرنا چاہتا ہے۔

کانسیبل اُسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی (ہر نام سنگھ کی سابق بیوی)

سے ملایا۔ بات یہی تھی تو اس لڑکی نے یہ تسلی کر کے کہ خان باز گل دھوکہ نہیں دے گا، ہر نام سنگھ کا بیان سننے سے پہلے ہی سنا دیا کہ اس نے اس لڑکی کو کس طرح قتل کیا تھا۔ اُس نے بالکل وہی کہانی سنائی جو ہر نام سنگھ نے نشے کی حالت میں سنائی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اُس نے جو سبھی سچاں سچاں وہ کامیاب رہی۔ اُس نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی جو اُس کے متعلق مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ مسلمان عورتوں سے زیادہ متاثر تھی اور انہی کی طرح اپنے آپ کو، اپنے خاوند کو اور اپنے گھر کو صاف شہر اور پاکیزہ رکھنا چاہتی تھی۔

اپنے گھر کی غلامت سے وہ پریشان رہتی تھی۔ اس پر ہر نام سنگھ نے یہ ظلم کیا کہ ایک لڑکی کو اپنے دل اور دماغ پر سوار کر کے اُسے اپنی بیوی پر بھی سوار کرنے کی کوشش کی۔ بیوی کے دل میں ہر نام سنگھ اور اس گھر کے ہر فرد کے خلاف نفرت پہلے ہی گھر گئی تھی۔ اس لڑکی نے اُسے طعنے دیئے اور ہر نام سنگھ نے اسے مارا پٹیا تو اس کے دماغ پر خون چڑھ گیا۔ اُسے پناہ اور سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ اس مسلمان کانسٹیبل نے پوری کر دی۔ آخر ایک روز اُس نے لڑکی کو بچرا اپنے گاؤں میں دیکھا تو اس کا دماغ تیز ہو گیا۔ اس نے قتل کی سیکم بنائی۔ اس کی سیکم میں ہر نام سنگھ کا قتل شامل نہیں تھا اور نہ ہی وہ زیورات چوری کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے ایک عورت کی زبانی لڑکی کو ہر نام سنگھ کا پیغام بھیجا۔ کلمہ لڑی انگ رکھی اور شام کے وقت سیرٹھی منڈیر پر ایک جگہ لیپ کرنے کے بہانے مکان کے پھوٹے لگا دی۔ رات کو وہ پھوٹے سے اترنا چاہتی تھی۔ اُس نے گھروں کی نظر سچا کر کلمہ لڑی اپنے بستر میں چھپا

لی تھی۔

ہر نام سنگھ سو گیا تو اُس نے کلمہ لڑی اٹھائی اور پیچھے سے اتر گئی۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ اگر لڑکی اگلی تو اُسے قتل کر کے رات ہی رات اترتی ہو جائے گی اُسے امید نہیں تھی کہ لڑکی اُسے کی لیکن موت اُسے لے آئی۔ بیوی نے پہلا وار لڑکی کے سر پر کیا۔ وہ چمک کر گری تو اُس نے دوسرا وار اُس کے بازو پر کیا۔ بازو چونکہ زمین پر تھا اس لیے صاف کٹ گیا۔ تیسرا وار ٹانگ پر کیا۔ اسی جگہ دو وار وار کئے تو ٹانگ بھی کٹ گئی۔ وہ پوری طرح پاگل ہو چکی تھی۔ مقولہ کے جسم کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ بیوی نے پاگل پن میں کلمہ لڑی سے اُس کی گردن کاٹ کر سر الگ کر دیا۔ پھر اندھا دھند اُس کے جسم پر کلمہ لڑی چلانے لگی۔

اس دوران اُس کے دماغ میں آئی کہ وہ ہر نام سنگھ کو بھی قتل کرے گی۔ یہ پاگل پن کا اثر تھا اسے آپ یوں کہیں کہ یہ دماغ پر ایک قتل کا خون سوار ہو جانے کا اثر تھا۔ وہ اسی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں ہر نام سنگھ کو قتل کرنے لگا۔ کو واپس آگئی اور بھت پر چڑھی۔ ہر نام سنگھ جاگ رہا تھا۔ اس سے آگے اُس نے وہی کہانی سنائی جو ہر نام سنگھ نے سنائی تھی۔ اس لڑکی نے خان باز گل کو سنایا کہ ہر نام سنگھ نے اس کے ساتھ جاکر لاش کو گرٹھا کھود کر دبا دیا اور لاش کے اعضاء بھی دبا دیئے۔ اُس نے بیوی کو اس دلیری اور غیرت مندی پر خوب شاباش دی اور بھت پر لاکر سو جانے کو کہا۔ اس کے اس سلوک سے بیوی کے دل سے یہ ارادہ نکل گیا کہ وہ ہر نام سنگھ کو قتل کرے گی۔ ہر نام سنگھ وحشی قسم کے سکھ تھا۔ بے مددھ سو گیا۔ بیوی کو اچانک خیال آیا کہ یہ شخص اُسے دھوکہ

گھر لے آیا ہے اور صبح پولیس کے حوالے کر دے گا۔ وہ تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ اُس کی اتنی گہری دوستی تھی اُس کے قتل پر وہ خوش ہوگا۔

اس جوان لڑکی کا خون ذرا اٹھنڈا ہوا چمکا تھا اور دماغ ذرا بہتر طریقے سے سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اُس نے فرار میں ہی خیریت سمجھی۔ وہ اٹھی اور نیچے چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے اندھیرے میں ہی ٹرنک کھولا۔ اُسے معلوم تھا کہ زیورات کہاں پڑے ہیں۔ رقم کے متعلق بھی اُسے علم تھا۔ اُس نے دونوں چیزیں اڑالیں اور نکل گئی۔

گاڈن گہری نیند سو یا ہوا تھا۔ وہ گاڈن سے نکل گئی اور دس گیارہ میل پیدل جاتی امرتسر پہنچ گئی۔ ابھی سحر صندلی تھی جب وہ امرتسر پہنچی۔ وہ دربار صاحب چلی گئی۔ اُس روز اس کا کانٹیل ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ صبح ہوئی تو وہ پوچھتی پوچھتی کانٹیل تک پہنچ گئی۔ کانٹیل نے جس طرح پہلے سنایا تھا، اُس نے اپنے کسی دوست کی مدد سے رہائش کا بندوبست کر لیا۔ لڑکی کو مسلمان کیا اور شادی بھی کر لی۔

## کیا یہ گناہ تھا؟

خان بازگل نے لڑکی سے پوچھا کہ مفقودہ کا سر ٹانگ اور بازو کہاں کہاں دبائے گئے تھے۔ لڑکی نے لاش والے گڑھے سے سمت اور انداز افاصلہ بتا دیا۔ کانٹیل ابھی تک گھرایا ہوا تھا۔ خان بازگل نے اسے کہا کہ وہ اُس کا

مسلمان بھائی ہے۔ اسے دھوکہ نہیں دے گا۔ اُس نے یہاں تک اُس کی مدد کی کہ پولیس سٹیڈ کو آرڈر میں اس کے دو دوست ان پکٹر تھے۔ اس نے انہیں کہا کہ اس کانٹیل کو امرتسر سے گجرات، جہلم یا اس علاقے کے کسی تھانے میں بھجوا دیں۔ اس نے کوئی جھوٹ موٹ کی وجہ بتائی۔ انہوں نے مدد کا وعدہ کیا۔ دو روز بعد یہ کیس پھر خان بازگل کے تھانے میں آ گیا کیونکہ قتل اس کے تھانے کے علاقے میں ہوا تھا اور مشتبہ ملزم رہن نام سنگھ، یہی اسی علاقے کا تھا۔ رہن نام سنگھ کو خان بازگل کے حوالے کر دیا گیا۔ اس پٹھان کو تو معلوم تھا کہ قاتل کون ہے لیکن اس قاتل کو وہ مظلوم سمجھتا تھا اور اب اسلام کا رشتہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے رہن نام سنگھ کو اقبال جرم کے لیے نہ کہا۔ وہ جرم کی کہانی سن چکا تھا۔ اس نے پہلی کارروائی یہ کی کہ گاڈن کے دو آدمیوں کو جو اس کے اپنے خوشامدی تھے، تھانے بلایا۔ رہن نام سنگھ کو ہتھکڑیوں میں ساتھ لیا اور اُس جگہ لے گیا جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ رہن نام سنگھ کی سابقہ بیوی نے اُسے بتا دیا تھا کہ لاش کے اعضاء کہاں کہاں دبائے گئے ہیں۔ خان بازگل نے کھدائی کے لیے دیہات سے دو مین آدمی ساتھ لے لیے تھے۔ اس نے بتائے ہوئے انداز سے کے مطابق ایک جگہ دیکھی جہاں پتہ چلتا تھا کہ کچی ہے۔ اس نے رہن نام سنگھ سے پوچھا: ”یہاں سر ہے یا کونسا ہتھ؟“

رہن نام سنگھ نے جواب دیا: ”مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔“

خان بازگل نے سب کو بلایا اور کھدائی کرائی۔ اسی طرح ایک اور جگہ سے کھدائی کرائی۔ ایک جگہ سے سر اور دوسری جگہ سے ٹانگ اور بازو برآمد

اس طرح ہر نام سنگھ کی سابقہ بیوی خطرے کے علاقے سے بہت دور پہلی گئی تھی۔

خان بازگل نے مجھے یہ کہانی اس سوال کے ساتھ سنائی تھی کہ اُس نے گناہ تو نہیں کیا؟  
میں یہ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

○○○

بہوئے۔ ان کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ خان بازگل نے برآمدگی کے کاغذات تیار کیے جن میں لکھا کہ یہ اعجاز ہر نام کی ایسی نشاندہی پر برآمد ہوئے ہیں جو اُس نے اپنی رہنمائی سے کی ہے۔ اس نے کھدائی کرنے والوں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے دو آدمیوں کے انگوٹھے لگوا لیے۔

یہ اعجاز امرتسر کے سول جرن کے معائنے اور رپورٹ کے لیے بیجھ دینے۔ پھر اُس نے ہر نام سنگھ کے گھر کی تلاشی لی اور آلہ قتل دکھاڑی، برآمد کیا۔ اس کے متعلق بھی اس نے لکھا کہ ہر نام سنگھ کی نشاندہی پر برآمد ہوا ہے۔ اس نے اپنے ایک مخبر کو یہ بیان دینے کے لیے تیار کیا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی اور ہر نام سنگھ بھی اس کی دوستی کا خواہش مند تھا۔ ناکافی سے مشتعل ہو کر اُس نے لڑکی کو قتل کر دیا۔ مخبر سے یہ بھی کہلوایا گیا کہ ہر نام سنگھ نے اُسے بھی قتل کی دھمکی دی تھی۔ مقتولہ کے باپ اور بھائیوں کے ذہن میں بھی خان بازگل نے ڈالا کہ لڑکی کا قاتل ہر نام سنگھ ہے۔ انتقام لینے کے لیے ان لوگوں نے وہ بیان زبانی یاد کر لیے جو انہیں خان بازگل نے بتائے تھے۔ اس کے علاوہ خان بازگل نے جو جھوٹی شہادتیں تیار کیں وہ ایک لمبی روئیداد تھیں۔ اُس نے بڑی عقل مندی سے کیس تیار کیا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے ابتدائی سماعت کے بعد کیس سیشن سپرد کر دیا جہاں سے ہر نام سنگھ کو عمر قید کی سزا مل گئی۔ ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی جو مسترد ہو گئی اور سزا بحال رہی۔

اس سے پہلے مسلمان کانسٹیبل کو امرتسر سے گجرات بھیج دیا گیا تھا۔